عکسِ آگہی
(فن اور شخصیت)
ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
(ایم-بی-ای، برطانیہ)

عکسِ آگہی

(فن اور شخصیت)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

(ایم۔بی۔ای، برطانیہ)

نام کتاب: عکسِ آگہی (فن اور شخصیت)

مصنفہ: ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

سال اشاعت: 2023ء

انتساب

آ گہی کے نام

جو مشعل راہ بن کر کائنات کی حقیقتوں کا فہم وادراک عطا کرتی ہے

2

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا اعزاز

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ میں تقریباً نصف صدی سے مقیم ممتاز شاعرہ، ادیبہ، سماجی کارکن، حقوق نسواں کی علم بردار اور ادبی تنظیم ''آگہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔

انہیں برمنگھم کی ایشیائی بطور خاص پاکستانی کمیونٹی کی خواتین کے ساتھ پچھلے بیس برس میں مختلف سماجی اور ثقافتی مسائل پر بھرپور انداز میں رضا کارانہ طور پر سوشل اور کمیونٹی ورک کرنے کے نتیجے میں ملکہ معظّمہ برطانیہ کی سالگرہ کے موقع پر ایم بی ای (ممبر آف برٹش ایمپائر) کے قابلِ قدر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

رضیہ اسماعیل 1973ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے بعد برطانیہ تشریف لائیں اور یہاں مزید اعلیٰ تعلیم برمنگھم، وارک، لندن اور آکسفورڈ میں حاصل کی۔ شروع میں برٹش سول سروس میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد انہوں نے سوشل ورک کو اپنے لیے بطور پروفیشن منتخب کیا۔ سوشل ورک کی تعلیم برمنگھم اور وارک کی جامعات سے امتیازی حیثیت سے مکمل کرنے کے ساتھ سال کی بہترین طالبہ کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کا تمام کیریئر نہایت شاندار رہا ہے اور انہوں نے ہر امتحان امتیازی حیثیت میں سکالرشپ کے ساتھ پاس کیا۔ ڈاکٹریٹ میں ان کے مقالے کا موضوع ''گھریلو تشدد کے بچوں پر اثرات'' تھا۔ انہوں نے کئی لوکل گورنمنٹ کے سوشل ورک محکموں میں تقریباً تیس برس ملازمت کرنے کے بعد حال ہی میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کی ہے۔

دوران ملازمت انہوں نے چند پاکستانی پروفیشنل خواتین کے ساتھ مل کر 1997ء میں ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی بنیاد رکھی اور عرصہ دراز تک نہایت محدود وسائل

کے ساتھ بڑی جان فشانی سے ادب اور آرٹ کے ذریعے یہاں کی ایشیائی کمیونٹی میں خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کئی سروسز بھی مہیا کیں۔

انہیں شاندار کمیونٹی ورک پر 2000 میں ملینئم کمیشن کی تاحیات فیلوشپ دی گئی۔
وہ بہت سی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی مجلس عاملہ کی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ اور بیرون برطانیہ کئی ادبی رسالوں کی مدیرہ، سرپرست اور مشیر بھی ہیں۔

رضیہ اسماعیل شاعری اور نثر میں کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں اور ہمہ وقت سماجی خدمت کو ایک عبادت سمجھ کر نہایت لگن سے مصروف کار رہتی ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بھی خواتین کے مختلف سماجی اور ثقافتی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ بہت سی خواتین کو ادبی ورک شاپس (workshops) کے ذریعے ادب پڑھنے، سراہنے اور لکھنے کی طرف راغب کیا ہے۔

رضیہ اسماعیل کا کہنا ہے کہ ان کو ملنے والا ایوارڈ ان کا ذاتی اعزاز ہی نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کا بھی اعزاز اور ایوارڈ ہے جو ''آگہی'' کے سفر میں ان کے ساتھ شریک رہے۔

آگہی تنظیم کی مجلس عاملہ اور کارکنان کے علاوہ تمام ایشیائی کمیونٹی انہیں اس عزت افزائی پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں ان کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○

خوشبو، گلاب، کانٹے

پاکستان بک پبلشنگ ہاؤس کے ایک حالیہ ادبی جائزے کے مطابق 2012ء میں شائع ہونے والی بہترین کتب کی فہرست میں برمنگھم میں مقیم ممتاز شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی شعری کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کو سال کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا گیا ہے۔

برمنگھم کے ادیبوں کا اعزاز

مورخہ 23 مارچ قراردادِ پاکستان کے موقعہ پر پی ٹی وی گلوبل کے زیرِ اہتمام منعقدہ اچیومنٹ ایوارڈ 2015ء کی افتتاحی تقریب برمنگھم میں ڈگبتھ پنکوٹ سویٹ میں نہایت پروقار طریقے سے اور پورے جوش و جذبے کے ساتھ منائی گئی۔

ایوارڈ کمیٹی کے سربراہ پروفیسر محمود رضا تھے جبکہ تقسیم ایوارڈ کے لیے برمنگھم کے لارڈ میئر سید شفیق شاہ اور لیڈی میئرس کے علاوہ برمنگھم کے علاوہ دوسرے شہروں سے بہت سے کونسلرز بھی مدعو تھے۔ اس تقریب میں برمنگھم کی علم و ادب سے تعلق رکھنے والی چار شخصیات کو پی ٹی گلوبل 2015ء ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جن میں محمود ہاشمی (مرحوم) کو صحافت، ڈاکٹر سعید اختر درانی کو سائنس ٹیکنالوجی اور ایجوکیشن، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو سوشل اور کمیونٹی ورک جبکہ سلطانہ مہر کو ادب میں ایوارڈ دیا گیا۔

4

اہلِ قلم کے تاثرات

مرد اگر تنظیم ہے تو عورت تخلیق ہے۔ ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' میں رضیہ اسماعیل نے اسی تخلیق کی بات کی ہے اور اس کے ہر روپ کو اعتبار بخشا ہے۔ رضیہ کی شاعری میں تازہ گلابوں کی خوشبو ہے تو مرجھائے ہوئے پھولوں کا نوحہ بھی ہے۔ کانٹوں کی چبھن ہے تو درد کی کسک بھی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے ہر گھر میں موجود ہونا چاہیے۔

(ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی، لاہور)

رضیہ کی شاعری کو پڑھ کر ایک ہشت پہلو ہیرے کا تصور ابھرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہیرے کا ہر عکس ایک جیسا چمکتا ہے اور رضیہ کی شاعری کے ہر پہلو کے چمکنے کا انداز اور رنگ مختلف ہے۔

(حمیدہ معین رضوی، لندن)

رضیہ اسماعیل نے ایک طویل عرصے سے خود کو خرد افروزی، فکر و فن، شعر و ادب اور دیدۂ و دانش کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ جس کا ثبوت ان کی تخلیقات ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''، ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''، ''میں عورت ہوں''، ''پیپل کی چھاؤں میں''، اور ''ہوا کے سنگ سنگ'' ہیں۔ رضیہ سماجی خدمت سے متعلق ہیں اور معاشرے میں ابھرنے والے مسائل، مصائب اور محرومیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ جس کا تاثر ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے پھولوں کی چھاؤں کو چھوڑ کر کانٹوں کی راہ گزر اپنائی ہے اور اپنی خداداد صلاحیت اور کاوش سے اس راہ گزر کو بھی گلزار بنا دیا ہے اسی لیے انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا ہے۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

(عقیل دانش، لندن)

رضیہ کی فکر میں انفرادیت ہے۔ ادبی سچائیاں ہیں۔ وقت کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات کو ان کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی نظمیں زندگی کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ خاص طور پر تحریر، آغاز نو، میں تم سے محبت کرتا ہوں، بیٹی، خزاں کی زد میں اور یادیں نے مجھے بہت متاثر کیا۔

(ڈاکٹر فوزیہ تبسم، لاہور)

رضیہ شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں۔ اللہ نے بڑی حساس طبیعت اور دردِ دل کی دولت عطا کر رکھی ہے۔ اپنی ہم نفسوں کے دکھ درد پر کڑھتی ہیں۔ ان کی دبی دبی چیخوں، خاموش فریادوں، ان کی آہوں اور سسکیوں کو دل کی دھڑکن میں بسا کر انھیں الفاظ کا روپ دیتی ہیں۔ عورتوں کے آلام و مصائب ان پر عائد بے جا پابندیاں، قدغنیں، سماجی و معاشرتی بندھن، مردوں کی اجارہ داری، بے حسی، خودغرضی اور نفس پرستی ان کا دل دکھاتی ہے۔ تو یہ زخمی احساسات اور سلگتے جذبات کو اشعار میں ڈھالتی ہیں۔ جو ان کی روح کی گہرائیوں میں جنم لیتے اور خونِ جگر کی آمیزش سے گلابی گلابی سے ہو کر بڑے پُرکشش اور پُراثر بن جاتے ہیں۔

(طلعت سلیم، برمنگھم)

رضیہ کی نثری نظموں میں معاشرے میں موجود ان عورتوں کے حالات، مسائل اور جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو ان کی سماجی زندگی یا پیشہ ورانہ تعلق سے ان کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بنے ہیں۔ انہوں نے اس درد کو اس شدت سے محسوس کیا ہے کہ یہ ان کا غم ذات بن گیا ہے اور پھر انہوں نے اس درد کی دولت کو عام آگہی دینے کا فریضہ ایک سماجی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیا ہے۔ اس ذمہ داری کو اس خلوص سے نبھایا ہے کہ اکثر کرداروں کا

کرب صیغۂ واحد متکلم میں بیان کر کے اسے تاثیر عطا کی ہے۔ مصنفہ مزاج کے اعتبار سے زندگی کی مشکلوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ہر کام کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو خوب سوچ سمجھ کر پرکھتی ہیں۔ اور جب کام کرنے کا تہیہ کر لیں تو اس کے لیے سخت محنت کرتی ہیں۔ پاؤں کو لہولہان کر کے کانٹوں پر چلنا سیکھتی ہیں اور پھر بڑے اعتماد سے کہتی ہیں کہ

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

یوں انہوں نے حقیقت میں شعر کو برگِ گل اور نوکِ خار بنا کر دونوں میں حسین اور متوازن امتزاج پیدا کیا ہے۔

(خواجہ محمد عارف، برمنگھم)

ترتیب

حصہ اوّل

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی تخلیقات پر احباب کے تاثرات، جائزے اور تبصرے

حصہ دوم
ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے تحریر کردہ
مضامین، تبصرے اور جائزے

حصہ سوم

متفرقات

پیش کلام

ابھی تو حرف کو تحریر کی پہچان ہونا ہے
ابھی تو آدمی کو لفظ کا عرفان ہونا ہے

اپنے اس شعر پر غور کرتی ہوں تو ذہن بہت پیچھے کی طرف پلٹ جاتا ہے جب حرف حرف لکھنا سیکھا، حرفوں کو جوڑ کر الفاظ کا روپ دیا اور پھر کہیں ایک جملہ لکھنے کی توفیق ہوئی۔

لفظ کا ادراک بڑی بات ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو کبھی کُن کی شکل اختیار کرتا ہے تو فیکون میں ڈھل جاتا ہے۔ الست بربکم کی صدا آتی ہے تو سرِ تسلیم خم کر کے قالوبلیٰ کہہ اٹھتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ الفاظ کبھی نہیں مرتے ان کی بازگشت شعور اور لاشعور دونوں میں ہی گونجتی رہتی ہے۔ کیونکہ اگر الفاظ کی کھنک معدوم ہو جائے تو لگتا ہے قلم کار اندر سے مر گیا ہے۔ شاید کسی ایسے ہی لمحے میں جب بہت دنوں سے کچھ نہیں لکھا تھا تو میرا قلم پکار اٹھا تھا۔

لفظوں کی جھنکار کو مرنے مت دینا
اندر کے فنکار کو مرنے مت دینا

میں اس لحاظ سے بخت آور ہوں کہ اپنے تخلیقی سرمایے کو سنبھال کر رکھنے کی عادت بچپن میں ہی پڑ گئی تھی۔ کبھی ایک لفظ تو کبھی ایک سطر، کبھی چند لائنیں، کبھی آدھا، کبھی پورا صفحہ۔ کبھی نظم تو کبھی نثر، کبھی غزل تو کبھی انشائیہ جو بھی ذہنی و قلبی واردات گزرتی رہیں انھیں لفظوں میں گوندھ گوندھ کر رکھتی رہی۔

اپنے پچاس سالہ تخلیقی سفر میں جو 1971ء میں شروع ہوا مگر پہلی تخلیق 1997ء میں منصۂ شہود پر آئی جس کے بعد متعدد شعری اور نثری تخلیقات زیرِ طبع سے آراستہ ہوئیں (جن

کی تفصیل کتاب میں شامل ہے) اور دوست احباب نے نہایت محبت و خلوص کے ساتھ ان پر مضامین لکھے۔ جن میں تبصرے، جائزے، تاثرات اور تنقید شامل ہیں۔ اس وقت تو یہ نہیں سوچا تھا کہ ان مضامین کی بعد میں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے اس لیے بہت سارے مضامین بے احتیاطی کی نذر ہو گئے اور جو سنبھال سکی انھیں کتابی شکل میں شائع کر کے نہ صرف لکھنے والے قلم کار دوست احباب کا شکریہ ادا کر رہی ہوں بلکہ دوسروں تک بھی پہنچا رہی ہوں کیونکہ یہ تحاریر بہت محنت سے لکھی گئی ہیں اور انھیں یونہی ضائع کر دینا مجھے گوارا نہ تھا۔

بہت سے دوست احباب کی تخلیقات پر مجھے کچھ لکھنے کا شرف حاصل ہوا وہ بھی شامل کتاب ہے۔ بہت سے ادبی جریدوں کی ادارت اور مجلس مشاورت میں شامل رہی جن میں ماہنامہ پرواز (لندن)، ساحل (لندن)، عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)، ادب سرائے (لاہور)، قندیل (لندن)، آدرش (برمنگھم)، اور جدید ادب (جرمنی) وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت کسی کا نام حافظے سے نکل گیا ہو تو اس کے لیے معذرت۔

میری تخلیقات بہت سے مقامی اور انٹرنیشنل ادبی جرائد، رسائل کی وقتاً فوقتاً زینت بنتی رہی ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں۔ اس کے علاوہ الحمرا (شاہد علی خان) (لاہور)، چہارسو، جاوید گلزار (اسلام آباد)، روزنامہ جنگ، اسلام آباد (انوار فطرت)، روزنامہ جنگ، لاہور (حسن رضوی)، شاعر (انڈیا)، شام کے بعد (فرحت عباس شاہ، لاہور)، روزنامہ جنگ، لندن، فیضان عارف، پاکستان پوسٹ (لندن)، بیاض (لاہور)، خالد احمد شوہر نامدار (لاہور)، شائستہ حسن، عکاس انٹرنیشنل (ارشد خالد، اسلام آباد)، اردو ٹائمز (لندن)، امجد مرزا، سنڈے میگزین (جنگ لندن) یعقوب نظامی، اردو کی نئی بستیوں کے قلمکار (پرواز لندن)، صابر ارشاد عثمانی، لیڈی رپورٹ لاہور، روزنامہ نوائے وقت سنڈے میگزین (لاہور)، خالد یزدانی، روزنامہ جناح، خبریں (لاہور ضیا شاہد)، اور امن میں تخلیقات کے ساتھ ساتھ انٹرویوز بھی شائع ہوئے جو طوالت کے سبب اس کتاب میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس کتاب میں چند ادبی تقاریب کی روداد شامل ہے۔ ویسے تو ''آ گہی'' تنظیم کے قیام (1997) سے لے کر اب تک بہت سی تقریبات ہوئیں مگر یہ احوال چندان تقاریب کا ہے جو پاکستان، برمنگھم، اٹلی اور سوئٹزر لینڈ میں منعقد ہوئیں۔

''آ گہی'' تنظیم کی پہلی تقریب (افتتاحی) 30-11-97 میں برمنگھم سینٹرل لائبریری کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت سید عطا جالندھری نے کی۔ سرمد بخاری کو خصوصی خراجِ عقیدت پیش کیا جن کی حال ہی میں وفات ہوئی تھی۔ دیگر شعرا میں فیضان عارف نے لندن سے خصوصی شرکت کی۔ کئی افراد اب راہی ملکِ عدم ہو چکے ہیں جنہوں نے اس تقریب میں شرکت کی۔ ان میں ڈاکٹر عنایت شاداں، عطا جالندھری، عاشور کاظمی، عظمت اللہ بیگ، ڈاکٹر سعید اختر درانی، طاہرہ صفی، محمود ہاشمی اور آدم چغتائی، شامل ہیں۔

اس تقریب کے دیگر شرکاء میں جاوید اختر، ڈاکٹر عبدالرب ثاقب، ملک فضل حسین، اقبال بھٹی، اقبال نوید، طلعت سلیم اور شاہد محمود شامل تھے۔

''آ گہی'' ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم ہے جس کا قیام 1997ء میں عمل میں آیا۔ آج ''آ گہی'' نے 25 سالوں میں اپنی سلور جوبلی مکمل کر لی ہے۔ مقامی برٹش ایشین خواتین کے ساتھ کام کرنے کے ساتھ ساتھ میرا اپنا تخلیقی سفر بھی جاری و ساری ہے۔ چوتھائی صدی میں ہر دو خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات اور ایوارڈز سے نوازی گئی۔ چند ایک کا ذکر کرنا چاہوں گی۔

1- برطانیہ میں بہترین کمیونٹی خدمات پر ملینیم کمیشن کی تاحیات فیلوشپ دی گئی۔ (2000ء)
2- پی ٹی وی (P.T.V) گلوبل ایوارڈ 2015ء برمنگھم، یو۔کے میں دیا گیا۔
3- ملکہ برطانیہ کی طرف سے بہترین کمیونٹی ورک پر 2017ء میں ایم بی ای (MBE) کا اعزاز ملا۔

4- لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2017ء منجانب پارک شائر ادبی فورم، یو۔کے
5- ادب سرائے (لاہور) حسن کارکردگی ایوارڈ ملا۔

بہت سے دیگر کمیونٹی اور ادبی اعزازات و انعامات برطانیہ اور بیرون ملک سے ملے جن کی تفصیل اب محفوظ نہیں ہے۔

''آ گہی'' کے سفر اور ادبی حوالے سے بے شمار دوست احباب اور قلمکاروں سے ملاقات ہوئی جن کی یادیں زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ بے شمار خطوط مداحین کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ دل تو چاہتا ہے کہ یہ سب یادیں آپ کے ساتھ بانٹوں مگر اس وقت ممکن نہیں ہے۔ انشاءاللہ آئندہ اپنی زیرِ تحریر سرگزشت ''آدھی صدی میں کتنی صدیاں'' میں ان کا ذکر کروں گی۔ (شکریہ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
ایم۔بی۔ای
برمنگھم، یو۔کے

حصہ اوّل

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی تخلیقات پر احباب کے تاثرات، جائزے اور تبصرے

مجھے کانٹوں پہ چلنا آگیا ہے

عدیم ہاشمی

ایک زمانہ تھا، ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت ہوا کرتے تھے اور لکھنے والے ادبی رسالوں کی ضرورت۔ لیکن ادبی رسالوں کی گروہ بندیوں، داغ دار کردار اور گھٹیا ادب کی وجہ سے اب ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت نہیں رہے۔ اگرچہ لکھنے والے آج بھی ادبی رسالوں کی ضرورت ہیں۔ اس لئے لکھنے والوں کے بغیر تو کوئی رسالہ بھی شائع نہیں ہوسکتا۔ جب کہ اچھا شاعر اور اچھا شعر کسی رسالے یا جریدے کا محتاج نہیں ہوتا۔ رسالوں کے اس گھٹیا ادب اور ادبی رسالوں کے داغ دار کردار اور گروہ بندیوں کی بدولت اب شاعر اور شاعرات یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ رسالے میں چھپنے کا تکلف کرنے کی بجائے سیدھی سیدھی اپنی کتاب ہی شائع کرادی جائے۔ ویسے بھی ادبی رسالوں کی نسبت ہمارے یہاں ادبی کتاب زیادہ پڑھی جاتی ہے اور رسالوں کی نسبت بکتی بھی اور چھپتی بھی زیادہ ہے۔ اس میں مسئلہ صرف یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ رسالے میں چھپنے سے شاعر یا شاعرہ کا ادبی حلقوں میں جو تعارف ہوجاتا تھا وہ اب نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ شاعری کی کون سی کتاب پڑھی جائے اور کون سی کتاب نہ پڑھی جائے، خاصا مشکل ہوجاتا ہے۔ کیا خبر کس کتاب کی پٹاری میں سے کیا نکل آئے۔

ویسے بھی ادب کے پھیلاؤ سے ملک اور بیرون ملک تخلیق ہونے والے ادب نے یہ مسئلہ اور بھی گنجلک کردیا ہے۔ اندرون ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو تو صرف دو طرح کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اور دوسرے شاعرہ کی حیثیت

سے۔شاعر تو شاعر ہے لیکن خواتین کے معاملے میں اور بھی کئی مسائل سامنے آجاتے ہیں، جو سب لوگوں کو معلوم ہیں۔ بیرونِ ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو البتہ کئی دوسرے پہلوؤں سے بھی پرکھا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انھیں صرف ان کے غیر ملکی تناظر میں دیکھا جائے۔جن میں اکثر شاعر اور شاعرات صرف اسی لئے Exist کرتے ہیں کہ وہ انگلستان یا امریکہ میں شاعری کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ہوتے تو شاید صرف کسی کریانے کی دکان پر نوکری کر رہے ہوتے۔لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے گردونواح میں محدود کر کے دیکھنا ان کی شاعری کے ساتھ یقیناً ناانصافی ہے۔ان میں انگلستان کے لوگوں میں ارشد لطیف، یاسمین حبیب، یشب تمنا، فیضان عارف اور باصر کاظمی کے نام یقینی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔اسی طرح رضیہ اسماعیل بھی یقیناً ایک ایسا ہی ادبی حوالہ ہے جسے غیر ملکی تناظر سے نکال کر باقاعدہ طور پر اُردو ادب کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔رضیہ اسماعیل ادبی افق پر ابھرنے والی ایک نئی شاعرہ ضرور ہے لیکن اس کی غزل اور بالخصوص نثر نظم کسی بھی پختہ ادب کے تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔رضیہ اسماعیل کی غزل اور نثری نظم کا معیار اُردو ادب کے معیار پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے۔ رضیہ نے غزل اور نظم ایک جیسی توانائی اور ایک جیسی تخلیقی قوت سے لکھی ہے۔غزل رومانی لہجے میں زندگی کے دکھ درد اور ہجر و وصال کے تمام مدارج سے گزر کر اور اِن دکھوں اور راحتوں کو انتہائی شدت سے محسوس کر کے لکھی گئی ہے۔ غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ آزاد نظم سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا اسی صنفِ سخن سے اور اس وقت کی جب اس کی تخلیقی قوت صرف ایک طوفان کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کی کوئی تنظیمی صورت نہیں تھی۔رضیہ نے غالباً اس وقت اپنی تحریری راہیں متعین نہیں کی تھیں اور ہر لکھنے والے کی طرح ابتدا میں صرف لکھا اور لکھا۔تخلیقی بادل آتے رہے، چھاتے رہے اور برستے رہے۔یہ نہیں دیکھا کہ انھیں کن زمینوں پر برسنا ہے اور کتنا برسنا ہے۔اس کے باوجود نظمیں معیار اور فن کی سطح پر آج کی لکھی جانے والی

نظموں کی سطح پر ہی لکھی گئی ہیں۔

حیرت کی بات صرف یہ ہے کہ رضیہ نے جو تین اصنافِ سخن اپنے اظہار کا ذریعہ بنائی ہیں، اپنے موضوعات کے اعتبار سے وہ تینوں اصناف قطعی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غزل انتہائی رومانی لہجے میں کہی گئی ہے اور اس کے موضوعات بھی زیادہ تر ہجر و وصال کی مختلف کیفیات کے مظہر ہیں۔ جب کہ نثری نظم میں رضیہ اسماعیل نے خاص طور پر عورت کے عورت ہونے پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ عورت کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی شدت سے محسوس کیا ہے۔عورت کا ماں کا مقام اور اس پر احساسِ تفاخر، عورت کی جسمانی طور پر تخلیقی ہونے کے پہلو پر فخر کا احساس، اس کے مظلوم ہونے کا کرب، بیٹی اور بہن ہونے کا ادراک، عورت کی حیثیت سے Exploitation اور عورت کے اپنے مختلف کردار اور اس کے ساتھ معاشرے کے برتاؤ کے بہت سے پہلوؤں پر بڑی قوت سے سخن وری کی ہے۔عورت ہونے کی بدولت عورت کی بقا کے علاوہ عورت کے بانجھ ہونے سے لے کر تصویرِ کائنات میں رنگ ہونے تک کے بہت سے پیکروں کو ان گنت زاویوں سے دیکھا ہے۔جب کہ نظمِ آزاد میں رومانی موضوعات اور عورت کے عورت ہونے کے مضامین کا امتزاج ملتا ہے۔

غزل اور نظم دونوں اپنی کرافٹ اور موضوعات کی طرف شاعرہ کی اپروچ کے اعتبار سے بہت کامیاب تخلیقات ہیں۔

رضیہ اسماعیل صرف اس لئے شاعرہ نہیں ہے کہ وہ پاؤنڈز اور ڈالرز خرچ کر کے شاعری خرید سکتی ہے۔ نہ صرف وہ اس لئے شاعرہ ہے کہ وہ ان خواتین میں سے ہے جو جب چاہیں، جس شاعر سے چاہیں، اس کی شاعری اپنے نسوانی ہتھکنڈوں سے ہتھیا کر اپنے نام لگا لیں۔ نہ ان خواتین میں سے ہے جو کسی بڑے شاعر کی منہ بولی رشتہ دار بن کر شاعری میں کوئی وزن پیدا کرسکتی ہے بلکہ رضیہ اسماعیل اس لئے شاعرہ ہے کہ وہ ایک اوریجنل (Original) اور جینوئن (Genuine) شاعرہ ہے۔ اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور

خاتون شاعرہ ہونے کے Barriers اگر کراس نہیں کر چکی تو انھیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو (سوائے افتخار نسیم کے) رضیہ اسماعیل سے باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام و مرتبہ پر فائز ہوسکتی ہے۔ میں رضیہ اسماعیل کو برمنگھم کے لکھنے والوں سے اس لئے بھی Compare نہیں کروں گا کہ اس میں بہت سے لکھنے والوں کے ادبی تختے الٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جن میں صرف پردہ نشینوں کے نام ہی نہیں آتے، کئی بے پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ جس طرح میں پاکستان میں شاعری کے حوالے سے آج کل فاخرہ بتول کے ساتھ کسی خاتون کا نام نہیں لے سکتا اسی طرح مجھے انگلستان میں بھی رضیہ اسماعیل اور یاسمین حبیب کے ساتھ کسی اور کا نام لینا اچھا نہیں لگتا۔

عین ممکن ہے انگلستان میں رہنے والے رضیہ اسماعیل کے بارے میں میری اس رائے پر حیرت کا اظہار کریں۔ میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں کہ جس سرعت کے ساتھ رضیہ اسماعیل نے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے مجھے بذاتِ خود وہاں کے احباب سے زیادہ حیرت ہے۔ رضیہ اسماعیل کے یہ Literary leaps and bounces حقیقی طور پر اتنے حیران کن ہیں کہ میں اپنے اس Unique تجربے کو لفظوں میں بیان ہی نہیں کرسکتا۔ پس یوں لگا کہ سوئچ آن کر دیا اور ایک سیکنڈ میں روشنی ہوگئی۔ اگر رضیہ اسماعیل کا یہ تخلیقی سفر میری وہاں موجودگی ہی میں طے نہ ہو پاتا تو میں کسی بھی شاعر یا شاعرہ کی اتنے حیرت ناک Fast progress پر کبھی یقین نہ کرتا۔ اور مجھے اس پر اس بنا پر بھی یقین کرنا پڑا کہ میں نے ایسا ہی ایک کرشمہ فاخرہ بتول کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ اور یاسمین حبیب کو بھی آدھے پونے گھنٹے میں ایک بے پناہ قسم کی غزل کہتے ہوئے دیکھنے کی قسمیہ گواہی دے سکتا ہوں۔ رضیہ اسماعیل نے جو مکالماتی غزلیں کہی ہیں وہ میری اور فاخرہ بتول کی مکالماتی غزلوں کے بہت قریب دکھائی دیتی ہیں اور میرے مصرعوں پر گرہیں لگا کر جو غزل اس نے

Complete کی ہے، مجھے وہ اپنی مکالماتی غزل سے بھی بہتر محسوس ہوئی ہے۔ اور اس نے بغیر کسی خوف اور کمپلیکس کے وہ مکالماتی غزلیں بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنے سے اس پر بہت سے الزامات آجانے کا اندیشہ ہی نہیں ایک خطرہ بھی ہے لیکن جینوئن لوگوں کو ایسی باتوں کی کبھی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہوگی۔ اسی لئے میں نے بھی اس کتاب کا دیباچہ لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

میں اس کتاب کو بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ، ادبی افق پر کسی غروب ہوتے نہیں بلکہ ایک طلوع ہوتے ہوئے سورج کی حیثیت سے پیش کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے ساتھ میرے جتنے بھی ادبی Sessions ہوئے ہیں، ان کے جواب میں اس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

شعر پھولوں کی طرح ضرور ہوتے ہیں لیکن شاعری کی پیچیدگیاں کانٹوں سے کم ہرگز نہیں ہوتیں۔

اور رضیہ اسماعیل کو حقیقتاً ان کانٹوں پر چلنا آ گیا ہے۔ میں اس کتاب پر رضیہ اسماعیل کو پہلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس کے میاں اسماعیل اعظم سے جو میرا بہت پیارا دوست ہے، توقع رکھتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تنقیدی تحریروں کو باقاعدہ طور پر کتابی صورت میں ڈھالنے کا ارادہ کرلے۔ یہ تحریریں بھی نئی تنقید میں یقینی طور پر ایک ادبی اضافہ ہوں گی۔ اس ضمن میں وہ جتنی بار چاہے میرے ساتھ وزیرآباد کے ڈبے میں بیٹھ کر پورے اُردو تنقیدی لٹریچر کے بخیے ادھیڑ سکتا ہے۔ میں اس کے لئے وقت نکالنے کے لئے تیار ہوں اور رضیہ اسماعیل کو اجازت دے کہ وہ کچن سے نکل کر اپنی اگلی کتاب پر یکسوئی سے کام کرے۔ میں اس دیباچے کے انتہائی نجی اختتام پر قارئین کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں تا کہ وہ میری معذرت اور اس دیباچے دونوں کو قبول کرلیں۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو

شبنم شکیل
اسلام آباد

پوری دنیا میں عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا گیا۔ کیوں کہ یہ معاشرہ مرد کا بنایا ہوا ہے۔ چناں چہ آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو خود مرد کے تشکیل کردہ فنونِ لطیفہ کے تمام شہکاروں میں عورت روح بن کر رہتی ہے لیکن عورت اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل پر خود کچھ تخلیق کرے، یہ عمل گویا شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوچ عورت کے لئے ایک ایسا پھل رہی ہے کہ جسے کھا کر اسے اپنی گھریلو جنت سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ شاعری میں بھی وہ موضوع تو بن سکتی ہے لیکن خود اس کا شاعری کرنا خواب و خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔ مگر تخلیق کا شعلہ کہاں تک چھپا رہ سکتا ہے۔ بہارستان، حکیم فصیح کا وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں ایک سو چوہتر (۱۷۴) شاعرات کا نمونہ کلام شامل ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب شاعرات مذکر کے صیغے میں بات کرتی ہیں۔ اس تمہید سے قطع نظر خوب صورت بات یہ ہے کہ پچھلی تقریباً چار دہائیوں سے شاعرات نے اس میدان میں آ کر ایسی دھومیں مچائی ہیں کہ اگلی پچھلی سب کسر نکل گئی ہے۔ گویا عورت کو زبان مل گئی ہے۔ پہلی دفعہ عورت کی شاعری میں اس کی شخصیت ایک واضح انداز میں ظاہر ہوئی۔ انتہائی ذہین اور منفرد سوچ رکھنے والی خواتین اپنی شاعری لے کر وارد ہوئیں اور اپنی ذات کے دھارے کے اندر بند نہیں رہیں بلکہ اجتماعی شعور کے حوالے سے بات کی۔ اس معاشرے کے منافقانہ رویے، دوہرے معیار اور مجرمانہ

مصلحت آمیزی پر کھل کر بات کی۔ ذاتی واردات نے عصری تقاضوں کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ اختیار کیا اور پھر اس پر لکھنے والی ایک عورت کو، جو کسی کے دکھ کو ایسے محسوس کرتی ہے، ایسے سمجھتی ہے کہ جیسے زمین کے اوپر بسنے والی تمام مخلوق کو جانتی ہے۔ رضیہ اسماعیل بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کی شکل میں ان کے شعری مجموعے میں بھی ذاتی واردات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی نا آسودگی، بے انصافی، محرومی اور مظلومیت ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ ان کے مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ہیں۔ ان کی غزلیات کا تذکرہ پہلے کرتی ہوں، وہ اس لئے کہ ان کی غزل سے بھی نظم کا تاثر ابھرتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اصلی میدان نظم ہے۔ جہاں تک ان کی غزل کا تعلق ہے، اس میں ایک ایسی تازگی ہے جو بہت کم نئے لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ شعر میں آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

تجھے پا کر بھی یہ دل ڈھونڈتا رہتا ہے تجھے
تو مِرے پاس بھی یوں کھویا ہوا ہوتا ہے

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

اک لفظ بھی نظر نہیں آتا کتاب میں
یہ کیا لکھا ہوا ہے محبت کے باب میں

بظاہر ان اشعار کے پڑھنے کے بعد گماں گزرتا ہے کہ وہ ایک رومانی شاعرہ ہوگی۔ اس کے اشعار ایسے ہی ہوں گے کہ جس طرح جوانی میں دوسرے شاعروں کے ہوتے ہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال رضیہ کی غزل رومانیت سے جدیدیت کی

طرف سفر کر رہی ہے اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔اس کی نظم بھی اس خوبی سے مزین ہے۔
جو چیز اس کے شعری مجموعے میں پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رضیہ
اسماعیل کی نظموں کے موضوعات اور اس کا ٹریٹمنٹ ہے۔عورت کا دکھ محسوس کرنا تو کوئی
غیر معمولی نہیں لیکن انھیں اپنے پڑھنے والوں کے لئے ایک تیسری جہت (ڈائمینشن) کی
صورت میں پیش کرنا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔اس کی نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ
احساس قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے باطن کی
عورت زندہ ہے اور کتنی زندہ ہے۔ یہ بھی احساس جاگتا ہے کہ باوجود تمام دکھوں اور
محرومیوں کے، کہ جو قدرت نے اور کچھ اس معاشرے نے عورت کے لئے روا رکھے ہیں،
رضیہ اسماعیل کی شاعری امید کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔یہ روشنی ایسی نہیں جو آنکھوں کو چکا
چوند کر دے، یہ تو بہت ہی دھیمی، دل کو سکون بخشنے والی اور ذہن میں نئے خواب جگانے والی
روشنی ہے۔یہ اس کی نظموں میں آپ کو بین السطور نظر آتی ہے اور پڑھنے والا حیران ہوتا ہے
کہ اتنا کچھ برداشت کرنے کے باوجود بھی رضیہ اسماعیل نے اپنے آپ کو Disillusioned
نہیں ہونے دیا۔ورنہ ''تشنہ لب''،''بن بیاہی''،''پتھر کے خواب''،''ننگے پاؤں''،''بانجھ''،
''نئی زمین'' اور ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' جیسی نظموں کو لکھنے کے بعد کسی بھی حساس انسان کا
Disillusioned ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔لیکن اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ''میں
زندہ رہوں گی'' جیسی نظم کہہ سکتی ہے۔اس کی ایک نثری نظم ہے ''خوش قسمت'' ملاحظہ کیجئے۔

خوش قسمت

ہم خوش قسمت ہیں
ہمارے کتنے ہی نام ہیں
مجبور عورتیں، محصور عورتیں
لاچار عورتیں، ریاکار عورتیں

گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں
کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں
بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں
ہم ناشکری
ہم مسلی ہوئی
دھتکاری ہوئی
بیسوا!
بے وفا، بے نشاں
بے حیا، بے اماں عورتیں
مگر
ہمارا ایک ہی نام
کائنات کے سب ناموں پر بھاری ہے
''ماں عورتیں''......!

اسی ایک نظم سے آپ کو رضیہ کے سوچنے کے انداز اور زندگی کی طرف سے اس کا رویہ
معلوم ہو جاتا ہے۔یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ بات کہنے کا سلیقہ بھی جانتی ہے۔

عورت کی سَکّھی

زاہد مسعود

لاہور

رضیہ اسماعیل کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ رضیہ خالدہ تھی اور وزیر آباد کی گلی چاولیاں میں رہتی تھی۔ اس کو آس پاس کے گھروں میں ایک لائق محنتی اور ذہین لڑکی خیال کیا جاتا تھا اور کسی کو گمان تک نہ تھا کہ میٹرک کے امتحان میں وظیفہ حاصل کرنے والی یہ ''پڑھاکو'' لڑکی ایک دن شاعری جیسی ممنوع اور معتوب حرکت کر کے اپنے شاندار تعلیمی کیریئر کو داؤ پر لگا دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ گلی چاولیاں کی وہ بڑی بوڑھیاں جو سر پر ڈوپٹہ سرک جانے پر بچیوں کی سخت سرزنش کیا کرتی تھیں، آج رضیہ کی شاعری سنتیں تو ایک بار اس کو سخت سرزنش کر کے ضرور گلے سے لگا لیتیں۔

عورت کے ساتھ ہمارا معاشرتی رویہ ویسا ہی رہا ہے جیسا کہ کم و بیش ہماری روایتی اُردو غزل میں ملتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس میں پڑے بغیر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ہمارے ہاں زندگی کا تانا بانا مکمل طور پر عورت کے گرد گھومتا ہے۔ مگر عورت کو منہا کر کے، ہم عورت کے حوالے سے ایک زبردست قسم کی منافقانہ روش کو معاشرتی قدروں کا جزو بنا چکے ہیں اور اس پر کاربند رہنے کو مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی عورت کے اس طرح استحصال کی اجازت نہیں دی۔ مگر یہ ہمارا کمال ہے کہ ہم نے چادر اور چار دیواری کے تصور کو حقوق اور تحفظ کی بجائے غلامی، زیادتی اور محکومی سے منسوب کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں جب عورت اپنے وجود کا یقین کرنے کی کوشش

کرتی ہے تو مرد کے لئے اپنے بنائے ہوئے معاشرے میں اتنی ہلچل ضرور پیدا ہوتی ہے جتنی ایک جوہڑ کے اندر پتھر پھینکنے پر۔ تمام جدید شعور اور انسانی حقوق کے ادراک کے باوجود عورت کو انسان تسلیم کرنے کا زمانہ ابھی بہت دُور ہے۔ رضیہ ایک ایسی عورت ہے جس نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچان عطا کرنے کی جدوجہد میں نہایت پُرعزم طریقے سے حصہ لینے کا اعلان کیا ہے اور اس کا ثبوت اس کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ وہ رضیہ خالدہ ہو کہ رضیہ اسماعیل، اسے اپنے ہونے کا پتا ہے اور یہ وہ سعادت ہے جو ہمارے ہاں کی عورتوں کو شاید ہی اس زندگی میں نصیب ہوتی ہو۔ میں رضیہ کو اس نعمت کے حصول پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اسماعیل کو بھی جو میرا بچپن کا دوست اور بڑھاپے کا ''متوقع لنگوٹیا'' ہے کہ اس نے رضیہ کی خود شناسی میں اس کی بھرپور معاونت کی۔ میں رضیہ اور اسماعیل ایک ہی بستی کے بچھڑے ہوئے لوگ ہیں اور اسی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جس کا منظرنامہ ہم ان تنگ و تاریک گلیوں میں چھوڑ آئے ہیں جہاں ہماری ادھ کھلی آنکھیں عمروں سے بڑے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی ملتے ہیں، لمحۂ موجود سے بالکل غافل ہو کر اسی ماضی میں کھو جاتے ہیں جو ہماری بہت سی خاموشیوں کو زبان دیتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کے لئے تمہیدی لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں رضیہ کی شاعری کا وہ قاری ہوں جسے گواہ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس لئے میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ رضیہ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سچ کہا ہے اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ رضیہ کی غزلوں اور نظموں میں کیفیات کے فرق کے باوجود نمایاں بات ذات کے کرب کو ارد گرد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے اور اس کا اسلوب اس صلاحیت کو بہترین طریقے سے استعمال کرنے کا وصف رکھتا ہے۔ رضیہ شعری زبان میں تفصیل کے ساتھ بات کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔ اس کی کتابوں کے ناموں میں وہ اعتماد ہے جو اس کی شاعری کا اصل مضمون ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ رضیہ نے اپنے تخلیقی تجربے کو نعرہ بازی اور غیرضروری

جدیدیت سے آلودہ نہیں کیا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ادبی سیاست اور گروہ بازی سے دور ہی رہی۔ ورنہ یہاں تو ہمیشہ خواتین نے اپنی ہم آواز خواتین کو چپ کا روزہ رکھنے کی تلقین کی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اسی چپ کو اپنی لیڈری چمکانے کے لئے نہایت بے رحمی سے استعمال کیا۔ میرا یقین ہے کہ شاعری کرتے ہوئے شاعر بھی ایک نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ باقی تمام معاملات فروعی اور خودساختہ ہیں جن کا تعلق رنگ، نسل، گروہ کے علاوہ انا اور شہرت کے عوارض سے ہے۔ شاعری سے بہر حال ان کا کوئی تعلق نہیں۔

رضیہ نے اپنی شاعری میں ہجر و وصال جیسے نازک جذبوں کو بھی فطری انداز میں سمو دیا ہے۔ اس کا دُکھ اظہار کے کئی پیرائے اختیار کرتا ہے مگر مطمئن نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس بات کرنے کے کئی طریقے ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ اسے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ غزل ہو یا نظم، اصل مسئلہ کچھ کہنا ہے اور رضیہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔

وہ ایک حوصلہ مند خاتون ہے۔ اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے، کئی خیال بکھیرے، بہت کچھ اَن کہا رہنے دیا، بہت سی لائنیں اور مصرعے قلم زد کیے، بہت سے لفظ لکھ کر مٹائے اور بہت سی سرگوشیاں ہونٹوں کی جنبش میں دفن کیں۔ ہم جان سکتے ہیں کہ بحیثیت شاعرہ اسے کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا مگر اس کے باوجود اس نے کئی خواہشوں، حسرتوں، بے نور صبحوں، تاریک راتوں، آہوں اور کرچی کرچی خوابوں کا حساب مانگا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی اس کے سوالات کا جواب ملنے کا وقت نہیں آیا۔ مگر سوال کرنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور رضیہ نے اس وقت کو پہچان لیا ہے۔ اس نے عورت کی تمام حیثیتوں کو معتبر بنایا ہے۔ اس کا احساسِ ذات بھی محض ذاتی نہیں بلکہ اس عورت کا احساسِ ذات ہے جو چادروں اور چار دیواریوں میں تحفظ کے نام پر غلام بنائے جانے کی قطعاً تمنا نہیں رکھتی۔ اس کو ملکی اور غیر ملکی حدوں میں جس طرح انسان کی بجائے ''مال'' سمجھ کر اِدھر اُدھر کیا جا رہا ہے وہ اسے کسی طرح بھی قبول نہیں۔ آج عورت اگر اپنا اصل حوالہ مانگتی ہے تو حقوق کی

جدوجہد میں وہ اکیلی نہیں، وہ تمام آوازیں اس کے ساتھ ہیں جن کا دُکھ رضیہ کے ان لفظوں میں ڈھل چکا ہے:

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

رضیہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جس روز پھول کھل گیا، صحرا، صحرا نہیں رہے گا، گلشن بن جائے گا اور اس گلشن میں رضیہ اپنی سکھیوں سمیت جتنے دیپ چاہے جلا سکے گی۔

عورت، خوشبو اور نماز

بشریٰ رحمٰن

لاہور

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تحریریں پڑھ کر ایک واضح تاثر بنتا ہے جسے میں کچھ یوں بیان کروں گی کہ جب لڑکی کی شادی ہو جائے، چاہے وہ کسی فقیر سے ہو، بادشاہ سے ہو، گلی محلے میں ہو یا کسی دور دراز شہر میں یا ملک میں ہو جائے، مگر عورت کے دل سے میکہ کبھی نہیں نکلتا۔ میکہ اس کے اندر یوں بسا رہتا ہے جیسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں۔ میکے کا تصور اس کے دل کا طواف کرتا رہتا ہے۔ رضیہ کی شاعری میں دو تصورات بڑے واضح ہیں۔ یعنی ایک میکے کا تصور اور دوسرا پاکستانیت۔ اب جب کہ رضیہ اسماعیل برطانیہ میں رہتی ہیں تو پاکستان ان کا میکہ ہے۔ ان کی پوری شاعری اپنی زمین اور اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہے۔ جب وہ اپنی زمین اور مٹی سے جڑی ہوئی شاعری کرتی ہیں تو پھر انھیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی اپنی عورت نظر آتی ہے۔ اور وہ عورت کے جذبات و احساسات کو ایک عورت بن کر بیان کرتی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کو عورت ہونا اچھا لگتا ہے۔ انھوں نے اپنی نثر یا شاعری میں کہیں یہ نہیں کہا کہ کاش میں عورت نہ ہوتی۔ عورت ہونا ایک بہت خوب صورت بات ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے آپ کی دنیا میں عورت، خوشبو اور نماز پسند ہے۔ یہ بات اسی ترتیب سے کہی گئی ہے۔ اپنی کم علمی کے باوجود جب میں غور وخوض کرتی ہوں تو مجھے عورت کے سلسلے کی ساری وضاحتیں، خوشبو اور عبادت سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ عورت جہاں بیٹھتی ہے، اپنے وجود کی، اپنے کردار کی خوشبو لے

کر بیٹھتی ہے۔ جس گھر کو آباد کرتی ہے، عبادت کے ساتھ آباد کرتی ہے اور وہ گھر عبادت گاہ بن جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عورت کا دکھ کیا ہے؟ ''میں عورت ہوں'' کے پیش لفظ میں رضیہ لکھتی ہیں: ''عورت کی جسمانی ضرورتیں پوری کر کے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ مگر نمازوں میں فرضوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل بھی ہوتے ہیں۔'' میں ان کے بہت گہرے فقرے کے جواب میں یہ کہوں گی کہ زیادہ تر لوگ تو فرض نمازیں ہی ادا نہیں کرتے تو سنت اور نوافل کی فکر کون کرے گا؟

ایک مرتبہ ایک غیر ملکی سفر میں کسی کانفرنس کی غرض سے جاتے ہوئے ایک مولانا صاحب سے عورتوں کے حقوق کی بات چل نکلی تو انھوں نے ایک خوب صورت بات کہی کہ آپ پاکستان یا دنیا بھر میں عورتوں کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے اندر جس عورت کو اس کے شوہر نے کبھی تھپڑ نہیں مارا اس عورت کے سارے حقوق ادا ہو گئے۔ یہ اتنا دردناک فقرہ تھا کہ جس پر میں نہ ہنس سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ رضیہ نے بھی بہت ہی خوبصورت باتیں اور بہت سے خوب صورت اشعار لکھے ہیں جن پر نہ ہنس سکتے ہیں اور نہ رو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہمیں اب اس مقام سے نکل کر اکیسویں صدی کی بات کرنا ہوگی۔ اگر دیکھا جائے تو عام طور پر ہمیں دو قسم کی عورتیں ملیں گی۔ ایک مجبور، محکوم اور پسی ہوئی عورت اور دوسری باغی عورت۔ مگر جس عورت کی بات رضیہ اسماعیل کر رہی ہیں وہ نہ مجبور ہے نہ مظلوم، نہ محکوم بلکہ وہ اصلی عورت ہے۔ وہ عورت کا اصلی چہرہ ہے جو اگر ماں ہو تو قدموں تلے جنت ہے، بیوی ہو تو شوہر کو سرتاج سمجھتی ہے۔ بہن ہو تو بھائی اس کا غرور ہے اور بیٹے کو دل کا سرور سمجھتی ہے۔ وہ ان چاروں حوالوں کو خوشی کے حوالے کہتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ عورت کے یہ چاروں حوالے اس کے حقوق کی بات کہاں تک کرتے ہیں؟ عورت کو درد کی دولت ملی ہے اور کچھ وافر ہی ملی ہے۔ اب اگر قدرت نے یہ دولت عورت کو عطا کر ہی

دی ہے تو پھر قدرت سے کیا کہنا۔اس کا انعام سمجھ کر اپنے پاس رکھ لینا چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کی ساری کی ساری شاعری خوب صورت ہے جس میں شدتِ احساس ہے۔ایک عجیب سا انتظار ہے، ایک گہری اداسی ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔اس طرح جیسے کوئی چیز دوپٹے کے پلو سے باندھ کر گرہ لگائی جائے تاکہ ہمیشہ یاد دلاتی رہے کہ تمھیں اداس بھی رہنا ہے۔ان کی پوری شاعری میں کہیں منافرت نہیں ہے، کہیں منافقت نہیں ہے، کہیں نفرت نہیں ہے۔انھوں نے اس قسم کی باغیانہ شاعری نہیں کی۔انھوں نے چاند، سورج اور ستارے نہیں مانگے۔صرف اپنے وجود کی شناخت مانگی ہے۔اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے جو ہر عورت مانگتی آئی ہے، جو اس کا حق ہے اور اس صدی کے مردوں کو وہ شعور ہے کہ اسے اس کا حق دے سکیں۔

دو حصوں میں بٹی ہوئی عورتوں کے قبیلے میں ہم لکھنے لکھانے والی عورتیں اس پس ماندہ عورت کی بات کرتی ہیں۔اگر ہم اس عورت کی بات نہیں کریں گی تو پھر کون کرے گا؟ ایسی عورت کے حق کی بات بھی ہمیں ہی کرنی ہے جسے علی الصبح چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے اور رات کو لات مار کر سلایا جاتا ہے۔ان کی بات بھی ہمیں دوسروں تک پہنچانی ہے۔اس مرد کے اندر روشنی بھی ہمیں ہی جگانی ہے۔جب ہم ایسی چیزیں لکھیں گی اور دوسروں تک پہنچیں گی تو معلوم ہوگا کہ عورت کیا مانگتی ہے۔اس نے بے مہار آزادی تو نہیں مانگی۔اگر اس نے محبت کی ہے اور فنا ہونے کی ڈگر پر چلی ہے تو کہہ رہی ہے کہ میں تو خود ہی فنا ہونے کے لئے بنی ہوں۔تم کیوں فنا کرتے ہو؟ دراصل محبتوں میں بھی کچھ لین دین ہوتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں مردوں کی طرف سے کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ''یہ آگہی میری مجھے بے قرار رکھتی ہے''...... رضیہ اسماعیل کے پاس آگہی بھی ہے، خوب صورت تحریر بھی ہے، محبت ہے، شدتِ احساس ہے۔ان کی شاعری میں جو سادگی، سچائی اور احساسِ آگہی ہے وہ سیدھا دل پر جا لگتا ہے۔انھوں نے بہت سی خوب صورت نظمیں اور

اشعار کہے ہیں۔مثلاً ان کی ایک نظم تحریر کرتی ہوں:

تحریر

لکھو ، اتنا لکھو
یہ زندگی تحریر بن جائے
کسی کاغذ کے ٹکڑے پر
کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے!
لکھو ایسے کہ حرفوں سے
کسی ماہر مصوّر کی کوئی تصویر بن جائے!
ترے لفظوں میں وہ تاثیر ہو
جو پاؤں کی زنجیر بن جائے!
انڈیلو دل کا سارا درد
تم کاغذ کے ٹکڑوں پر
کوئی فقرہ قلم سے روٹھ کر کچھ اس طرح نکلے
کسی نادیدہ کل کی قیمتی جاگیر بن جائے!

ایک اور نظم ''تجھے دنیا میں رہنا ہے'' میں محبت جب شکوہ کرتی ہے کہ میں دنیا میں کیوں آئی تو جواب دیتی ہیں کہ:

کہا میں نے محبت تو بہت نازک
بہت پاکیزہ جذبہ ہے
یہ اتنی تلخیاں لے کر بہت سے دُکھ سمیٹے
کیسے اب خالق سے تو نظریں ملائے گی
ترا مذہب نہیں نفرت
زمانہ تجھ سے کتنا تلخ ہو جائے

تجھے نفرت کے گھر میں قید کر ڈالے
تمھاری نوچ لے آنکھیں
تمھیں برباد کر ڈالے
ترے تن پر، ترے من پر
ہزاروں زخم آ جائیں
تو چاہے کتنی گھائل ہو
تجھے دنیا میں رہنا ہے
سبھی کا درد سہنا ہے
یہی تقدیر ہے تیری
یہی حکمِ الٰہی ہے!

ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ:

کس جبر میں جیتی ہے مرے دیس کی عورت
تھوڑی سی سہی ، دادِ وفا کیوں نہیں دیتے

بس تھوڑی سی دادِ وفا، تھوڑی سی محبت کی طالب ہے۔ کیوں کہ خود عورت کے پاس وفا اور محبت کے ضمن میں دینے کو بہت کچھ ہے۔ وہ سخی ہے، دریا دل ہے مگر تھوڑی سی بات کہیں اٹکی ہوئی ہے۔ عورت کو محبت کرنے کو، سخاوت کرنے کو، اپنی روشنیاں بکھیرے دینے کو، اپنے آپ کو لٹا دینے کو، گھروں کو آباد کر دینے کو، رسوئی میں خوشبو پھیلا دینے کو۔ اس کا کام یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بس اسی سب کچھ کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ یہ سب اس نے اپنی مرضی، اپنی رضا سے حاصل کیا ہے، تسلیم کیا ہے، مگر ایک بات ضرور ہے کہ سارے ہنستے بستے گھر صرف عورت کے دم ہی سے آباد ہیں۔ جہاں عورت اکڑ گئی، گھر آباد نہیں ہوئے۔ جہاں عورت نے برضا و رغبت سر جھکایا ہے، سر گرایا ہے، انہی گھروں میں سرِ شام خوشبودار دھواں اٹھتا ہے۔ پکوان پکتے ہیں اور سارے مرد دوڑ دوڑ کر گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ سارے گھر اگر

عورت کی وجہ سے آباد ہیں تو سارے شہر مردوں کی وجہ سے آباد ہیں۔ ان عورتوں نے مردوں کو تسلیم کر کے ثابت و سالم کھڑا کر دیا ہے ستونوں کی طرح۔ یہ عورت صبح دم اپنے گھر کا دروازہ کھول کر کہتی ہے کہ جاؤ اور سارے زمانے سے لڑو۔ میں سارا دن تمھارے بچوں کے ساتھ پگھلوں گی اور جب تم سرِ شام آؤ گے تو موتیوں کے ہار گوندھ کر تمھارا استقبال کروں گی۔ جس گھر میں شام کو شوہر نہیں آتا وہ گھر بڑا اداس ہوتا ہے۔ اس گھر کے در و دیوار روتے ہیں۔ اس گھر کے بچے چیختے ہیں۔ اس گھر کی عورت کے ماتھے پر کئی شکنیں ہوتی ہیں۔ یہ آمد و رفت کا عجیب سلسلہ ہے کہ عورت صبح دونوں ہاتھوں سے جسے دنیا کے حوالے کرتی ہے، شام کو وہ اپنے سلگتے سانسوں کے ساتھ اسے وصول کرنا چاہتی ہے۔ گھر کو سجاتی ہے، سنوارتی ہے، یہ گھر ہی اس کی کائنات ہے۔ اس کا سب کچھ ہے۔ جب گھر کے اندر گھر والا آ جاتا ہے تو یہی گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ مگر بہت سے گھر ایسے بھی ہیں جہاں مرد کہتے ہیں کہ نہ دوں تو تجھے روٹی نہ ملے۔ میں نہ دوں تو تجھے کپڑا نہ ملے اور چاہوں تو چوٹی سے پکڑ کر باہر نکال دوں۔ یہ ڈرامے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹے چھوٹے حادثے، رنجشیں بن جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دوستی جاتی رہتی ہے مگر یہ رنجشیں، یہ فقرے گھروں کا سکون لے جاتے ہیں۔ ہم ساری عورتیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے روشنی عطا کی ہے اور وارثوں کی تائید ملی ہے، علم و آگہی کی مشعل لے کر نکلی ہیں تا کہ دلوں کو دلوں سے جوڑ دیں۔ گھروں کو گھروں سے جوڑ دیں۔ رنجشیں بھول جائیں اور دکھ نہ دینے کا ارادہ کریں۔ کیوں کہ ایک دل ٹوٹتا ہے تو ایک گھر ٹوٹتا ہے، ایک گھر ٹوٹتا ہے تو ایک خاندان ٹوٹتا ہے۔ ایک خاندان ٹوٹتا ہے تو ایک محلّہ ٹوٹتا ہے۔ ایک محلّہ ٹوٹتا ہے تو ایک شہر ٹوٹتا ہے۔ اور ٹوٹنے کے یہ سلسلے بہت دور تک نکل جاتے ہیں۔ بات سوچنے کی ہے اور ہم سب کو مل کر سوچنا چاہیے کہ ہم آج تک ایک قوم کیوں نہیں بن سکے۔ میں کہتی ہوں کہ تم عورتوں کو گھروں کے اندر عزتِ نفس دے دو، محبت کی چادر اوڑھا دو، اسے عورت پن دے دو، اس کی عزت کراؤ، قوم ایک قوم بن جائے گی۔ جب عورت کو گھر کے اندر قبول نہیں کیا جاتا،

اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا تو وہ اپنی شناخت کے لئے گھر سے دور ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں ٹریفک کے موضوع پر آئی جی پولیس سے بات ہو رہی تھی تو میں نے کہا کہ عورتوں کو عزتِ نفس دے دیں، ہماری ٹریفک ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ حیرانی سے پوچھنے لگے کہ وہ کیسے ہوگا؟ میں نے کہا کہ گھروں میں چار، چھ، آٹھ یا دس بچے ہوتے ہیں۔ ہم بھی بہت بہن بھائی تھے۔ گھر کی ساری ٹریفک کا انتظام ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سکھاتی تھی کہ ٹریفک درست کیسے رکھنی ہے، کون کہاں بیٹھے گا، کھانا کس کو پہلے ملے گا، روٹی کون بنائے گا، برتن کون صاف کرے گا، باپ کے آگے کون چیز رکھے گا، سکول جانے سے پہلے کیا ہوگا، سکول سے آ کر کیا ہوگا تو یہ سب ٹریفک گھر میں پہلے ماں سکھاتی تھی۔ اب لوگ ماں کو بھول گئے ہیں، اسے تلاش نہیں کرتے، ماں کو نہیں ڈھونڈتے، اس کے قدموں تلے جنت بھی نہیں کھوجتے، اس کے پیچھے پیچھے نہیں دوڑتے۔ اب تو صرف رکشے کے پیچھے لکھا ہوا نظر آتا ہے...... ''ماں کی دعا، جنت کی ہوا'' اور ماں رکشے کے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ ابھی ہمیں ماؤں کی بہت ضرورت ہے۔ گداز دل، محبت کرنے والی مائیں اور جب یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو رضیہ اسماعیل بھی ایسی اداس شاعری نہیں کرے گی۔ مثلاً

سُکھ کا دُکھ

میں دُکھ کے راستے پر
چلتے چلتے تھک گئی ہوں اب
مِرے پاؤں کے چھالے
ہر گھڑی فریاد کرتے ہیں
کسی دُکھ میں چھپے
چھوٹے سے سُکھ کو یاد کرتے ہیں
مِرے اندر کی وہ سہمی ہوئی عورت
مقید جسم کے تاریک کمرے میں

پھٹی آنکھوں سے ہر لمحہ
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ
کھلنے کی صدا کی منتظر
اب تھک گئی ہے

(لاہور میں بشریٰ رحمٰن کی صدارت میں رضیہ اسماعیل کی کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب کا خطبہٴ صدارت)

چشمِ نم......چشمِ حیراں

ڈاکٹر شہناز مزمل

لاہور

رضیہ سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں مگر یہ آنکھوں کا ہی کمال ہے جس سے ہم نے ایک دوسرے کا پہچانا۔ جانے رضیہ کو میری آنکھوں میں کیا نظر آیا۔ یا مجھے رضیہ کی آنکھیں بولتی اور جاگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بہر حال آج ہم دونوں متلاشی آنکھوں کے اس تصادم کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ شاید کوئی دوسرا نہ جان سکے۔

''آنکھیں'' ایک لفظ ہے مگر اس کے اندر معانی کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ رضیہ اسماعیل نے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں مشاہدے کی آنکھ سے حاصل شدہ تمام تر موضوعات کو گرفت میں لا کر کٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چشمِ بینا اور چشمِ بصیرت رکھنے والی رضیہ کچھ عرصہ قبل ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کہہ کر شاعری کی وادیٔ پُر خار میں آبلہ پائی کے لئے قدم رکھ چکی ہیں۔ اس وادیٔ پُر خار میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے جذبات اور محسوسات کو، جو مستعار نہیں لیے جا سکتے بلکہ مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک نیا رنگ دیا۔ آہنگ بے شک پرانا ہے۔

رضیہ اسماعیل جو ایک عورت ہے، ایک ماں ہے، سراپا درد ہے۔ ہر درد، ہر کرب اس کو ممتا نے بخشا ہے، جو تخلیق کار ہے اور تخلیق بنا کرب کے ناممکن ہے۔ درد نے اس کو چشمِ نم اور چشمِ حیراں عطا کی ہے۔ نمی کے اس جھلملاتے سمندر میں منظر اور پس منظر کبھی واضح ہو جاتے ہیں، کبھی دھندلا جاتے ہیں۔ تصویریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ آہو چشم رضیہ چشمِ حیراں کے

سہارے جستجو کے زینے تیزی سے طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ تلاش منزل کی ہے یا اس سے بھی آگے کی یا منزل بے معنی ہے؟ جانے کیا ہے، جس نے اسے آمادۂ سفر کر رکھا ہے؟ وہ پا بجولاں دشت نوردی پر نکلی ہے۔ راستے میں بکھرے ہوئے کانٹے، کنکر، کرچیاں اس کو زخمی کر رہے ہیں۔ تاریک راہوں کے اندر کی روشن آنکھ متلاشی رضیہ کے ساتھ قطب ستارے کی طرح ہے۔ اس سفر میں اس کی چشمِ بینا نے کیا کیا نہ دیکھا۔ تلخیاں، دُکھ کے پھیلے ہوئے ساگر، یہاں تک کہ تلخ حقیقتوں کی کڑواہٹ اس کے اندر تک سرایت کر گئی۔ ظلمتوں نے اس کی باطن کی آنکھ کو روشن کر دیا اور سب کچھ اس کے اندر سمٹ آیا۔ باطن روشن ہوا تو آنکھ میں وسعت آ گئی اور آخر رضیہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

یہ مصرعہ اس کو دورانِ تلاش چشمِ حیراں نے عطا کیا۔ اس کی روشن آنکھ نے اپنی ہم جنس کے وہ روپ اور انداز دیکھے کہ جذبات میں طوفان آ گیا۔ اس جوار بھاٹے میں رضیہ ڈوبتی رہی، پگھلتی رہی اور آہستہ آہستہ اس نے گرداب میں سنبھلنے کا سلیقہ سیکھ لیا۔ ظاہری ٹھہراؤ نے اس کے اندر تلاطم برپا کر دیا اور یہ تلاطم کبھی الفاظ کا خوب صورت اور کبھی کھُردرا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگا اور بکھرتا ہی چلا گیا۔ اور اب یہ بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ اب اس کو روکنا شاید رضیہ کے بس کی بات بھی نہیں۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں جس کا مشاہدہ اس نے پاکستان میں اور پھر برطانیہ میں بھی کیا، اس کو درد آشنا کرتا چلا گیا۔ لامتناہی کرب جو غمِ دوراں غمِ جاناں سے حاصل ہوا، اس نے رضیہ کو بہادر بھی بنا دیا اور زبان بھی عطا کی۔ مگر مایوسی، مظلومیت اور دُکھ کا عنصر اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ عورت کی بے چارگی کا یہ دُکھ اس کی شاعری میں جا بجا بکھرا نظر آتا ہے۔ ظلم کی چکی میں پسی ہوئی عورت سوچ کے بادبان بھی کھولتے ہوئے ڈرتی ہے۔

سوچ کے بادباں

اس ہوا

اس فضا میں
کھلیں بھی تو کیسے کھلیں
مجھ کو تو ہی بتا

رضیہ کو دنیا عقوبت خانہ نظر آتی ہے تو عقوبت خانے جیسی نظم سامنے آتی ہے۔ رضیہ کی شاعری میں بدلتے موسموں کے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس میں خزاں اور ساون کی رُت نمایاں ہے۔ بہار رنگ کم کم نظر آتے ہیں۔ مایوسی کا عنصر زیادہ ہے، امید کی کرن دھندلی ہے۔ کرب اور دُکھ کے بادلوں کی دبیز تہہ میں لپٹے لپٹائے موضوعات اس کی شاعری کا حصہ ہیں۔ آنکھ کا استعارہ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کی اکثر نظموں کا عنوان یہی ہے۔ جیسے:

آنکھیں
آنکھ شرمندہ ہے
بدن میں آنکھ
سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں
متلاشی آنکھیں

''بادبان''، ''آسمان'' اور ''زنداں'' کے استعارے اس نے زمانے کے ناروا رویے سے اخذ کیے ہیں......شاعری کا انداز گفتگو کا سا ہے۔ اس میں خود کلامی بھی اور اندازِ تخاطب بھی ہے۔ تمام شاعری عورت کی ذات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ایسی عورت جو مجبور ہے، مظلوم ہے، محبوس ہے۔ مگر رضیہ جی! میرا پُرخلوص مشورہ ہے کہ اب عورت کو اپنی وہ چیز، جس میں دھوپ باندھ دی گئی ہے، سائباں بنا کر، علَم بنا کر سامنے آنا ہے۔ چودہ سو سال قبل جو آزادی ہمیں ملی تھی، اس حق کو استعمال کرنا ہوگا۔ ہم اپنا استحصال نہیں ہونے دیں گے۔ ہم

عقوبت خانوں میں رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ ہم تو وہ ہیں جن کے قدموں تلے جنت ہے اور یہ بات ہمیں بہانگِ دہل منوانا ہوگی۔ اور آج سب کے سامنے برملا اپنی بات کہنا، رائے دینا، اس چیز کا بیّن ثبوت ہے کہ اب تعمیر کی طرف ہمارے بڑھتے ہوئے قدم روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اور یہاں میں اپنا ایک شعر تمھاری وساطت سے آج کی عورت کی نذر کرتی ہوں۔

ہماری سوچ پر پہرے بٹھاؤ تم تو ہم جانیں
بندھے ہاتھوں سے زندہ لفظ ہم تحریر کرتے ہیں

رضیہ جی اس دفعہ پاکستان میں زندگی کا کچھ سفر تم نے میرے ساتھ طے کیا ہے۔ اب تم ذات کی دہلیز پار کر کے عرفانِ ذات کے عمل سے گزر رہی ہو۔ عرفانِ ذات نے تمھیں ذوقِ آگہی بخشا ہے اور تمھاری باطن کی آنکھیں مزید روشن ہوگئی ہیں۔ یہ روشن آنکھیں روشن ستارے بن کر تمھارے ظلمت کدۂ شب کو درخشندہ کر دیں گے۔ دُکھ سمیٹنے پر سُکھ کے حسین مناظر تمھاری آنکھوں کو مزید جلا بخشیں گے۔ تم خود جان لوگی کہ دعا محبت ہے اور نفرت بددعا ہے، محبتوں کی پیامبر بن کر دنیا میں محبتیں تقسیم کرتی رہو، کرتی رہو! صلے کی پروا کیے بغیر۔ پھر میں کہوں گی:

سب آنکھیں تیری آنکھیں ہیں
سب سپنے تیرے سپنے ہیں
جب دُکھ بانٹے گی سب کے تو
سب سُکھ بھی تیرے اپنے ہیں

۱۲؍ربیع الاول......۱۶جون۲۰۰۰ء
۱۲۵؍ایف ماڈل ٹاؤن لاہور

خوشبو، گلاب، کانٹے (شعری مجموعہ، کلیات) ایک جائزہ

ڈاکٹر شہناز مزمل
(ادب سرائے، لاہور)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ادیبہ، افسانہ نگار، مزاح نگار اور شاعرہ ہیں۔ان کی نثری کاوشیں ''چاند میں چڑیلیں'' اور اب پوپ کہانیاں ''کہانی بول پڑتی ہے'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکی ہیں۔جبکہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' کے نام سے زیرِ طبع ہے۔

خوشبو، گلاب، کانٹے ان کی تخلیقی کاوش کی ایک اہم کڑی ہے جس میں ان کے گذشتہ پانچوں شعری مجموعے (1) گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو۔ (2) سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں۔ (3) میں عورت ہوں۔ (4) پیپل کی چھاؤں میں (اردو ماہیئے) اور (5) ''ہوا کے سنگ سنگ'' کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ان کے پہلے چاروں شعری مجموعے آج سے تقریباً بارہ برس پہلے منصۂ شہود پر آئے تھے اور قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔پیش لفظ ''حرفِ آگہی'' کے نام سے مصنفہ نے لکھا ہے جس میں اردو ادب میں خواتین کو درپیش کئی مسائل کا ذکر کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں اہلِ نظر کے تاثرات کے عنوان سے ان کی شاعری پر لکھے گئے متعدد مضامین شامل ہیں جن میں عدیم ہاشمی، شبنم شکیل، بشریٰ رحمٰن، زاہد مسعود، شہناز مزمل، حیدر قریشی، سلطانہ مہر، حسن رضوی، فرحت عباس شاہ، عثمان صدیقی، ڈاکٹر علی اکبر منصور، ڈاکٹر صفات علوی، شاہد بخاری، محمود ہاشمی، صفیہ صدیقی، پاکیزہ بیگ، پروین شیر، قاضی

عنایت الرحمٰن، طلعت سلیم جاوید، طارق شاہد، سلطان محمود، شاہدہ احمد، فرخ زہرہ گیلانی، یعقوب نظامی، عصمت بانو اور اقبال راہی کے نام شامل ہیں۔

رضیہ کی تحریریں اس کے جذبے، احساس، تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں پل کر جوان ہوئی ہیں۔اس کی ذاتی واردات اور عصری تقاضوں نے مل کر ایک نیا رنگ اختیار کیا ہے۔اور ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ زمین پر بسنے والی تمام عورتوں کے دکھوں کی چشم دید گواہ ہے۔مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی ناآسودگی، بے انصافی، محرومی، مظلومیت اور عورت پر جبر...رضیہ کی شاعری کے موضوعات ہیں جو ان کی غزلوں سے لے کر نظموں، نثری نظموں، ماہیوں اور دوہوں تک میں موجود ہیں۔رضیہ نے اپنی شاعری میں کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ کاش میں عورت نہ ہوتی بلکہ عورت ہونے پر اور ماں ہونے کے مقام و مرتبے پر اس نے نہایت فخر کا اظہار کیا ہے۔عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو نہایت حساسیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

بادباں، زنداں، قیدِ تنہائی، آنکھ شرمندہ ہے، عقوبت خانے، سیپ کا دکھ، آدھی عورت، سورج کی موت، بدن میں آنکھ اور متلاشی آنکھیں جیسے استعارے اور موضوعات اس نے زمانے کے ناروا رویئے سے اخذ کیے ہیں۔رضیہ نے آنکھ کا استعارہ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔بدلتے موسموں کے رنگ، خزاں اور ساون کی رُت ہر جگہ نمایاں ہے۔کرب اور دکھ کے بادلوں کی دبیز تہہ میں لپٹے ہوئے موضوعات اس کی شاعری کا جزو لاینفک ہیں۔

بقول بشریٰ رحمٰن:

> ''رضیہ کی ساری شاعری بہت خوبصورت ہے۔ اس میں شدتِ احساس ہے۔ایک عجیب سا انتظار ہے۔ ایک گہری اداسی ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔اس کی ساری شاعری میں کہیں بھی منافرت نہیں ہے۔نفرت نہیں ہے۔ اس نے باغیانہ شاعری نہیں کی۔اس نے چاند، سورج، ستارے نہیں مانگے صرف اپنے وجود کی

شناخت مانگی ہے۔ اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے۔ جو ہر
عورت مانگتی آئی ہے اور اس کا حق ہے۔''

شبنم شکیل لکھتی ہیں:

''رضیہ اسماعیل کی نظموں کے موضوعات اور ان کا ٹریٹمنٹ نہایت
متاثر کن ہے۔ عورت کا دکھ محسوس کرنا تو کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر
اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایک تیسری جہت (Dimension) کی
شکل میں پیش کرنا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔ رضیہ کی شاعری
امید کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ یہ بہت ہی دھیمی، دل کو سکون بخشنے
والی اور زمین پہ نئے خواب جگانے والی روشنی ہے۔''

ڈاکٹر علی اکبر منصور رقم طراز ہیں:

''رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو
آگہی اور درد کے مماثل ہے۔ جو ہستی کے مماثل ہے۔ عورت کا یہ
عالمگیر تصور اسے تمام خواتین شعرا میں ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔ اس
کی زبان، اسلوب اور موضوعات اس کی تخلیقی ذات اور واردات
سے پھوٹے ہیں۔ گویا رضیہ کا ذاتی شعور اس قدر پختہ ہے کہ اسے کبھی
خارجی نعرے کے سہارے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کی
شاعری میں ایک مکمل فکری THESIS موجود ہے۔ رضیہ کی شعریت
اور فکر و معنویت دونوں انتہائی طاقتور ہیں اور اس کی شاعری کی
صورت میں اردو ادب ایک نئی شعری تہذیب سے آشنا ہو رہا ہے۔''

زاہد مسعود لکھتے ہیں:

''رضیہ نے عورت کی تمام حیثیتوں کو معتبر بنایا ہے۔ اس کا احساسِ
ذات بھی محض ذاتی نہیں بلکہ عورت کا احساسِ ذات ہے جو چادروں

اور چار دیواریوں میں تحفظ کے نام پر غلام بنائے جانے کی قطعاً تمنا
نہیں رکھتی۔ رضیہ ایک حوصلہ مند عورت ہے۔ اس نے زندگی میں کئی
خواب دیکھے، کئی خیال بکھیرے، بہت کچھ کہا اور بہت کچھ اَن کہا
رہنے دیا۔ بہت سی لائنیں اور مصرعے قلم زد کیے، بہت سے لفظ لکھ کر
مٹا دیئے اور بہت سی سرگوشیاں ہونٹوں کی جنبش میں دفن کیں۔ میں
رضیہ کی شاعری کا وہ قاری ہوں جسے گواہ کی حیثیت حاصل ہے اس
لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رضیہ نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے اور سچ
کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔''

عدیم ہاشمی لکھتے ہیں:

''رضیہ ایک اوریجنل اور جینوئن شاعرہ ہے اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی
حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے BARRIERS اگر کراس نہیں
کر چکی تو انہیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے بلکہ
اس سلسلے میں بیرون ملک بسنے والی تمام خواتین کو رضیہ اسماعیل سے
باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ
کر ادب کے کسی بھی قابل رشک مقام و مرتبے پر فائز ہو سکتی ہیں۔
اس لیے اس کے پہلے شعری مجموعے کو بڑے وثوق اور اعتماد کے
ساتھ ادبی اُفق پر کسی غروب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ ایک طلوع ہوئے
سورج کی حیثیت سے پیش کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

رنگین گٹ اَپ، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ پر شائع شدہ یہ کتاب خوبیوں کا مرقع ہے۔
اور بقول ڈاکٹر شبیہ الحسن ''یہ کتاب ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے کیونکہ اس میں گلابوں کی
خوشبو بھی ہے اور کانٹوں کی کسک بھی۔'' اس شعری مجموعے کی رسم اجراء حال ہی میں لاہور

میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی صدارت میں ادب سرائے کے زیرِ اہتمام ''فیض گھر'' میں ہو چکی ہے جس میں اہلِ سخن کی بڑی تعداد نے شریک ہو کر رضیہ اسماعیل کی شعری کاوش کو بے حد سراہا۔

رضیہ اسماعیل کی شاعری کا انتخاب ملاحظہ ہو:

اے کاش سرِ صحرا ایک پھول کھلا ہوتا
اُس پھول کے پہلو میں اِک دیپ جلا ہوتا

کچھ غم تو اندھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا

تجھے یہ سن کے دُکھ ہو یا خوشی ہو
مجھے گر کر سنبھلنا آ گیا ہے
گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گذرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم
میں ڈوبتی ہوں کناروں پہ اور کہتی ہوں
کبھی نہ دیکھے تھے ایسے زوال کے موسم

اینٹوں سے مکاں بنتے ہیں گھر پیار وفا سے
بازار میں بکتے ہوئے گھر دیکھ رہی ہوں
پنچھی ہے قفس ہے کہیں پرواز کی خواہش
میں پنجرے میں ٹوٹے ہوئے پَر دیکھ رہی ہوں

خواب بارش میں ڈھل گئے سارے
کوئی کاغذ کے گھر میں رہتا نہیں

پکے مکاں کی وحشتوں کو دیکھ دیکھ کر
اب ہم نے خواہشوں کے گھروندے بنائے ہیں

ڈال ڈال زخمی ہے پات پات آنسو ہیں
تتلیاں نہ مرجائیں وحشتوں کے موسم میں

پھول کے ساتھ خار ہوتے ہیں
پھول تنہا کبھی کھلا ہی نہیں
ایسا لمحہ جو زندگی دے دے
ویسا لمحہ کبھی ملا ہی نہیں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے شعری کلیات
''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کا ایک مختصر فنی جائزہ

مامون ایمن

نیویارک

اس مختصر جائزہ کے آغاز ہی میں، یہ وضاحتیں ضروری ٹھہرتی ہیں: فی الوقت، صاحبہ مجموعہ اور مضمون نگار دونوں ہی بالترتیب برمنگھم اور نیویارک میں رہتے ہیں۔ نیز، یہ مضمون نگار بھی لندن نامی شہر میں اکیس ماہ سے بہ حیثیت اِمی گرنٹ گزار چکا ہے۔ لہٰذا، وہ لندن کے شعری مزاج سے بالخصوص اور دیگر انگلستانی شہروں سے بالعموم اب بھی ذرا ذرا سا آشنا ہے۔ لہٰذا، رضیہ کو ایک کلی کہیے اور ایمن کو ایک شگوفہ کہیے کہ وہ دونوں ہی بھری بہار تج کر، ایک رواں دواں، سدبہار، خزاں زاد جھونکے کے دوش پر ہچکولے کھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ماضی ہے۔ ان کا حال بے چہرہ ہے اور ان کا مستقبل صرف اور صرف دعاؤں، امیدوں اور آشاؤں سے ہم کنار ہے۔ یہ دعائیں، امیدیں اور آشائیں ہمہ وقت تشکیک اور تذبذب سے مخمور رہتی ہیں کہ ان کی جھولیوں میں دیس، پردیس کے لمحات ہیں۔ وہ لمحات خود کو داستانوں، واقعات اور یادوں میں ڈھال کر، ذہن اور دل کو تزئیں کے ساتھ ساتھ تسکینِ جاں کی ساعتیں فراہم کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان ساعتوں میں نشیب و فراز کے پہلو ایک دوسرے سے مبہم نظر آتے ہیں۔ نشیب و فراز پر مبنی یہی ساعتیں، اِشارے اور کنایے بَن بَن کر، رضیہ کے اسلوب کا خاکہ بُنتی ہیں۔ یہی خاکہ رضیہ کے اسلوب کا اساسی عنصر ٹھہرتا ہے۔ اس اساسی عنصر میں خود کلامی کے ساتھ ساتھ، تجربات بھی ہیں اور مشاہدات

بھی ہیں، جن میں یاس کو آس پر برتری حاصل ہے کہ پردیس میں، بیشتر مواقع پر، سود بھی زیاں کی شکل اختیار کر سکتا ہے، کرتا ہے۔

روشنی کا جو استعارہ تھا
وہی جگنو جلا گیا مجھ کو

تلاشِ خواب میں راتوں سے دوستی کر لی
اندھیرے رات کے پھر بھی ڈراتے رہتے ہیں

مندرجہ بالا پہلے شعر میں خود کلامی کا انداز ہے، جو سبب اور نتیجہ سے مربوط ہے۔ دوسرے شعر میں پنہاں خود کلامی کے ضمن میں کوئی صیغہ واحد متکلم ہے اور نہ ہی کوئی صیغہ جمع متکلم ہے، ہاں، لفظ ''کرلی'' سے تکلم کا اظہار ہوتا ہے۔ اب اس شعر میں لفظ ''مَیں'' کا اِعلان سنیے:

وہ گم تھا اپنی ذات کے صحرا میں اِس طرح
کچھ دیر کو بھٹک گئی مَیں بھی، لگا مجھے

ذرا ملاحظہ کیجیے کہ بھٹکنے کے عمل میں صرف شاعرہ ہی شامل نہیں کہ لفظ ''بھی'' سے انفرادیت، اجتماعیت میں بدل جاتی ہے۔ خود کلامی کے ضمن میں یہ مثالیں خوب ہیں: ''(میرے) لبوں پر ہزاروں باتیں آ کر ٹھہر گئیں/ میں اس سے کیا کہتی کہ اس نے بھی مجھ سے کچھ نہ کہا/ یہ سوچنا عبث ہے کہ (پھر) کوئی موقع ملے یا نہ ملے۔ میں تو نمازِ عشق ہوں (اس لیے) مجھے ادا کر لو/ سمندروں سے عداوت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، میں اپنے دل کی کشتی ڈبو نہیں سکتی/ میری ساری صبحیں نور سے خالی ہیں۔

لہٰذا، میری ہر رات احساس پہ چلتی (ایک) آری ہے/ خزاں نے پیار کے سب نشان یوں مٹا ڈالے ہیں کہ اب تیری یاد کا سایہ بھی میرے ساتھ نہیں رہا/ محبت (اگر) زخم ہے تو کوئی مرہم ڈھونڈ کر لاؤں (اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو) درد کے رستوں کو پھولوں سے سجا ڈالوں/

جینا مجھ کو راس نہ آیا (لہٰذا میں) موت سے رشتہ جوڑ چکی ہوں۔''

مجھے اُڑنے کی خواہش تھی
مگر زنجیر ہونا تھا

اس شعر کی تقطیع یوں ہوگی: مَ فاعِ لُن ،مَ فاعِ لُن ....بحرِ ہزج مربع سالم۔اب یہ چار رکنی مثالیں بھی حاضر ہیں...کہا زمین سخت ہے...کہا یہ تیرا بخت ہے... مَ فاعِ لُن ،مَ فاعِ لُن ....بحرِ ہزج مربع مقبوض/کوئی دل کی شمع بجھا گیا...مجھے آنکھ،آنکھ رُلا گیا... مُ تَ فاعِ لُن ،مُ تَ فاعِ لُن ....بحرِ کامل مربع سالم۔''

رضیہ کے اسلوب میں چھ رکنی بحریں وافر ہیں، مثلاً:

مَیں دیواروں کو گھر کہتی رہی ہوں
مَیں پتھر کو گہر کہتی رہی ہوں

مَفاعی لُن ،مَ فاعی لُن ،فَ عُولُن ...بحرِ ہزج مُسدّس سالم مخدوف۔ چھ رکنی غزلوں میں، بحرِ خفیف مُسدّس مخبون مشعث محذوب....''فاعِ لاتن ،مَ فاعِ لُن ،فَع لُن'' کو نمایندہ کہا جاسکتا ہے۔اس بحر میں چند غزلیں مقصور میں بھی ہیں، یعنی اُن کا آخری رکن ''فَ عِ لان'' ہے۔چُنیدہ غزلوں کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجئے:

''کوئی چلنا سِکھا گیا مجھ کو/ خواب آنکھوں میں کچھ پرانے دو/ اب تو جذبوں کی حکمرانی ہے/ تیری نظروں میں پیار کے ساغر/ روشنی ، یاد، درد کے راہی/ رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں/ چند لمحوں میں پیار کی خاطر/ جو بھی کرتے ہیں اس جہاں میں ہم/ میرے آنسو مِری زباں بنتے/ دِل تِری بات سے خفا ہی نہیں/ دُور شہنائی بج رہی تھی کہیں۔''

پتھروں کے نگر میں آ نکلی
کوئی اِنساں یہاں پہ رہتا نہیں

اپنے حصے کے دُکھ اُٹھانے ہیں
کوئی پیڑیں پرائی سہتا نہیں

ان اشعار کے پہلے مصرے ''فَع لُن'' پر ختم ہو رہے ہیں اور دوسرے مصرعے ''فَ عِ لُن'' پر۔فنی طور پر اس تبدیلی کی اجازت ہے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں، پنجابی زبان کا ایک لفظ ''پیڑیں'' باندھا گیا ہے۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔اس کا واحد ہے ''پیڑ'' بہ معنی درد۔

رضیہ کی غزلوں میں، یہ الفاظ انسلا کی حیثیت رکھتے ہیں: ''دید، دیوار، سایہ، سوغات، پھول۔'' اب اس شعر میں لفظ ''منڈیر'' کا استعمال دیکھئے:

غم گھر کی منڈیروں پر، آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اُس کے آثار نہیں ملتے

یہ شعر بحر ہزج مثمن اخرب سالم ...مَف عُول ،مَ فاعی لُن ،مَ فاعی لُن ...میں ہے۔

اسی بحر میں، تمنّا سے لبریز یہ شعر خوب ہے:

گھر ڈھونڈنے نکلے تھے، ویرانے میں آ پہنچے
اے کاش کہ رستوں میں اِک نام لکھا ہوتا

ہزج ہی کے یہ مصرعے بھی ملاحظہ کیجئے: ''ٹوٹا ہوا خوابوں کا نگر دیکھ رہی ہوں/ ہنستے ہوئے لوگوں کو رلایا نہیں کرتے/ اب اس نے بلایا ہے تو جانا ہی پڑے گا/ ہر بام سے خورشید نکل آئے گا اک دن/ ہم ذات کے صحرا سے نکل پائیں تو کیسے/ مَف عُول ،مَ فاعی ل،مَ فاعی ل،فَ عُولُن ...مثمن مکفوف محذوف/ ار میں آنکھ ہوں تو دیکھنے سے کون روکے گا/ ہمارے عہد کے انسان تو خوابوں میں رہتے ہیں/ کہو، غم کے سفینے کس طرف بہتے ہوئے دیکھے/ ابھی تو آدمی کو لفظ کا عرفان ہونا ہے۔''

مجھے ہر روز کی بربادیوں سے خوف آتا ہے
نہ تم برباد کرتے ہو، نہ تم آباد کرتے ہو

''مَ فاعی لُن ،مَ فاعی لُن ،مَ فاعی لُن ،مَ فاعی لُن''...بحرِ ہزج مثمن سالم۔

رضیہ کی غزلوں کا تنوع خوب ہے، مثلاً: مَیں لاشعور کو مانوں تو کس طرح مانوں/ ممَیں

جب بھی نکلوں تری یاد کے گلستاں میں/ کہاں گرفت میں اب ماہ وسال کے موسم ...مَ فاعِ لُن ،فَ عِ لاتُن ،مَ فاعِ لُن ،فَع لُن ...بحرِ مجتبث مثمن مخبون ابتر/ تیری یادوں کا جو اِک دیپ جلا ہوتا ہے...چاہتیں چاک گریبان پھرا کرتی ہیں...

اب قدم رکھوں تو دھرتی کو سلگتا دیکھوں ...غم کی آنکھوں میں کبھی ڈال کے دیکھو آنکھیں...کب تلک تیز ہواؤں کا مَیں رستہ روکوں...فاعِ لاتُن ،فَ عِ لاتُن ،فَ عِ لاتُن ، فَع لُن ...بحرِ رمل مثمن سالم مخبون محذوف مسکن۔

اس مجموعہ میں بہت سی غزلیں آٹھ رکنی بحرِ متتارب میں ہیں ''فَع لُن ،فعل ،فَ عُولُن ، فاع ،فَع'' کے ساتھ۔اسی بحر میں چند غزلیں دس رُکنی بھی ہیں اور بارہ رُکنی بھی۔

بحرِ متقارب (بنیادی رکن :فَ عُولُن)اور بحرِ متدارک (بنیادی رُکن : فاعِ لُن) میں یہ رُکن مشترک ہیں: ''فع لُن ،فعل۔''

لہٰذا بعض اوقات ان کی تقطیع نسبتاً زیادہ وقت مانگتی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل بحر متدارک مثمن سالم کی یہ غزل واضح ہے ......''موم کے سایاں کو کڑی دھوپ میں ...مَیں پگھلتے ہوئے دیکھتی رَہ گئی...فاعِ لُن ،فاعِ لُن ،فاعِ لُن ،فاعِ لُن۔''

موم کے سایاں کو کڑی دھوپ میں دیکھتے رہ جانا خود کلامی ہی کا ایک انداز ہے۔اس انداز میں ایک مشاہدہ ہے،ایک نیا مشاہدہ کہ الفاظ''موم کے سایاں'' نے بیان کو مجرد بنادیا ہے۔

رضیہ کی بہت سی غزلیں طویل بحروں میں بھی ہیں جن میں خود کلامی کہیں الگ اور کہیں مشاہدات/ تجربات سے جڑی نظر آتی ہے،مثلاً:

اُلجھی اُلجھی دنیا اپنی ذات کے اندر کیسی ہے
شاید چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا جیسی ہے

......

جوان چہرے لُٹے لُٹے سے،نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اُجڑی جوانیوں کو مَیں کیسے عہدِ شباب لکھوں

......

وادی وادی، پربت پربت پھیل چکے افسانے ہیں
جن کو چاہا جان سے بڑھ کر، وہ کتنے انجانے ہیں

رضیہ کی غزلیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں ہوں یا لمبے لمبے مصرعوں میں ، وہ ہرحال ہمہ تَن ایک داستان گو نظر آتی ہے۔اس کی داستانیں کہیں خود سے، کہیں معاشرہ سے اور کہیں ماحول سے گفتگو کرتی نظر آتی ہیں۔اس گفتگو میں کہیں نشان دہی ہے تو کہیں وضاحت اور کہیں صراحت، جو اشاروں، کنایوں، حوالوں اور تذکروں سے سرخ رو ہیں، کہیں سوالات کے جلو میں اور کہیں جوابات کے جلو میں۔

کیا بات سنائیں لوگوں کو، ہم سب کی کہانی ایک سی ہے
اب کس کس بات کو یاد کریں، ہر بات پرانی ایک سی ہے

......

کچھ یادیں ہیں، فریادیں، کچھ آنسو ہیں، کچھ آہیں ہیں
لہروں کا تلاطم ایک سا ہے، دریا کی روانی ایک سی ہے

......

دریا کی سطح پر موجوں کی پرسکون روانی ہے، بجا،اُس کی تہہ میں ایک بے کراں طوفان کا راز بھی ہچکولے لے رہا ہے۔رضیہ کی غزل گوئی وہ راز افشاء کرنے کی مجاز ہے۔

☆ یہ مضمون شامِ رضیہ اسماعیل کی تقریب میں ، بروز بدھ، 20 اپریل ، 2016ء کو لاہور میں مضمون نگار نے خود پڑھا تھا۔

''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

عقیل دانش

خوش فکر شاعرہ۔ دردمند ادیبہ۔ ژرف نگاہ ناقد، معروف سماجی کارکن محترمہ رضیہ اسماعیل اردو دنیا میں ایسا معروف نام ہے۔ جسے سن کر پڑھ کر دل فرحت محسوس کرتا ہے۔ اور انسانوں کے دُکھوں، مصائب، مسائل اور محرومیوں سے نبرد آزما ہونے کا منظر آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ رضیہ نے ایک طویل عرصے سے خود کو خرد افروزی، فکر وفن، شعرو ادب اور دیدۂ دانش کے لیے وقف کر رکھا ہے جس کا ثبوت اُن کی تخلیقات ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' ''میں عورت ہوں'' ''پیپل کی چھاؤں میں'' ''ہوا کے سنگ سنگ'' ہیں۔ اور اب رضیہ صاحبہ نے اپنے ان تمام شعری مجموعوں کو ''خوشبو۔ گلاب۔ کانٹے'' میں یکجا کر دیا ہے۔ اس مجموعے بلکہ کلیات میں نہ صرف اُن کی غزلیں۔ نظمیں۔ ماہیے اور دوہے موجود ہیں بلکہ وہ تاثرات بھی کلیات کا حصہ بن گئے ہیں جو اردو دنیا کے قد آور ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے رضیہ صاحبہ کی فکر وفن پر کیے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ تین عشروں سے اُردو دنیا کو اپنی فکر سے گلزار بنا رکھا ہے۔ اپنی منظّم آگہی، کے ذریعے نہ صرف انہوں نے فکر وفن اور شعر وادب کی مثالی آبیاری کی ہے بلکہ نئے لکھنے والوں کی ایسی حوصلہ افزائی کی ہے کہ ان میں سے کئی آسمان شعر وادب کے ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں۔ انہوں نے برطانیہ کی علم وادب سے متعلق خواتین کی ڈائری مرتّب کر کے اُردو دنیا کو برطانیہ کی اہل قلم خواتین سے روشناس کرانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

رضیہ سماجی خدمت سے متعلق ہیں اور معاشرے میں اُبھرنے والے مسائل،

مصائب، محرومیوں پر ان کی گہری نظر ہے جس کا تاثر اُن کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے پھولوں کی چھاؤں کو چھوڑ کر کانٹوں کی راہ گزر اپنائی ہے اور اپنی ہمت خداداد صلاحیت اور کاوش سے اس راہ گزر کو بھی گلزار بنا دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

رضیہ اول تا آخر شاعرہ ہیں۔ ادیبہ ہیں اور صاحب نظر ہیں۔ مختلف ادبی تحریکوں مثلاً روایت۔ جدت۔ ترقی پسندی۔ مزاحمت۔ اشتراکیت اور رجعت پسند سے بخوبی واقفیت رکھنے کے باوجود انہوں نے اپنی شاعری میں ان تحریکوں کا رنگ ہی نہیں بھرا ہے۔ ان کے اشعار دل کی دھڑکنوں۔ جذبے کی ترسیل۔ احساس کی نزاکت اور خیال کی روشنی سے فروزاں ہیں۔ آپ بھی چند اشعار سے لطف لیتے چلیے۔

قتل جس نے کیا ہے خوشبو کا
اب اُسے سنگسار کرنا ہے

خواب آنکھوں میں کچھ پرانے دو
مجھ کو گزرے ہوئے زمانے دو

میں تشنہ لب ہوں اک مدّت سے جاناں
سمندر میں بھی صحرا ہو گئی ہوں

خواب آنکھوں میں ٹھہر جائیں یہ ممکن ہی نہیں
ہم نے آنکھوں میں بسا رکھی ہے صورت تیری

میں نے آنکھوں کے دریچوں میں جلائی شمعیں
تو نہیں آیا تو اشکوں سے بجھائیں شمعیں

وہ آیا مگر ایسا کہ جھونکا ہو ہوا کا
جانے کا ارادہ ہو تو آیا نہیں کرتے
اپنی قیمت لگا نہ پائی میں
مجھ میں کب اتنی خودشناسی تھی

خودشناسی نہ ہونے کا اشاریہ رضیہ صاحبہ نے اُس پس منظر میں دیا ہے جس میں میرؔ نے کہا تھا کہ

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا پا ہے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

حقیقت یہ ہے کہ وہ مہر آشنا بھی ہیں اور درد شناس بھی اگر درد شناسی ہی نے اُن سے غالباً ''میں زندہ رہوں گی''، ''قتل کا لائسنس''، ''نئی زمین''، ''عورت کا گناہ'' اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں لکھوائی ہیں ایک مختصر نظم آپ بھی ملاحظہ کرتے چلیے عنوان ہے ''بانجھ''

کتنی بانجھ عورتیں
بچہ نہ ہونے کے جرم میں
گھروں کی چاردیواری سے
باہر دھکیل دی جاتی ہیں
بچے تو مرد کا نصیب ہیں
مگر یہ بات مردوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی
شاید سمجھ میں آتی ہوگی۔مگر
لوگ جان کر بھی انجان بن جاتے ہیں

رضیہ قارئین کے دلوں تک پہنچنے کے لیے سادہ۔سلیس رواں اور شگفتہ زبان لکھتی ہیں۔اُن کے یہاں یہاں الفاظ کا طمطراق۔مصرعوں کی دروبست اور صنائع بدائع کا استعمال نظر نہ آتا ہو لیکن آنسوؤں کی روانی اور دل کی دھڑکنیں اُن کی لکھی ہوئی ہر سطر میں اپنا جلوہ دکھاتی

ہیں۔اپنے دوہوں اور ماہیوں میں انہوں نے یادوں کی دھنک سموئی ہے اور معاشرے میں محرومیوں اور ناانصافیوں کی تصویر کشی کی ہے۔چند ماہیے اور دوہے بھی ترزباں بنا لیجیے۔

ماہیے

چندا ہیں نہ تارے ہیں
شکل دکھا جاؤ
ہم ہجر کے مارے ہیں

O

ترے پیار کی برکھا ہے
بھیگ گئی ساجن
تو ایسے برسا ہے

O

پھولے نہ سماتے ہو
اُردو میں انگلش کے
پیوند لگاتے ہو

O

کڑوے ہیں سکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دکھ ماہیا

O

دوہے

چُن چُن سپنے آشاؤں کے ہار پروتی جاؤں
جب بھی پیتم آئے دوارے، اُس کو ہی پہناؤں

مندر جاؤ، مسجد جاؤ، رب تو ایک ہے بھاتی
وہی احد، وہ ہی واحد، روتی کا ہے بناتی

O

سو گئے تارے، نیند کے مارے اور جاگے اِک برہن
لوٹ کے جائے کب آؤ گے، چوکھٹ پر ہیں نہ نینن

O

کاجل، ٹیکا، مہندی، پائل سب ہی شور مچائیں
یاد کریں بچھڑے پیتم کو، ہر دم اُسے بلائیں

O

نیناں برسیں ساون بھادو، گجرا بکھرا جائے
راہ تکوں بیٹھی ساجن کی، کب ساجن گھر آئے

O

''خوشبو، کانٹے، گلاب'' اُردو دنیا کے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ اسے پڑھیے مشامِ جان کو معطر کیجیے۔ رضیہ کے فکر وفن کی داد دیجیے اور دل کی گہرائیوں سے کہیے ع
وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی

''مِٹّی کی آواز اور دائروں کا سفر'' ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

عقیل دانش

خوش فکر شاعرہ۔ ژرف نگاہ ناقد۔ معتبر کہانی کار۔ اور معروف افسانچہ نگار۔ رضیہ اسماعیل کی ایک اور تخلیق اُردو قارئین کے لیے منظرِ عام پر آ گئی ہے۔ مٹی کی آواز اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور دائروں کا سفر افسانچوں کا انتخاب۔ گزشتہ چار دہائیوں سے اُن کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اور وہ نثر ونظم میں اپنی تخلیق کے پھول کھلا رہی ہیں۔ نظم۔ غزل۔ قطعات ماہیے۔ مضامین۔ نقد ونظر افسانے اور افسانچے۔ رپورتاژ۔ طنز ومزاح انہوں نے ہر میدان میں اپنے نقش ہائے پا ثبت کیے ہیں۔ اور ان نقوش پر کتنے ہی قلمکاروں نے چلنے کی سعادت پائی ہے۔ ایک بہت معتبر۔ معروف۔ ہمدرد اور قابل ذکر سماجی کارکن اُن کی زندگی کا ایک رخ ہے اور دوسرا رخ ہے ان کی لوح وقلم سے وابستگی۔ اپنی تنظیم آگہی کے زیرِ اہتمام انہوں نے فکر وفن کے کتنے ہی چراغ جلائے ہیں اور چمکتی دمکتی محفلوں سے دیارِ غیر میں شعر وادب کے پیاسوں کی پیاس بجھائی ہے۔ گزشتہ دنوں ''افسانچے'' کی ابتداء پر جو بحث شروع ہوئی تھی اُس پر اُن کا تجزیہ آخر مانا جاتا ہے۔ پوپ کہانی یا افسانچے کے انگریزی زبان میں خالق سے انہوں نے مذاکرات کر کے اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچا دیا ہے۔ رضیہ اسماعیل کی زیرِ ذکر تخلیق میں افسانوں اور افسانچوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہے۔ جس میں پھول بھی ہیں، شگفتگی بھی ہے، کانٹے بھی ہیں اور آنسو بھی۔ انسانی نفسیات کے خوبصورت تجزیوں اور معاشرے کے خوبصورت اور تلخ زاویوں نے اس تخلیق کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ اُن کا رواح اسلوب، سادہ لیکن دِل میں اتر جانے والی زبان قاری کو مجبور کر دیتی

ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں کہانی ختم کر لے۔ مٹی کی آواز کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے۔

''پتہ نہیں کب چپکے سے فرخ بھائی عینی آپا کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ وہ عینی آپا کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ عینی آپا سے جدائی کا سوچ کر ہی ان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا اگر عینی آپا انہیں نہ ملیں تو وہ زندہ نہ رہ پائیں گے۔ اِدھر عینی آپا کی حالت بھی فرخ بھائی سے کچھ مختلف نہیں تھی۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے محبت کی شدت کو کتنے سادہ اور پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن کے ہر افسانے اور افسانچے کی روح زبان کی سادگی اور تاثر ہے۔ افسانے کے متعلق گزشتہ چند دہائیوں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ انہیں سماجی، نفسیاتی، تجریدی اور علاقائی خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ہم ادب کے ایک معمولی قاری ہیں ہمارے خیال میں افسانہ ہو یا افسانچہ اُس کی بنیاد ''حیرت'' ہے۔ افسانے کا پلاٹ کیسا ہو۔ کرداروں کو کس طرح پیش کیا جائے۔ زبان کیسی ہو۔ در و بست کیا ہو۔ ہماری دانست میں یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ اگر آپ کوئی افسانہ شروع کرنے کے بعد اُسے ختم کیے بغیر نہ رہ سکیں اور افسانے کا تحیّر کشاں کشاں آپ کو افسانے کے اختتام پر لے جائے اور آپ جانے پر مجبور ہو جائیں تو یہی افسانے یا افسانچے کی خوبی ہے۔ رضیہ نے یہ ''رمز'' پا لیا ہے اُن کا ہر افسانہ قاری کو انجام تک پہنچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ یہی اُن کی کامیابی ہے۔ افسانے کی کامیابی کے لیے ''سوچ'' ایک بنیادی امر ہے۔ رضیہ کے افسانے کا اختتام قاری کو زندگی اور رشتوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی امر رضیہ کے افسانوں کو مؤثر اور معتبر بنا دیتا ہے۔ زندگی کے بہت ہی بنیادی حقائق میں امارت اور غربت ہے۔ رضیہ نے اپنے افسانچے میں کتنی خوبصورتی سے اس حقیقت کو قلم بند کیا ہے۔

''زمانۂ طالب علمی میں ہمیں ایک مضمون لکھنے کو دیا گیا تھا۔ موضوع تھا ''امیر غریب'' پاکستان ایک امیر ملک ہے مگر یہاں غریب لوگ بستے ہیں۔'' خیر اس وقت تو موضوع کی گہرائی کا اندازہ ٹھیک سے نہ ہو سکا مگر برسوں بعد غور کرنا شروع کیا تو سمجھ آئی کہ پاکستان

صرف امیر لوگوں کے لیے ہی امیر ملک ہے۔ وگرنہ نان جویں کو ترستے ہوئے غریب لوگوں کے لیے تو یہ ملک ہمیشہ سے ہی غریب رہا ہے کیونکہ ع

''ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات''

رضیہ نے کتنی خوبصورتی سے ایک بیّن حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ''مٹی کی آواز اور دائروں کا سفر'' صاحبانِ ذوق سے داد و تحسین حاصل کر لیں گے۔ ہم رضیہ صاحبہ سے یہی گزارش کر سکتے ہیں کہ ع

لکھو کہ نوکِ قلم زندگی سنوارتی ہے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے افسانوی مجموعے ''آدھی چادر'' پر ایک نظر

عقیل دانش

برطانیہ کے قلم کاروں میں رضیہ اسماعیل کا نام ایک معروف۔ مشہور۔ معتبر۔ مؤقر اور مفتخر نام ہے۔ اُن کی شاعری اور تنقید نے نہ صرف برطانیہ میں بلکہ برصغیر میں ایک اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے شعری مجموعے ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' اور ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پوپ کہانی کے ماخذ پر اُن کی تحقیق اور اس ذیل میں ان کی پوپ کہانیوں کا مجموعہ اردو میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ اور اب وہ ''آدھی چادر'' کے نام سے اپنے افسانے اردو دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل اُن کے افسانے برسوں سے اُن کے ذہن میں پل رہے تھے اُن کی دیگر مصروفیات مثلاً اُن کی سماجی خدمت اور ''آگہی'' کے عنوان سے اُن کی ادبی خدمات نے ایک مدت تک ذہن میں پلنے والی ان کہانیوں کو صفحۂ قرطاس کی زینت نہ بننے دیا اور اب ''آدھی چادر'' اپنے پہلو میں یہ کہانیاں لیے ہوئے منصۂ شہود پر آئی ہے۔ جس طرح ان کی قوت مشاہدہ نے اُن کی شاعری کو ایک خاص رنگ عطا کیا ہے۔ اسی طرح ان کہانیوں میں بھی اُن کی قوت مشاہدہ اور دل کے درد نے رنگا رنگ جلوے بکھیرے ہیں۔ افسانے اور کہانی کے متعلق صدہا اربابِ ادب اور متعدد ناقدین نے بہت سی اور مختلف باتیں کی ہیں۔ مثلاً کہانی یا افسانے کی بُنت کیسی ہو؟ اُس میں کردار کس طرح بیان کیے جائیں۔ گزشتہ صدی میں کہانی اور افسانے کے باب میں مختلف نظریات اور تحریکیں بھی فعال رہی ہیں۔

اور اس صنف ادب کو نیا روپ دینے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں کہانی یا افسانے کا بنیادی عنصر ''حیرت'' ہے کہانی پڑھنے اور سننے والا اگر کہانی یا افسانے میں کھو کر اب کیا ہوگا؟ کی منزل تک پہنچ جائے تو کہانی یا افسانہ ایک کامیاب تخلیق ہے۔ رضیہ اسماعیل نے اس رمز کو سمجھ لیا ہے۔ وہ سیدھے سادے ڈھنگ سے اور بہت سادگی سے کہانی لکھتی ہیں اور اُن کا قاری مستقل اور مسلسل اُن کی سوچ کے ساتھ چلتا ہے اور کہانی کے اختتام پر کبھی رنجیدہ ہوتا ہے تو کبھی بشاش اس لیے کہ زندگی خود مسکراہٹوں۔ قہقہوں۔ آنسوؤں اور آہوں کا نام ہے۔ اُن کی کہانی ''دیوارِ گریہ'' کے دو مکالمے میری گزارش کی وضاحت کرتے ہیں۔ ''تم کس دیوار گریہ کی آس لگائے یوں بے حوصلہ ہوتی جا رہی ہو؟'' ''کوئی کسی کی دیوار گریہ نہیں بنتا ہر ایک کی اپنی اپنی دیوار گریہ ہوتی ہے سرکٹ کر ہمیشہ اپنے ہی شانوں پر گرتا ہے۔'' ''آدھی چادر'' میں 11 کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے کچھ کردار تو اب بھی اُن کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور کچھ کردار تقسیم برصغیر کا پس منظر سمیٹے اُن کے ذہن بسیرائے ہوتے تھے جنہوں نے اب کہانی کا روپ دھار لیا ہے۔ رضیہ کو بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اُن کی تحریر پرشکوہ الفاظ اور طمطراق کے جملوں سے آراستہ نہیں ہے۔ لیکن ان کے سیدھے سادے الفاظ اور دل سے نکلے ہوئے جملے قاری کو کہانی کے شروع سے آخر تک اپنے ساتھ باندھے رکھتے ہیں۔ ''دیوار گریہ'' ہی میں جگہ وہ بڑی سلیس زبان میں لکھتی ہیں۔ ''شاید دکھ کا مجھ سے کچھ زیادہ ہی رشتہ ہے۔ ایک دن ہنستی ہوں تو دس دن رونا پڑ جاتا ہے۔'' اُردو کے ساتھ رضیہ نے دیگر زبانوں خصوصاً انگریزی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور عالمی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ مختلف ادبی تحریکیں اُن کے شعور میں پیوستہ ہیں لیکن انہوں نے سلاست کو اپنا رہنما بنا کر یہ کہانیاں لکھی ہیں۔ نتیجتاً بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں جا بیٹھتی ہے۔ ہم ان کی اس کاوش پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اس صنف ادب کو اپنے قلم کے جادو سے افتخار بخشتی رہیں گی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے دوہے، روایت اور جدّت کا حسین سنگم

عقیل دانش

سنسکرت سے مشتق زبانوں میں ''دوہا'' مختلف شکلوں میں برصغیر کی ایک خوب صورت روایت رہی ہے۔ خصوصاً ہندی میں ہر دَور میں دوہے کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا ہے۔ لفظ ''دوہا'' خود دو مصرعوں کا اعلان کرتا ہے جس میں بات مکمل کی جاتی ہے۔

ہندی کے متعدد کویّوں نے دوہے لکھے کہ اس کی جڑیں عوام میں، خصوصاً دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سورداس اور کبیر داس جیسے شعرا نے دوہے کو نیا رنگ دیا اور زندگی کے حقائق کو دوہے کا حصہ بنا کر عوام کے دلوں میں جگہ پالی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے بھی دوہے اُردو شاعری کا ایک اہم حصہ رہے لیکن گزشتہ تین عشروں میں اِس صنف نے عوام کو مسحور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، دوہا گاؤں کی چوپالوں میں ایک مخصوص ترنم سے ادا کیا جاتا تھا۔ اسے شہری مشاعروں کی زینت بنانے میں جن لوگوں نے خونِ جگر صرف کیا ہے، اُن میں ایک نام جمیل الدین عالیؔ کا ہے جنھوں نے اپنے خاص ترنم سے دوہے کو مقبولِ عام بنا دیا۔ جب مشاعروں میں وہ اپنے خاص انداز سے دوہا پڑھتے ہیں تو بشاشت، فرحت اور سوچ سامعین کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

عالیؔ اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیّا کہہ گئی نار

دوہے کی مقبولیت نے اُردو شعرا کہنے پر اکسایا، نتیجتاً اب تقریباً ہر شاعر دوہا لکھ رہا ہے اور اس صنف کو اعجاز، اعتبار اور حسن بخش رہا ہے۔ ان کو حسن عطا کرنے والوں میں ایک نمایاں، مقبول اور محترم نام ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا ہے۔ جنھوں نے زندگی کی مختلف حقیقتوں کو دوہے کا روپ دے کر اپنے قارئین کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ انھیں سوچنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ ان کے چند دوہے پڑھتے چلیے:

درپن جھوٹ کبھی نہ بولے یہ دھندا نادانوں کا
سچ کا پرچم لے کر نکلو کام یہی انسانوں کا

پیار محبت جیون جیوتی کبھی نہ جو بجھ پائے
پیار عبادت سچے رب کی راس دلوں کو آئے

رضیہ صاحبہ نے اپنے دوہوں کا مخصوص رنگ نمایاں رکھا ہے اور وہ ہے عوامی زبان جس میں ہندی کے الفاظ اپنی چھب دکھا رہے ہیں۔ عموماً دوہوں میں روایتاً محبت، ہجر، فراق اور وفا و بے وفائی کا ذکر ہوتا ہے لیکن رضیہ اسماعیل نے زندگی کے مختلف حقائق کو دوہے کا حصہ بنا کر دوہے کی صنف کو اعتبار عطا کیا ہے۔ یہ دوہے پڑھیے۔

پیدا کیا انسانوں کو فی احسن تقویم
تاجِ نیابت سر پر رکھ کر ہم کو دی تکریم

میں دیکھوں آکاش کو اور مجھ کو دیکھے وہ
کاش میں اس سے پوچھ سکوں کیوں گردش میں ہے وہ

رضیہ نے دوہے کے خاص ماحول میں بھی زبان کے جوہر دکھائے ہیں جو بڑی خوب صورتی سے محاورے کو دوہے کا حصہ بنایا ہے۔

آس امید پہ دنیا قائم، ٹھیک نہیں ہے نراشا
سہج پکے سو میٹھا ہووے، نا کر کھیل تماشا

رضیہ صاحبہ کے دوہے زبان و بیان کی خوب صورتی کے علاوہ سوچ کا انوکھا زاویہ تراش کر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ ہم تو بس اتنا کہ سکتے ہیں کہ
وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی

رضیہ اسماعیل کی ''آدھی چادر''

یعقوب نظامی
بریڈفورڈ

برمنگھم میں مقیم ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' بک ہوم لاہور نے شائع کیا۔ کتاب دیدہ زیب، کاغذ انتہائی نفیس اور جلد مضبوط.....ٹائٹل پر پہلی نظر ڈالنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خون کا دریا بہہ رہا ہے جس کے دونوں کناروں پر سیاہ اندھیرا ہے۔ اُس اندھیرے میں......آدھی چادر......سرخ روشنائی میں لکھی ہوئی بہت ہی نمایاں ہے اور ساتھ رضیہ اسماعیل کا نام سفید روشنائی میں لکھا ہوا یوں لگتا ہے جیسے کوئی روشنی کا چراغ لیے اندھیرے میں اجالا پھیلانے کی جدوجہد میں ہے......یہ سچ ہے کہ علم روشنی ہے...... جس روشنی سے اندھیرے کو روشنی میں بدلا جا سکتا ہے۔

کتاب کی پشت پر رضیہ کی باوقار تصویر ہے، چہرے پر کامیابی و کامرانی کی مسرت نمایاں نظر آتی ہے......جیسے کہہ رہی ہوں......دیکھا ہے ہم صنف نازک ہو کر علم کی شمع روشن کر رہی ہیں......لیکن حیرت ہوتی ہے کہ رضیہ پی ایچ ڈی کرنے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کتراتی ہیں۔

آدھی چادر......میں گیارہ کہانیاں ہیں تو پوری چادر کے نیچے یقیناً بائیس کہانیاں ہوں گی......اس کا مطلب ہے کہ جلد ہی دوسری کہانیوں کی کتاب منظرعام پر آنے والی ہے......دیباچہ نامور ادیب، محقق، نقاد اور شاعر حیدر قریشی نے لکھا ہے جبکہ ممتاز ادیبہ سلمیٰ اعوان کی رائے بھی کتاب کا حصہ ہے۔

آدھی چادر میں لپٹی پہلی کہانی ......روشنی کا تعاقب ......ہے جو ایشیائی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے قاری شروع سے آخر تک سسپنس میں رہتا ہے...... آغاز میں عمر رسیدہ رحیمو ں ایک جوان لڑکی سے شادی رچاتا ہے جس کا پھل رحیموں کی بجائے محلے کے نوجوان زیادہ کھاتے ہیں......اس بات کو رضیہ یوں بیان کرتی ہیں......

’’اوئے رحیمو!......اگر اس بے چاری پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اب دن رات گالیاں دینے سے اس کی جوانی کا منہ زور دریا تو اُترنے سے رہا، پکی عمر میں سہرا باندھ کر گھوڑی پر بیٹھنا تو آسان ہے مگر گھوڑی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے......‘‘ رحیمو جولاہے کے ساتھ ساتھ ماسٹر دل محمد اور فیقے جیسے معاشرتی کردار بھی اس کہانی میں موجود ہیں......جو ہمارے معاشرے کے مردوں کی جنسی ہوس کے ارد گرد گھومتے نظر آتے رہتے ہیں......ایک ایسا معاشرہ جہاں مرد بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن آنکھیں پیاسی اور دل جوان رہتا ہے ......سنا ہے ایسے ہی ایک بوڑھے سے کسی نے پوچھا کہ باباجی مردوں میں شادی کی خواہش کب تک رہتی ہے؟......بابا نے جواب دیا بیٹے رسم سوئم تک......میں ابھی رسم سوئم والی بات سوچ ہی رہا تھا کہ کہانی نے ایک نیا رخ بدلا......تو رضیہ اسماعیل نے قرآن پاک کی سورہ والتین کا ذکر کر دیا جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اعلیٰ تخلیق، بلندی اور پستی کا ذکر یوں کیا ہے......ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا‘‘......یعنی......اسفل السافلین...... بلند رتبوں والے انسان کی پستی کا ذکر جس میں یہی اشرف المخلوق انسان کبھی کبھی درندگی کا مظاہرہ کر کے پستی کی بھی انتہا کو چھو جاتا ہے جہاں وہ ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز کو بھی بھول جاتا ہے اور پھر حرص، طمع، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن کا اس طرح مظاہرہ کرتا ہے کہ انسان کے اشرف المخلوق ہونے پر شک ہونے لگتا ہے......اس مقام پر لا کر رضیہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ قاری کی توجہ معاشرتی مسائل کی طرف لگا کر خود ایک سٹیج سنبھال کر اپنا اصل مدعا......روشنی کے تعاقب...... پر انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والا لیکچر دیتی ہیں جس میں زبان

کی چاشنی کے ساتھ ساتھ بڑی مہارت کے ساتھ اللہ سے محبت ہی کا راستہ بناتی ہیں جس روشنی سے دونوں جہاں روشن ہوتے ہیں یعنی......اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن۔

اس مجموعہ میں ایک سے بڑھ کر ایک کہانی دلچسپ اور قاری کو اپنے قابو میں رکھتی ہے...... ہر کہانی بامقصد اور کسی نہ کسی سبق آموز موضوع کے گرد گھومتی ہے......کتاب میں شامل ایک اور کہانی......کیہ جاناں میں کون؟......بہت ہی خوبصورتی اور مہارت سے لکھی گئی ہے......یہ کہانی ایک جیتے جاگتے کردار کے ارد گرد گھومتی قاری کو پاکستان کے شہر فیصل آباد سے امریکہ کے شہر شکاگو لے جاتی ہے......اس کردار پر بہت عرصہ پہلے میں نے...... خوشیا......نامی ایک مضمون پڑھا تو وہ مجھے اس قدر پسند آیا کہ میں نے اس خوشیا کو ڈھونڈا تو وہاں......افتخار نسیم افتی......ملا۔ پھر افتخار سے میری دوستی ہوئی جو اس کی اس جہاں سے رخصتی تک قائم رہی...... یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رضیہ اسماعیل نے بھی یہ کہانی افتی پر ہی لکھی اور کمال کی لکھی......اس کہانی میں بھی رضیہ نے اپنے ہنر کے جوہر دکھائے اور الفاظ کا بہت ہی محتاط اور خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہوئے کہانی کے سسپنس کو شروع سے آخر تک قائم رکھا......آخر رضیہ کہانی کے کردار سے چادر اُتار دیتی ہیں......’’آدھے ادھورے پھیکے رنگوں سے بنی ہوئی اس کی تصویر میں دھنک کے سارے ہی رنگ موجود تھے سوائے ساتویں رنگ کے۔ لگتا تھا کہ اس کی آفرینش میں بنانے والے نے ساتویں رنگ کی جگہ آٹھواں رنگ استعمال کر دیا تھا۔ اسی لیے تو وہ نہ مکمل مرد بن سکا اور نہ ہی عورت......بس دونوں کے بیچ کی کوئی آدھی ادھوری چیز‘‘......یوں......کی جاناں میں کون؟ کا راز آشکار ہوتا ہے۔

اس مجموعہ میں......ہرنام داس......نامی ایک کہانی آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے......اس کہانی کا ایک منظر کچھ یوں ہے......’’ابا کہہ رہے تھے......جب میں نے ریحانہ کو برچھی ماری تو وہ سیدھی اس کے دل پر جا لگی۔ مجھے ریحانہ کی وہ نگاہیں نہیں بھولتیں

جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ جن ہاتھوں سے مجھے اُسے ڈولی میں بٹھانا تھا، انہی ہاتھوں سے میں نے اسے خون میں نہلا دیا۔ مگر میں کیا کرتا؟ اُسے اُس روز نہ مارتا تو وہ زندگی بھر ہر روز ہزار بار مرتی۔''

رضیہ اسماعیل نے پی ایچ ڈی کی تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تحقیق وجستجو ان کی رگ رگ میں سما گئی......اب یہ جو بھی لکھتی ہیں وہ محض ایک کہانی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ان کی تحقیق، زندگی کا تجربہ شامل ہوتا ہے......آدھی چادر......ان کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انہوں نے فلش بیک کے ساتھ ساتھ اپنے علمی وتحقیق تمام جوہر شامل کر دیئے ہیں......یہ افسانہ تقسیم ہند کے گرد گھومتا ہے لیکن اس میں رضیہ نے کمال درجہ کا ہنر استعمال کیا کہ قاری جہاں اسے پڑھتے ہوئے مزے لیتا ہے وہاں وہ تاریخ کے تاریک ترین پہلوؤں سے گزرتے ہوئے جذبات کے طوفان میں بہتے ہوئے سوچنے لگتا ہے کہ کیا وہ انسان تھے یا حیوانوں سے بدتر کوئی مخلوق تھی جو عورتوں کی عصمت سے کھیلتی رہی......بچوں پر ظلم ڈھائے......بوڑھوں کو قتل کیا اور یہ قتل عام اس قدر رہا کہ لاشوں کے ڈھیر اور خون کے دریا بہا دیئے گئے......اس کہانی میں ہم تاریخ کو مرتب ہوتے دیکھتے ہیں جس میں......ایک طرف ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور ڈاکٹر نارگ جیسے شاطر لیڈروں کے نعرے کانوں میں گونجتے ہیں دوسری طرف قائداعظم اکیلی جان ان سب کے مقابلہ کر رہے ہیں......کہانی میں لارڈ مونٹ بیٹن کی تاریخی مکاری بھی نظر آتی ہے......جس نے نہرو، گاندھی، پٹیل اور وی پی مینن کے دباؤ میں تقسیم ہند میں ہیرا پھیری کی اور پنجاب کے بہت سے علاقے بشمول گرداسپور جو پاکستان کی طرف آتے تھے انہیں جان بوجھ کر ہندوستان میں شامل کر کے پنجاب میں خون کے دریا بہا دیئے۔ جس کے نتیجہ میں......کھول دو......ٹھنڈا گوشت......ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے لازوال افسانے تخلیق ہوئے......اب رضیہ کی کہانی......آدھی چادر......بھی ان لازوال افسانوں میں شامل ہو چکی ہے......رضیہ الفاظ سے کھیلتی اور الفاظ کو بڑی ہنر مندی کے ساتھ کچھ اس طرح استعمال کرتی ہیں......''جانتی ہوں انسان کا اصل نام بشر ہے وہ......ب ش

ر......یعنی تین لفظوں کا مجموعہ ہے جس کے لغوی معنی ......بشارت دینے والا......کے ہیں۔ اس میں سے صرف اگر ......ب......کو ہٹا دیا جائے تو پیچھے دو حرف کا مجموعہ یعنی ......شر......رہ جاتا ہے''۔

آدھی چادر میں شامل گیارہ افسانے دلچسپ اور فنی لحاظ سے مکمل ہیں......رضیہ نے اپنی کہانیوں میں حواس خمسہ کے پانچوں احساسات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ایک اچھی کہانی اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی جس میں ......دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی پانچ قوتیں شامل نہ ہوں۔ رضیہ کا اسلوب انتہائی سادہ لیکن ان کی کہانیوں کے موضوع سنجیدہ اور بامقصد ہیں۔ یہ کہانیاں اس قدر دلچسپ ہیں کہ قاری ان میں مکمل کھو جاتا ہے اور کہانی ختم ہونے کے بعد بھی After shock کا سلسلہ جاری رہتا ہے......کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن قاری کی پیاس نہیں بجھتی......بلکہ قاری کہانی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اس کے اثرات اُس کے ذہن پر دیر پا رہتے ہیں......رضیہ تحقیقی خاتون ہیں......ان کے اندر رچا بسا تجسس اور تحقیق کا مادہ انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا......غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری، ان کے افسانے' ان کے انشائیے ہر جگہ ان کی تحقیق موجزن ہے جس کی وجہ سے ان کے تخلیقی مواد میں جہاں ادبی چاشنی موجود ہے وہیں ان کی تحقیق کا پورا نچوڑ بھی شامل ہوتا ہے جس سے قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ رضیہ اسماعیل نے محنت کے ساتھ ساتھ اپنے فن، علم اور تحقیق کو یکجا کر کے انتہائی خوبصورت افسانے تخلیق کر کے اپنے آپ کو ایک منفرد افسانہ نگاروں کے ہراول دستہ میں شامل کر لیا ہے۔

مٹی کی آواز

یعقوب نظامی

بریڈفورڈ، برطانیہ

رضیہ اسماعیل سے میری پہلی ملاقات ''تکیہ محمود ہاشمی'' پر ہوئی۔ مجھ سے پہلے محمد اقبال بھٹی، خواجہ محمد عارف اور رضیہ اسماعیل اس تکیہ سے وابستہ تھیں۔ میں بھی چپکے سے اس حلقہ میں داخل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم سب ایک ہی گھرانے کے فرد ہیں۔ مجھے جہاں ہاشمی صاحب کی سرپرستی ملی وہیں رضیہ اسماعیل کی صورت میں ایک بہن کی شفقت بھی میسر آئی۔ رضیہ اسماعیل دراز قد خوبصورت اور بارعب خاتون ہیں۔ جن سے پہلی بار مل کر مجھے ان کی باوقار شخصیت سے خوف سا محسوس ہوا۔۔۔ ممکن ہے یہ بات انھوں نے بھی بھانپ لی ہو۔ چنانچہ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھ سے چھوٹے بھائیوں جیسا اس طرح کا سلوک شروع کیا کہ جلد ہی میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ تکیہ محمود ہاشمی میں دنیا ادب کی باتیں ہوتی تھیں۔ ہمارے محور محمود ہاشمی تھے۔ جن کی علمی شمع سے ہم مستفید ہوتے تھے۔

رضیہ اسماعیل کے ساتھ ایک اور مشترکہ بات ہے اور وہ ہے ''اسماعیل'' میں ابن اسماعیل ہوں۔ اور رضیہ بھی اسماعیل کی رفاقت میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔

رضیہ اسماعیل سے میری ایک اور نسبت بھی ہے۔ میں گذشتہ 33 سالوں سے برطانیہ کے لوکل گورنمنٹ میں خدمت انجام دے رہا ہوں۔ باجی بھی لوکل گورنمنٹ میں سوشل سروسز میں خدمات انجام دے چکی ہیں۔ کچھ یہی سبب ہوا کہ ان میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوا جس نے ''آ گہی'' کو جنم دیا۔ ''آ گہی'' نامی تنظیم کے پلیٹ فارم سے انہوں نے

خواتین کی خدمت کی اور اُن کے حقوق کی جنگ لڑی۔ حکومت برطانیہ نے ان کی خدمات کو سراہا اور ملکہ برطانیہ نے انہیں ایم بی ای کے خطاب سے نوازا۔

رضیہ اسماعیل کثیر الجہت خاتون ہیں۔ سوشل ورک کے علاوہ یہ شاعرہ ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری اور پھر خوبصورت افسانہ نگار بھی ہیں۔ وسیع المطالعہ ہیں۔ جب یہ ادب کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتی ہیں تو پھر اس پر ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ ان کے بے باک ادبی تبصروں اور رائے سے ان کے جہاں ہمدرد دوستوں کا ایک حلقہ ہے وہیں ان سے خار رکھنے والوں کا بھی ایک ہجوم ہے۔ میں نے کئی بار انہیں بڑی ہمت سے چار سو لڑائی لڑتے دیکھا۔ یہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہیں۔ ادبی دنیا ان کی قدردان ہے چونکہ یہ بغیر لگائے لپٹے بات کھل کر کرتی ہیں اور صرف بات نہیں کرتی بلکہ اپنی بات کو دلائل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یہ بات وہی انسان کر سکتا ہے جو صاحب علم ہو اور وسیع المطالعہ ہو۔

ادبی دنیا کو ان کی تازہ ترین محنت اور کاوش کا ثمر ''مٹی کی آواز'' کی صورت میں سنائی دی۔ یہ ان کے دس افسانوں پر مشتمل کتاب کا حصہ اول جبکہ حصہ دوم ''دائروں کا سفر'' میں ان کے افسانچے ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بک ہوم لاہور نے 2019ء میں شائع کیا۔ کتاب شائع ہوئی تو اس کی ایک جلد میری ذاتی لائبریری کی زینت بھی بنی۔ میں بنیادی طور پر مؤرخ اور سفرنامے لکھنے اور پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں لیکن ''مٹی کی آواز'' نے مجھے پڑھنے پر مجبور کیا۔ اور جب اسے پڑھنا شروع کیا تو اس کتاب نے مجھے اپنے حصار میں اس طرح لیا کہ ایک کے بعد دوسرے افسانے نے میرا دامن گھیرا۔۔۔ یوں میں نے ایک دن میں اس کتاب کو پڑھا اور ذہن میں ابھرنے والے خیالات کو تحریر میں بھی لے آیا تا کہ سند رہے۔

میں نے کتاب کا مطالعہ الٹے ہاتھ سے کیا۔ یعنی پہلے افسانچے اور پھر افسانے۔
افسانچے کا انتخاب پہلے کیا کیوں؟۔۔۔ یہ معلوم نہیں۔۔۔!

ممکن ہے اس لئے کہ افسانچے مختصر ہوتے ہیں اور قاری جلدی جلدی پڑھ لیتا ہے۔ میں نے افسانچے پڑھے تو لطف آ گیا۔ یہ میرے ساتھ ایسے ہی ہوا جیسے ورزش کرنے سے پہلے جسم کو گرمانے کے لئے لوگ ہلکی پھلکی ورزش کرتے ہیں۔ جب انسانی جسم رواں ہو جاتا ہے تو پھر ورزش کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ افسانچوں میں مجھے سب سے زیادہ ''بوسہ'' پسند آیا۔

''یوں تو بوسے کئی طرح کے ہوتے ہیں مگر سب سے کربناک بوسہ وہ ہوتا ہے جو ایک بوڑھی ماں اپنے جوان بیٹے کی قبر کی مٹی کا لیتی ہے''

یہ مختصر ترین افسانہ پڑھا تو میرے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر گھومنے لگا۔۔۔منیر حسین میرے بہت ہی پیارے دوست تھے۔ ہم نے ایک ساتھ بہت سے ملکوں کی سیاحت کی لیکن ایک شام ہنستے کھیلتے ہم جدا ہوئے تو صبح معلوم ہوا منیر بستر پر سویا لیکن سوتے میں مر گیا۔ ایک دن میں اپنے عزیز دوست کی قبر پر گیا تو دیکھا اُس کی ضعیف ماں رو رو کر بیٹے کی قبر کی مٹی کو بوسے دے رہی تھی۔ یہ منظر اتنا کربناک تھا کہ میں اسے زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔۔۔معلوم نہیں ماں کتنا عرصہ بیٹے کی قبر کی مٹی کو چومتی رہی۔

دائروں کا سفر۔۔۔تو بھی ختم نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے ''مٹی کی آواز'' پکار رہی تھی۔ چنانچہ دائروں سے نکل کر میں نے کتاب کے پہلے حصے مٹی کی آواز کا رخ کیا۔

کتاب کے پہلے حصے میں شامل دس افسانوں میں سب سے نمایاں افسانہ ''مٹی کی آواز'' ہے۔ یہ اس قدر دلکش ہے کہ اس نے تمام افسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے رضیہ باجی بھی اس افسانہ کی گرویدہ ہیں اس لئے تو انہوں نے اپنے افسانوں کے مجموعہ کو بھی یہی نام عطا کیا۔ یہ افسانہ ہمارے روایتی سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں ہمارے سماج میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں لیکن رضیہ اسماعیل نے بڑی چابکدستی سے اس کہانی کو اس طرح بیان کیا کہ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے اس میں تجسس پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہی تجسس قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ رضیہ نے بڑی

ہنر مندی کے ساتھ معاشرتی مسائل کو قلم بند کیا ہے۔ ان کی تحریر سادہ اور پُر کشش ہے۔ اس کہانی میں تجسس، خاندان کی اندرونی سیاست اور سازشیں سب کچھ مل کر اسے ایک سبق آموز کہانی بنا دیتے ہیں اور جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو قاری سوچنے لگتا ہے کہ واقعی کہانی کے مرکزی کرداروں ''عینی اور فرخ'' کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ یہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں ہر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور پھر خود ہی فیصلہ کرتا ہے کہ اگر انہیں زندگی میں کسی ایسے سانحہ کا سامنے کرنا پڑے تو پھر ہٹ دھرمی کی بجائے حقیقت پسندی کا ساتھ دوں گا۔ جب قاری میں ایسی سوچ پیدا ہوتی ہے تب رضیہ اسماعیل جیت جاتی ہیں چونکہ بحیثیت قلم کار اُن کا مدعا یہی ہے کہ معاشرے کی فرسودہ رسومات سے نجات اور روشن معاشرے کی بنیاد رکھی جائے۔

''مٹی کی آواز'' کا ایک اور افسانہ ''شک گزیدہ'' بھی بڑا خوبصورت انداز میں قلم بند کیا گیا۔ اس میں انسانی سوچ کو مثبت کی بجائے معکوسی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں جذبات نگاری اس کمال سے کی گئی کہ یہ افسانہ پڑھتے ہوئے میں اپنی نظروں سے نرمل سنگھ کے جلے ہوئے جسم سے اٹھنے والی بو محسوس کرنے لگا اور پھر نرمل کی بیوی ڈولی کے بہتے آنسو مجھے نظر آنا شروع ہوئے۔ یہ افسانہ بھی ہمارے سماجی رویوں کا عکاس ہے جس میں ساس اور بہو کے روایتی جھگڑے اور شک کی آگ میں جلتی ہوئی مردانہ سوچ کو بڑے منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

جس طرح پروین شاکر کی شاعری میں خوشبو کا عنصر نمایاں ہے بالکل اسی طرح رضیہ اسماعیل کے افسانوں میں مٹی کا عنصر موجود ہے۔

میری رائے میں اس مجموعہ میں سب سے خوبصورت اور پاورفل افسانہ ''ادھورا بندھن'' ہے۔ افسانہ کا آغاز تو ہماری روایتی سوچ جس میں لڑکوں کو لڑکیوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔۔۔لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے تو پھر باپ اور بیٹی کا لازوال پیار نمودار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کہانی میں ایک باپ اپنی بیٹی سے رج کر پیار کرتا ہے اور پھر اس

معاشرہ میں زندہ رہنے کے اُسے گر سکھاتا ہے۔معاشرے کے منہ پر طمانچہ مارنے کی خاطر وہ بیٹی کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارتا ہے جبکہ اسی معاشرے میں ایسے لوگ بھی کہانی میں اپنا چہرہ دکھاتے ہیں لیکن باپ اور بیٹی ہمت نہیں ہارتے۔ باپ بچپن سے ہی بیٹی کی ہمت بڑھاتا ہے۔آخر باپ معاشرتی رسومات سے تو نہ ہارا لیکن معاشی حالات نے اسے اس قدر مجبور کیا کہ باپ اپنی نوخیز کلی کو چھوڑ کر بہتر معاشی حالات کے لئے بیرون ملک چلا گیا۔ بیٹی باپ کے پیار میں تڑپ تڑپ کر جوان ہوتی ہے۔گریجویشن کے بعد ایک دن اچانک جب اس لڑکی کی باپ سے ملاقات ہوئی تو ہنستے مسکراتے باپ سے نہیں بلکہ تابوت میں لپٹے لاشے سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ دونوں کردار اس خوبصورتی سے افسانے میں پیش کیے گئے کہ قاری خود بھی جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ یہ اُسی جذبات کا اثر ہے کہ حساس دل قاری کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے ہیں۔قاری کہانی کے جب اس موڑ پر پہنچتا ہے تو اُس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔

یہی قلم کار کی معراج ہے۔

رضیہ اسماعیل کے کئی روپ

یعقوب نظامی
بریڈفورڈ

رضیہ اسماعیل کو میں ایک سوشل ورکر اور پھر حقوقِ نسواں کی جنگ لڑنے والی ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتا تھا۔جنھوں نے خواتین کے لئے ۱۹۹۷ء میں ''آگہی'' نامی ایک تنظیم قائم کی۔رضیہ اسماعیل نے قلیل وقت اور محدود وسائل کے باوجود برطانیہ بھر کی اہلِ قلم خواتین کو ایک گلدستہ میں کچھ اس طرح سجایا کہ ایک ''وومن ڈائریکٹری'' مرتب کرتے ہوئے خواتین کا مختصر تعارف، ادبی کاوشوں اور رابطے کے فون نمبر اور پتے اس میں شامل کر دیئے۔اس ڈائریکٹری نے برطانیہ بھر کی اُردو کی اہلِ قلم خواتین کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

رضیہ اسماعیل نے ڈائریکٹری کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے سکولوں میں زیرِ تعلیم طالبات کے لئے ورکشاپس کا بندوبست کیا۔ان ورکشاپس میں نامور شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا جو بچیوں کو شاعری کے اسرار ورموز سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں ادب تخلیق کرنے کے گُر سکھاتے رہے۔پھر جوان خواتین کے تخلیقی کام کو جمع کر کے اُسے کتابی شکل میں شائع کروایا۔رضیہ اسماعیل نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انھیں اپنانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ نئے دور کی اہم ضرورت کمپیوٹر اور ویب سائٹ ہے ۔ رضیہ اسماعیل نے www.aaghee.co.uk کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی تیار کروائی ہے جس میں چالیس خواتین کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔

دوسروں کے لئے کام کرنے والی رضیہ اسماعیل غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ شاعری اور نثر نگاری کا نہ صرف غم پالتی ہیں بلکہ اب تک ان کی چھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔شاعری کی کتابوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی ایک نثری کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' بھی شائع ہوئی ہے۔

اگر میں نے بچپن میں دادی اماں کی کہانیاں نہ سنی ہوتیں تو یقیناً کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔دادی اماں کی کہانیوں میں چڑیلوں کا اکثر ذکر ہوتا تھا جنھیں سن کر ذہن میں جو تصور پیدا ہوتا تھا اس کے مطابق چڑیلیں بدشکل عورتوں کا دوسرا روپ ہوتی ہیں جو ویرانوں میں رہتی ہیں اور موقع ملتے ہی خوب صورت مردوں کا جگر نکال کر مزے لے لے کر کھا جاتی ہیں۔بچپن کی یادوں کو ذہن میں لاتے ہوئے قریب تھا کہ میں رضیہ اسماعیل سے اس بات پر اختلاف کرتا کہ شاعروں کے تصوراتی چاند میں بھلا چڑیلیں کہاں؟ لیکن بھلا ہو امریکی سائنس دانوں کا، جنھوں نے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ چاند اتنا خوب صورت نہیں جتنا اُردو کے شعرا نے اُسے خوب صورت پیش کیا ہے، بلکہ چاند تو ویران اور سنسان ہے۔ یہ سوچتے ہوئے رضیہ اسماعیل کی کتاب کو اس نیت سے پڑھنا شروع کیا کہ چاند کے ویرانے میں چلو میں بھی چڑیلیں ڈھونڈوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ واقعی چڑیلیں زمین سے چاند پر منتقل ہو چکی ہیں۔لیکن جب کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو اُس میں چڑیلوں کی بجائے مجھے ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے مضامین پڑھنے کو ملے جنھیں میں مزے لے لے کر پڑھتا اور مسکراتا رہا، کیوں کہ مضامین میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔ میرے خیال میں رضیہ اسماعیل نے کتاب کے آغاز میں یہ بات لکھ کر کسرِ نفسی برتی ہے کہ ''مزاح نگاری کا مجھے دعویٰ نہیں اور طنز میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔'' لیکن اس انکار کے باوجود انھوں نے بڑی خوب صورتی سے کتاب میں طنز و مزاح دونوں پیدا کیے۔ رضیہ اسماعیل کتاب میں لکھتی ہیں کہ:

''اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی

لگتیں۔بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے، جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی آنکھ سے آگے نہ دیکھ سکتیں، مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ان سے کھا سکتیں۔''

رضیہ اسماعیل نے شاعری، نثر نگاری اور خواتین کی سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ اپنے گلشن، اپنے گھر کو بھی معطر کیا ہوا ہے۔اور گھر میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس کے آنگن میں بیٹھ کر انھیں ''چاند میں چڑیلیں'' بھی نظر آتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول بھی۔

میں تو اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اپنے لئے تو ہر کوئی کام کرتا ہے، دوسروں کے لئے کام کرنے والے لوگ عظیم ہوتے ہیں۔رضیہ اسماعیل بھی اپنی ذات کی بجائے دوسروں کے کام کرتی ہیں اور بلاشبہ ایک عظیم خاتون ہیں۔ برطانیہ میں جب بھی مؤرخ اُردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو رضیہ اسماعیل، جو اَب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہیں، کے کام سے چشم پوشی کی گئی تو وہ تاریخ ادھوری ہی رہے گی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل پاکستانی کہانی کار اور ''آدھی چادر''

حسن عسکری کاظمی

وطن سے دور دیارِ غیر میں رہنے والے قلمکاروں کی ادب سے دلچسپی اور اپنی سرزمین سے محبت کا قرض اتارنے کا خیال تخلیقی انداز اظہار کی صورت میں مختلف اصناف نظم ونثر سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے پر آمادہ رکھتا ہے، وہ دور رہ کر بھی ان مسائل کا ادراک رکھتے ہیں اور انہیں یہ کسک رہتی ہے اسی لیے وہ تارکین وطن ہونے کے باوجود اپنے حصے کی شمع جلا کر خود کو مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں، انہوں نے مختلف ملکوں میں آباد اپنی اولاد سے اکثر مکالمہ کرتے ہوئے اپنی ثقافت، رہن سہن، رسم و رواج اور طور طریقوں کو متعارف کرایا، قصے، کہانیاں اور حکایات بیان کیں۔ خصوصاً ادب سے شغف رکھنے اور ادبی سرگرمیوں میں اپنا کردار ادا کرنے اور اچھی تخلیقات پیش کرنے کے مواقع پیدا کئے، نئی نسل اپنی پہچان اور پرداخت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر کہانی میں اپنے جیسے گوشت پوست کے انسانوں کے مسائل سے باخبر ہونا چاہتی ہے، پاکستان اور بھارت میں کہانی کاروں نے جو کچھ لکھا خصوصاً افسانہ لکھتے ہوئے زندہ اور متحرک کرداروں کی نفسیات اور ان کے طرزِ عمل کو امکانی حد تک حقیقت کے قریب لاکر دکھانا آسان کام نہیں، اسی طرح وحدت تاثر اور خوش کن تحیر افسانے کی بنیادی خصوصیات کا لحاظ رکھنا بھی کار دشوار ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جہاں دوسرے افسانہ نگاروں نے کامیابی حاصل کی ہے اور بھرپور فنی صلاحیتوں سے خود کو منوایا ہے وہاں دیکھنا ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل افسانہ تخلیق کرنے اور معاشرتی قدروں کی ترجمانی کے

علاوہ قارئین کی توقعات پر پورا اترنے میں کہاں تک کامیاب وکامران ہونے کی امید رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی تخلیقی ثروت مندی مختلف جہات میں نمو پذیر ہو کر ان کی جہد مسلسل اور ترسیل فکر میں ان کی ریاضت من پر قارئین ادب اور ناقدین کا اتفاق ہے کہ وہ انسان دوستی اعلیٰ انسانی اقدار اور روشن مستقبل میں یقین رکھتی ہے۔ اس خاکدان ارضی کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنا کر مثالی معاشرہ تشکیل دینے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو کر رہے گا۔ وہ ایک طرف اعلیٰ پائے کی شاعرہ ہونے کے ناتے خوشبو، گلاب، کانٹے جیسی خوبصورت اور دیدہ زیب کلیات کا تحفہ لے کر ایوان شعر وسخن میں داخل ہوئیں اور دوسری طرف افسانوں کا مجموعہ آدھی چادر پیش کر کے اپنے وطن کی ثقافت کی نمائندہ بن کر ہمارے سامنے آگئیں اور یوں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بحیثیت افسانہ نگار اپنی پہچان کا یہ رخ دکھا کر ہمیں مبتلائے حیرت و انبساط کرنے میں کامیاب نظر آئیں۔

افسانہ لکھنے اور کہانی سنانے اور اب سے پہلے داستان گوئی کا فن اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، میرامن کی باغ و بہار یا قصہ چہار درویش اور رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب نے اس فن کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، داستان سے افسانے تک ایک دل آویز سلسلہ ہے کہ وقت گزرنے پر ناول، ناولٹ، افسانہ، طویل اور مختصر افسانہ اور پھر پوپ کہانی کا فن کتنے اہم موڑ پر آیا لیکن بنیادی طور پر کہانی سے ہماری دلچسپی دراصل زندگی کے ساتھ ہماری فطری وابستگی اور دل بستگی کا شاخسانہ ہے، ہم سب بچپن سے کہانی سنتے آرہے ہیں۔ نانی اماں کہانی سنا کر ہمارا جی بہلاتی چلی آرہی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے دوسرے افسانوں سے پہلے آدھی چادر کی طرف دیکھا تو وہاں بھی نانی اماں بٹوارے کی دردناک کہانی سنا کر دل دریا سمندروں ڈونگھے تے کون دلاں دیاں جانے ہووہ پنجاب کی سرزمین میں بہنے والے پانچ دریاؤں کے ساتھ چھٹا خون کا دریا بہنے کا المیہ اور تقسیم کی داستان، ہجرت کے قصے بیان کرتی ہیں۔ صحن میں بیٹھی نانی ماں بتا رہی

تھیں کہ جب ان کا ٹرک قیام پاکستان کے کئی مہینوں بعد ملٹری کی معیت میں واہگہ اٹاری بارڈر پر پہنچا تو فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ٹرک سے نیچے اتر آئیں۔

''میں پاکستان کی سرزمین کو ٹرک کے پہیوں تلے روندتے ہوئے نہیں بلکہ پیدل چل کر جانا چاہتی ہوں، نانی ماں نے ملٹری پولیس سے کہا تو وہ بھی نانی کے جذبے کے آگے خاموش ہو گئے، پھر نانی ماں جانے کتنی ہی دیر تک خاک آلود چہرے کے ساتھ حرم کی طرح پاک زمین پر سجدہ ریز رہیں۔''

رضیہ اسماعیل نے جو سنا سچ سنا اور جو صبح ہجرت کا سورج نانی ماں نے دیکھا اور جو صدمے اٹھائے انہیں بیان کرنے میں آدھی چادر کا استعارہ برتنے میں کمال مشاقی کا اظہار افسانے کی تخلیق کو بامعانی بنا دیتا ہے۔ انگریز کی شاطرانہ اور مسلم دشمن حکمت عملی نے جو گل کھلایا اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اسے اس افسانے میں امرتا پریتم کے دکھی دل سے نکلنے والے بول اور بھی دردناک بنا کر قاری کے دل میں پرانے زخموں کو ہرا کر دیتے ہیں۔

اَج آکھاں وارث شاہ نوں/ کدے قبراں وچوں بول/ اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین/ وے اج لکھاں دھیاں روندیاں/ اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب۔

انسان کے ظالم، جاہل اور جلد باز ہونے کی گواہی تو قرآن صدیوں پہلے ہی دے چکا ہے، اور یہ افسانہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ وحشت اور جبر میں ''ہماری حالت تو ہانکے ہوئے ہرن جیسی ہو رہی ہو گی جو شکاری کتوں کے نرغے میں آ چکا ہے۔''

اور یہ افسانہ فنی اور معنوی اعتبار سے اس مجموعے کا شاہکار افسانہ ہے کہ جسے آدھی چادر ملی اسی طرح آدھا پنجاب ہمارا مقدر ٹھہرا۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا افسانہ چیچہ وطنی پڑھتے ہوئے پنجاب کی روایات، گاؤں میں آباد لوگوں کا رہن سہن اور پنچایت کے فیصلے اور ان پر عمل درآمد کے طور طریقے ایک قاری کی جہاں معلومات میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں وہاں افسانہ پنجاب کے گھبرو جوانوں اور ریشمی

لاچا زیب بدن کرنے والی مٹیاروں اور فاطو جٹی جیسی وکھری ٹائپ اور رضیہ کے بقول اس دھرتی پر رہنے والوں سے بہت مختلف بہت الگ جس نے چودھری محمد خان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پابند سلاسل کرایا چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے مقابل آ چکے تھے، فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔

''اس افسانے کی بُنت میں کمال ہنرمندی سے کام لیا گیا ہے۔ رضیہ اسماعیل نے تجسس کا عنصر افسانے کے انجام سے پہلے تک برقرار رکھا اور آخر کھلا کہ اس کی پہلی خاندانی بیوی اس وقت آئی جب چوہدری محمد خان کے قتل کی خبر ملی، اس ماتمی جلوس میں سب سے آگے اونچی لمبی لش لش کرتی، مکھنوں کی پلی، سلفے کی لاٹ ورگی، رَج کے سوہنی جٹی، کالے کپڑے پہنے ہوئے بازو اٹھا اٹھا کر دہائیاں دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ یہ چوہدری کی خاندانی بیاہتا تھی جو صحیح معنوں میں چوہدری کا جوڑ تھی جیسے دو سورجوں کی جوڑی ہو۔''

افسانے میں مسرت افزا حیرت قاری کی دلچسپی میں ایسا اضافہ کرتی ہے کہ افسانہ ایک نشست میں تمام ہو جاتا ہے۔ چوہدری محمد خاں کو رانگڑ قبیلے نے اس وقت قتل کیا جب وہ اپنے ڈیرے پر رات بسر کرنے گیا اسے بتایا بھی گیا مگر اس نے دوست کی بات نہ مانی، کہتا ہے جو گولی مجھے لگے گی وہ ابھی تک بنی ہی نہیں۔

گاؤں میں ایسے کردار اور ایسے واقعات ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں، افسانہ نگار اس خام مواد سے کہانی تخلیق کرتا ہے تو اسے مقامی ثقافت کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ برمنگھم میں اپنے قیام کے دوران میں خواب و خیال ہوتے ہوئے ماضی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہے اور یوں وہ پنجاب کی سرزمین اور یہاں کے حالات کا تجزیہ کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں وہ لکھتی ہیں دن چڑھتے ہی۔۔۔ اس لرزہ خیز قتل کی خبر بڑی تیزی سے دور دور تک پھیل گئی۔۔۔ پھر وہی پولیس۔۔۔ آنیاں جانیاں۔۔۔ کاغذی کارروائیاں۔۔۔ تفتیش، جائے وقوعہ۔۔۔ گرفتاریاں۔۔۔ آلہ قتل۔۔۔ ایف آئی

آر۔۔۔ثبوت۔۔۔گواہ۔۔۔شہادتیں۔۔۔عدالتیں۔۔۔سب کچھ ہی موجود تھا سوائے
چوہدری کے۔۔۔ بالآخر پنچایت کا فیصلہ سنایا گیا کہ چوہدری کی میت اس کے اپنے گاؤں
میں دفن کی جائے۔۔۔ فاطو جٹی کو یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ اسے بھی کھینچ کھینچ کر پھانسی
گھاٹ کی طرف لے جارہے ہیں۔

''فاطو جٹی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں مگر کمال ضبط کے ساتھ اپنے چوہدری کو جاتے ہوئے
دیکھ رہی تھی۔۔۔ چیچہ وطنی اس کی منزل آخر تھی جہاں اسے دفن کیا جائے گا۔ رضیہ اسماعیل تو
ہر افسانے کے آغاز میں شعر لکھنا ضروری خیال کرتی ہیں، افسانے میں کہیں ضرورت محسوس
ہوئی تو وہاں بھی شعر سے کام لیا جیسے دیوار گریہ میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہ خواب
ایک چھناکے سے ٹوٹ چکا تھا، اندھیرے اور خوف کا عفریت اپنی باہیں کھولے کھڑا جیسے کہ
رہا تھا۔

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

یہ افسانہ ہما جیسے کردار کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں بدنصیب ہما ایک منگنی ٹوٹنے
کے بعد دل برداشتہ ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئی کہ نام تو اماں بابا نے میرا ہما رکھا تھا خوش بختی کا
پرندہ۔۔۔ کہتے ہیں جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ راج کرتا ہے مگر لگتا تھا کہ یہ پرندہ میرے
سر پر بیٹھنے کی بجائے میرے اگر دگرد چکر لگا کر بس دائیں بائیں سے ہوتا ہوا ہی کھسک گیا تھا
اور جاتے جاتے اپنے طاقتور پروں سے میری تقدیر کا چراغ بھی گل کر گیا تھا۔

رضیہ اسماعیل نے جہاں ادب پروری کا بیڑا اٹھایا وہاں سماجی کاموں خصوصاً خواتین
کے مسائل حل کرنے اور دکھ بانٹنے کے ساتھ ان کے حقوق بحال کرنے کی خاطر آواز
اٹھائی۔ ان کی تحریروں میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف ان کا لب ولہجہ
خاصا تلخ ہو گیا اسی طرح افسانوں میں عورت کی زندگی میں جو مصائب و آلام آئے انہیں
کہانی کا موضوع بنا کر پیش کیا مگر یہ حرماں نصیبی اور استحصال اور عورت میں خود ترحمی کے

باعث شدت اختیار کرتا گیا اس لئے عورت کی تعلیم اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے حقوق کی
بازیافت کا عملی آغاز کرنا ہے۔

رضیہ نے طنزیہ انداز اظہار اختیار کر کے ''دیوار گریہ'' میں ہما کی زبان میں اپنا موقف
پیش کیا ہے کہ ''ہمارے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت سرے سے غلط کی جاتی ہے۔ لڑکوں
کو تو ہم ریس کورس کا گھوڑا بنا کر کھلی چھٹی دے دیتے ہیں جب کہ لڑکیوں کی شخصیت کو مضبوط
کرنے اور انہیں با اعتماد بنانے کی بجائے ہم بے جا روک ٹوک سے نہ صرف ان کی عزت
نفس مجروح کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بے یقینی اور بے اعتمادی کی سلاخیں گاڑ دیتے
ہیں جس سے حساس طبیعت اور کومل جذبوں والی لڑکیاں مزید کمزور ہو کر احساس کمتری کا
شکار ہو جاتی ہیں، یہ وہ مکالمہ ہے جو ہما اپنی ماں کے ساتھ کرتی ہیں لیکن اس کا انجام وہی ہوا
جو اکثر ہوا کرتا ہے پرایا دیس۔۔۔ نہ تہذیب و معاشرت اور زبان سے واقفیت۔۔۔ نہ کوئی
عزیز نہ رشتے دار۔۔۔ نہ سکھیاں نہ سہیلیاں۔

ہمارے ملک میں جاگیردارانہ ماحول اور گاؤں میں طبقاتی تقسیم ایسے مسائل ہیں کہ ہم
اکیسویں صدی میں بھی اس روایتی اور فرسودہ نظام سے چھٹکارہ نہ پاسکے۔

''مکئی کا دانہ'' رضیہ اسماعیل کا افسانہ اور اس کا آغاز ایک لوک گیت یا بچوں کے کھیل
میں اس بولی سے ہوا کہ لک چھپ جانا، مکئی دا دانہ راجے دی بیٹی آئی جے لک چھپ جانا اور
یہی مکئی کا دانہ نمبردار ملک عزیز کے اکلوتے وارث ننھے شیر خوار ملک سلطان کے حلق میں جا
پھنسا، نمبردار نے ہمیشہ اپنے گاؤں میں ڈسپنسری کھولنے کی مخالفت کی اور طفیل جولاہے کے
بیٹے ڈاکٹر عباس کو نظر حقارت سے دیکھا جس کی یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کا
علاج معالجہ کرے، آج نمبردار حواس باختہ اور پریشان کبھی کمپاؤنڈر کو بلانے کا جتن کرتا اور
کبھی ڈاکٹر عباس کو یاد کرتا، مگر سب نے آنے اور اس کے بیٹے کو بچانے میں دیر کر دی، ڈاکٹر
عباس آیا اس نے بچے کی کمر کو تھپتھپایا اس کے منہ سے اچھل کر مکئی کا دانہ باہر نکلا لیکن ڈیڑھ
سال کا گول مٹول بچہ جس کے گلے میں یہ دانہ پھنس گیا تھا اب دم گھٹنے سے فوت ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ افسانہ ایسے ماحول کی نشاندہی کرتا ہے جہاں وڈیرہ شاہی، جہالت اور طبقات میں منقسم معاشرہ بہت سے مسائل میں گھرا ہوا ہے، ہماری زمین کا مقدر کب بدلے گا، یہی وہ سوال ہے جو اس افسانے کی تخلیق کا سبب کہلا سکتا ہے۔

''آدھی چادر'' میں شامل کہانی ہرنام داس ایک نفسیاتی الجھن کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہ نام ذہن میں کھلبلی پیدا کرتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر سامنے آتا ہے اب اسے نقل مکانی یا جبر مشیت اور ہجرت کے حوالے سے اور بھی اہمیت حاصل ہوگئی کہ اگر ہجرت ابا، امی اور ہرنام داس کے مقدر میں لوح ازل پر لکھی جا چکی تھی تو پھر کیا اس قدر کشت وخون ضروری تھا۔ یہی سوچ افسانہ نگار کو ماضی کے جھروکوں میں خون آشام منظروں اور تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت، جس نے آبادی کو مذہب کے نام پر گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔

''آدھی چادر'' میں روشنی کا تعاقب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا افسانہ دوسرے تمام افسانوں سے مختلف اور تجریدیت سے مملو ایک کردار کے نہاں خانۂ دل میں اٹھنے والے سوالوں کی نوعیت اور جواب تلاش کرنے کا روحانی تجربہ ہے جس میں کھڑکی کھلنے کا استعارہ انکشاف ذات کے لئے برتا گیا ہے۔ معاشرے میں اچھے برے لوگ اور ان کے صبح وشام زندگی اور مصروفیات کو دیکھ کر بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فہم وادراک کی کونسی منزل ہے، خود کلامی کا یہ انداز اور سوال کا جواب کہ جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ وقت کی تختی پر اس کی اہمیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

ڈاکٹر رضیہ نے عوامی زندگی کے مرقعے کھینچتے ہوئے اپنے مشاہدے کی آنکھ کھلی رکھی ہے۔'' ماسٹر پرلے درجے کا کنجوس آدمی تھا۔ سکول جاتے ہوئے باورچی خانے کو تالہ لگا کر جاتا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر کی کمائی سے ماسٹرنی اپنے غریب رشتے داروں کو کھلاتی پلاتی رہتی ہے۔ اس پر بس نہیں۔ ماسٹر گھر کے دروازے پر بھی بڑا سا تالہ لگا دیتا تھا۔ محلے میں زیریں، متوسط یا سطح افلاس سے نیچے زندگی کی تہمت سر لئے کردار رضیہ اسماعیل کے

افسانوں میں در آئے ہیں۔ افسانے میں کھڑکیاں بے جان سہی لیکن وہ سرگوشیاں بھی کرتی ہیں۔'' ماسٹرنی غریب گھر کی ضرور ہے مگر شریف عورت ہے کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات میں نہ جانے کیا گزرتی مگر ماسٹر کی ڈگڈگی ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ اسی طبقے میں چودھری فضل دین کی اکلوتی بیٹی ریشم پر افسانہ نگار کی نگاہیں مرکوز ہوگئیں۔ بس اپنی دنیا میں مگن گواچی گواچی افسانہ اسی کردار کی نفسی کیفیت کا حصار کرتا ہے؟ وہ سوال کرتی ہے بابا کیا روشنی ہمارے اندر موجود ہے'' ''ہاں پتر یہ روشنی ازل سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ دل تو سوہنے رب کا گھر ہے اسی کے نور سے روشن ہے بدقسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ سائیں بابا نے اتنا کہا۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرے مرشد من وچ لائی ہو
اندر بوٹی مشک مچائی جاں پھلن تے آئی ہو

اللہ ہو کی دھمک جیسے ہی ریشم کے دل پر پڑی تو اسے یوں لگا جیسے اس کی روح کی بند کھڑکی کھل گئی ہو، سب اندھیرے چھٹ گئے ہوں۔

''آدھی چادر'' کی مصنفہ کے بارے میں ڈاکٹر شہناز مزمل نے پتے کی بات کہی کہ آج رضیہ پابجولاں آدھی چادر اوڑھے اور چادر کے آدھی ہونے کا دکھ مناتے ہوئے ایک طویل سفر طے کرکے یہاں تک پہنچی ہیں، جدید وقدیم روایات اور اسلوب کی ہم آہنگی نے اس کی تحریروں کو منفرد رنگ عطا کیا ہے اس لئے وہ اپنے ہم عصر کہانی کاروں میں ممتاز نظر آتی ہیں۔''

مغرب میں رہتے ہوئے مشرقی خصوصاً پاکستانی معاشرے کی زندگی اور یہاں کے مظلوم لوگوں کے مسائل کو نظر میں رکھتے ہوئے کہانی کا خام مواد یکجا کرنا اور زمینی حقائق پر مبنی افسانے تخلیق کرنا جذب وشوق کے بغیر ممکن نہیں، آج افسانہ امکانات سے بھرپور ہے اور سچائی کی ضمانت فراہم کرتا ہے افسانے میں کردار ہمیں سانس لیتے، پہلو بدلتے اور ہماری طرح مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں، یہی وہ خصوصیات ہیں جو رضیہ اسماعیل کے افسانوی

کرداروں میں پائی جاتی ہے، دوسرے ان کے مکالمے گرد وپیش میں بولی جانی والی زبان کا
عکس جمیل ہیں۔ وہ بھارت کی کہانیوں سے الگ اپنی منفرد پہچان رکھنے کے سبب خالص
پاکستانی تہذیب، ثقافت، اور زبان و بیان کے حوالے سے ہماری روزمرہ زندگی سے قریب
تر ہیں، ہم افسانہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے ورق پر لکھی
عبارت کے قاری ہیں اور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ایک ایسی کہانی کار ہیں جو ہمارے روز وشب
کی تصویریں بنا کر انہیں ہمارے حجرۂ جان میں سجانے آئی ہیں۔

رضیہ اسماعیل۔۔۔غزل کے آئینے میں

حسن عسکری کاظمی

لاہور

شعروادب تذکیروتانیث یا کسی دوسرے خانوں میں تقسیم کئے جانے کی غیر فطری
مواج کا متحمل نہیں، تخلیق ماورائی قوت کا استعارہ ہے، تخلیق کار صرف اور صرف آدم زاد
ہونے کے ناتے اپنی شناخت رکھتا ہے اور سچائی کے اظہار کا قرینہ حرف وصوت یا رنگ و
سنگ میں نمو پذیر ہوتا ہے، کچھ کم نظر حرمت قلم کے معیار کو خودساختہ میزان میں رکھ کر دیکھتے
ہیں لیکن حرف حق کسی ایسی میزان کی معنویت کو خاطر میں نہیں لاتا خصوصاً تذکیروثانیت کا
حوالہ بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے مگر اس کے باوجود صدیوں سے یہ امتیاز روا رکھا جانا خود انسانی
معاشرے کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے جسے بے معنویت اور نارسائی agah کا نشان
امتیاز کہنا بجا ہے۔ تخلیق کی ثروت مندی میں بجائے خود کسی معاشرے کے معیار فکر ونظر کا
آئینہ اور تخلیق کار کا چہرہ اور اس کے خدوخال قاری کی طمانیت اور تجسس میں جمال آگہی کا
سبب بن کر یہ آئینہ اور بھی شکاف دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے عہد بے تعبیر میں یہ آئینہ ویسا
نہیں جیسا ہمیں دیکھنے کی خواہش رہی مگر اس کے باوصف صحن چمن میں جہاں خوشبو، گلاب،
کانئے عالم بے حرف وصوت سے اپنی صورت گری کے لئے راضی بہ رضا ہو جائیں تو خوشبو
کا بدن گلاب چہرے اور دل میں خلش پیدا کرنے والے کانٹے صفحہ قرطاس کی زینت بنتے
ہیں تو خوش کن تحیر ہمارا مقدر بن جاتا ہے۔

اس تمہید کا مقصد پانچ شعری مجموعوں پر مبنی کلیات کے اوراق کی ہوا میں سانس لینا اور

ایجاز واختصار کے ساتھ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ریاضت فن کے حوالے سے گفتگو کرنا پیش نظر ہے، انہوں نے خصوصی انتساب میں خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے لکھا ''میرے تمام قلمکار دوستوں کے نام جن کے خلوص اور حوصلہ افزائی نے میرے قلم کو توانائی اور تخیل کو پرواز کے لئے نئے اُفق عطا کئے'' رضیہ اسماعیل دیارِ غیر میں رہ کر اپنوں کو نہیں بھولیں مگر اس سے بڑھ کر اپنے عقیدے پر قائم رہنا اور آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت کا اظہار کرنا اپنا اولین فرض جانا ہے۔

آقا تیری کنیز ہو جاؤں
تری گلیوں میں آئے کھو جاؤں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اعلیٰ ذوق رکھنے اور زمانے کے نرم وگرم تجربوں سے گزرنے میں کامیاب وکامران رہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب وفراز اور بے مہریٔ زمانہ کا ذکر پایا جاتا ہے، انہیں یہ دکھ ہے کہ عورتوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ پس وپیش سے کام لیا گیا، انہوں نے ''حرف آگہی'' کے ذیل میں دفتر شکایت ضرور کھولا مگر باوقار طرز احساس کا دامن تھام کر بات کی۔ اس سلسلے میں ان کے دل کا بوجھ اتارنے میں بشریٰ رحمٰن نے اہم کردار ادا کیا ان کا ایک جملہ کارگر ثابت ہوا کہ ''رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں اداسی یوں چھائی رہتی ہے جیسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں؟''

ہر تخلیق کار اپنی ذہنی تربیت، ماحول اور ذاتی احوال کے حوالے سے اپنی سخن وری کو متعارف کرنا چاہتا ہے، شعری صداقت کا معیار عمومی رویوں سے مختلف ہوتا ہے، زمینی حقائق پر نظر رکھتے ہوئے شاعر اپنے قاری تک رسائی کی خاطر زبان وبیان، جذب صادق اور منفرد انداز اظہار کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے رضیہ اسماعیل کی غزل میں نسائی جذبے کی رونمائی اور پاکیزہ خیال کے در پر دستک دینے کا سلیقہ قاری کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ یہی اندازہ اظہار ان کی ترسیل فکر کی پہچان ہے کہ وہ ہر لمحہ خود کو بیدار رکھتی ہیں اور تخلیقی عمل

سے زندگی میں نئے رنگ بھرنے کی ترغیب دلاتی ہیں

بہتر ہے کہ تم وقت کی رفتار کو دیکھو
گر چاک گریباں ہو تو دستار کو دیکھو
شوریدہ سمندر ہے غضب ناک ہوائیں
طوفان بلاخیز ہے پتوار کو دیکھو

ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی اور تنوع نیز اسلوب کی مختلف جہتیں اور زبان و بیان کے نت نئے آہنگ ان کی شخصیت میں دلکشی، گفتگو میں متانت اور الفاظ کا فنکارانہ استعمال انہیں دوسری شاعرات سے الگ اور منفرد مقام کا سزاوار قرار دیتا ہے، ان کی نفسی کیفیت کا ہر رخ قاری کی توجہات میں شامل ہو کر غزل کے ہر شعر کی معنوی سطح کو بلند کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اپنے تخلیقی جوہر سے کام لینا جانتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بلند حوصلگی اور عزت نفس بحال رکھنے کا خیال ہر دم تازہ رہتا ہے، وہ صاحب علم، کشادہ نظر اور زیرک خاتون ہیں، ان کی غزل میں کلاسیکی رنگ وآہنگ غالب ہے لیکن شعری اقدار میں بدلتی اور کروٹیں لیتی صورت احوال سے وہ باخبر ہیں اس لئے غزل میں ان کا لہجہ مانوس اور دل میں کھبنے والا ہے

ابھی تو حرف کو تحریر کی پہچان ہونا ہے
ابھی تو آدمی کو لفظ کا عرفان ہونا ہے
کمندیں ڈال کر تم مہر ومہ پر بھول بیٹھے ہو
ابھی تو آدمی کو بھی یہاں انسان ہونا ہے

ایک پختہ کار، ہنرمند اور تخلیقی فراست سے بہرہ ور، سخن ور اپنے کمال فن کا مظاہرہ اسی صورت میں کرتا ہے کہ مختلف بحور میں غزل جیسے آبگینے کو اپنے قاری کی خدمت میں اس کو پارکھ سمجھتے ہوئے پیش کرتا ہے تو سہل ممتنع جیسی مشکل ہیئت اور اعلیٰ وارفع خیال کی ترسیل کو حرز جان بنانا چاہتا ہے، رضیہ اسماعیل شعر کی کرافٹ اور اظہار پر مکمل عبور رکھتی ہیں، انہیں

غزل کا آبگینہ عزیز ہے کہ جس کی نزاکت صنفِ لطیف سے مشابہ ہے کہ

زفرق تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم!
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں انجاست

ان کی غزل میں بیتتے سموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، کہیں بدلتی رتوں کے لہجے کانوں میں رس گھولتے ہیں، اور کہیں وحشتوں کے موسم میں خوابناک فضا ہمارے اعصاب پر مسلط ہوجاتی ہے، چھوٹی بحر میں بڑی باتیں قاری کے نہاں خانۂ دل میں رضیہ اسماعیل کا ہیولا بنا کر پیش کرتی ہے۔

خواب آنکھوں میں کچھ پرانے دو
مجھ کو گذرے ہوئے زمانے دو

*****

یاد آئی تری جدائی کی
آج اشکوں نے بے وفائی کی

*****

میرے لہجے میں جرأتوں کی کھنک
میرے پرکھوں کی اک نشانی ہے

*****

کوئل کی آواز میں پنہاں
درد کا ایک انوکھا گیت

*****

پھر خزاں کے اداس رنگوں کو
تجھ سے مل کر بہار کرنا ہے

*****

زندگی بسر کرنے اور برتنے کے لیے ملی ہے لیکن ورق زندگی پر دستخط نہ کیے جائیں تو اپنے وجود کی شناخت ممکن نہیں، ہمارا زندگی میں داخل ہونا، اور نہ ہونا برابر ہے، ہماری تخلیق ہی ہماری پہچان ہے، رضیہ اسماعیل کا یہ کہنا درست ہے کہ لکھو، لکھواتا/ یہ زندگی تحریریں بن جائے/ کسی کاغذ کے ٹکڑے پر/ کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے/ وہ باغیانہ ذہن نہیں کرتیں لیکن خواتین کے مسائل کا حل ڈھونڈنے پر آمادہ وتیار رہنا اپنا فرض سمجھتی ہیں، ان کی شاعری میں سچائی، سادگی اور شعری صداقت نے جو رنگ بکھیرے اور پاکیزہ جذبوں کے اظہار نے جو آگہی بخشی اسے دل و جان سے قبول کیا گیا۔ وہ کوئی فلسفی یا مفکر نہیں بلکہ ایک تخلیق کار ہونے کے ناتے فطری جذبوں کی تطہیر کرنا چاہتی ہیں، وہ غزل، نظم، ماہیے اور دوہے تخلیق کرتے ہوئے یہ خیال رکھتی ہیں کہ ترسیلِ فکر میں اندازِ اظہار قاری کے دل میں سوئے جذبوں کو بیدار کرسکے۔ وہ غزل میں ایمائیت، ریزہ خیالی اور تازہ کاری کا لحاظ رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اعلیٰ اور ارفع مقصد یہی ہے کہ شاعری تہذیبِ نفس کا اہتمام کرتی ہے۔

بے رحم ہواؤں کی نظر دیکھتے رہنا
کشتی کو ڈبو دیں نہ بھنور دیکھتے رہنا

*****

رستے ہیں کٹھن ضبط کا یارا بھی نہیں ہے
کیا ہوتا ہے انجام سفر دیکھتے رہنا

*****

تمہارے ہاتھ میں سورج بھی ہے چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں

*****

ہمارے ساتھ یہ لفظوں کا کھیل مت کھیلو
ہمیں یہ علم ہے ماہر ہو تم ہرانے میں

*****

محترمہ فرخ زہرا گیلانی کی نگاہ میں رضیہ حرمت قلم کی امین ہیں، خواتین کی آزادی فکر وعمل کو جاوداں بنانے، ظلم واستبداد اور حق وانصاف کے درمیان تقابل اور تضادات کے ذریعے انہوں نے سنجیدہ معاشرتی حقائق کی گرہ کشائی کی ہے۔'' یہ حقیقت ہے کہ وزیرآباد سے برمنگھم تک ایک داستان کی صورت رضیہ اسماعیل کی زندگی کا سفر بہت سے ابواب پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اس تخلیقی طرزِ عمل میں ایک فعال اور مختلف الجہات شاہکار اور دیدۂ بیدار کے حوالے سے پہچان گئیں، اس عرصۂ حیات میں پاؤں پاؤں چلتی، صحرانوردی کرتی، کڑوے کسیلے پانیوں کو اسم اعظم پڑھتے زمزم میں بدلتی ادب کے نخلستان میں جا پہنچی۔

میں خارخار الجھتی رہی تمہارے لیے
میں پھول پھول مہکتی رہی تمہارے لیے

*****

وصال رت میں گلابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے
میں چہرہ چہرہ دمکتی رہی تمہارے لیے

*****

پاؤں سے جگنو باندھ کے نکلی سفر پہ جب
رستے سبھی چراغ تھے، رہبر چلا گیا

*****

اگر ہمارے عہدِ ناصبور میں تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینے والے فنکاروں، شاعروں، مصوروں، کہانی کاروں اور نثر نگاروں کی قدرومنزلت سے بیگانہ حکمرانوں اور شہریاروں کے حاشیہ نشینوں کی حمیت بیدار ہوجائے تو پاکستان اپنی تہذیبی، ثقافتی اور علمی و ادبی

سرگرمیوں میں ایسا کردار ادا کرسکتا ہے کہ بایدوشاید لیکن کتاب پڑھنے بلکہ خرید کر پڑھنے کا رجحان ناپید ہوچکا ہے، ہمارا ملک ایک ایسا باورچی خانہ ہے جہاں کھانے پینے کے لیے ہر نعمت مہیا ہے لیکن روحانی غذا سے محروم یہ سرزمین کسی ایسے سخن ور کے انتظار میں ہے جو شاعر مشرق کی طرح، یہ کہتا نظر آئے کہ

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

*****

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

*****

یہ بات وہاں ہوتی ہے جہاں خوشبو، گلاب کانٹے کی تخلیق کار کمال سوز وگداز کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر خونِ جگر کا معجزہ دکھائے۔

ہمارے عہد کے انسان تو خوابوں میں رہتے ہیں
انہیں بیدار کرنا ہے کسی کہرام سے پہلے

*****

یہ آئینوں کے مقدر میں کیسی رات آئی
کہ اب تو عکس بھی ان میں نظر نہیں آتا

*****

عورت ہوں مرا نام ہواؤں پہ لکھا ہے
بارش ہوں مرا نام گھٹاؤں میں لکھا ہے

پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں

حیدر قریشی

مدیر جدید ادب، جرمنی

گزشتہ کچھ عرصہ سے پوپ کہانی کا نام سننے میں آرہا تھا۔ادھراُدھرادبی رسائل میں عام طور پر افسانچہ طرز کی کہانیاں چٹکلے کے انداز میں دکھائی دے رہی تھیں۔جوگندر پال کے افسانچے پڑھنے کے بعد کسی چٹکلا نما چیز کی طرف دھیان دینے کا موڈ ہی نہ بنا۔لیکن حال ہی میں مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ ایک طویل وقفہ کے بعد رابطہ ہوا تو انہوں نے پوپ کہانی کی جانب توجہ دلائی۔نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اپنی کتاب ''پوپ کہانیاں'' بھی عنایت کردی۔عجیب اتفاق ہے کہ عین انہیں دنوں میں جب ہماری مراسلت جاری تھی مجھے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی حال ہی میں شائع ہوئی شعری کلیات ''خوشبو،گلاب،کانٹے'' کا تحفہ ملا۔اس میں رضیہ اسماعیل کی کتابوں کی لسٹ دیکھ رہا تھا تو سال 2012ء میں ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے''(پوپ کہانیاں)،کا نام دیکھ کر چونک گیا۔ان سے رابطہ کیا کہ مجھے یہ کتاب درکار ہے۔پھر ان کے ساتھ اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی۔مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جو سوالات میرے لیے الجھن کا باعث بنے ہوئے ہیں،وہ کہیں زیادہ رضیہ اسماعیل کے لیے بھی الجھن کا باعث بنے ہیں۔اورانہوں نے ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے پوپ کہانی کے مرکز امریکہ کے انگریزی پوپ کہانی نگاروں سے بھی رابطے کیے تاکہ اگر یہ کوئی نئی صنف ہے تو اس کے خدوخال دوسروں سے الگ دیکھے جاسکیں۔ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بتایا کہ ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' پبلشر کے پاس ہے اور پروف

ریڈنگ کی وجہ سے اشاعت میں دوتین ماہ کی تاخیر ہورہی ہے۔میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس کتاب کی ان پیج فائل عنایت کردی۔یوں مجھے پوپ کہانی کے مسئلہ کو برطانیہ کے دو تخلیق کاروں کے کام کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کا تھوڑا سا موقع مل گیا۔

مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ میری جو مراسلت ہوئی،اس میں میری طرف سے ایک دو بنیادی سوال اٹھائے گئے تھے۔مراسلت کے نتیجہ میں بھی اور کتاب ''پوپ کہانیاں'' کو پڑھنے کے بعد بھی مجھے نہ صرف ان سوالات کے جواب کی ابھی تک تلاش ہے بلکہ ان کے ساتھ مزید چند سوالات بھی پیدا ہوگئے ہیں۔

1-پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟

2-جس طرح افسانچہ،افسانہ،ناولٹ اور ناول کی پہچان بالکل سامنے کی بات اور قابلِ فہم ہے،اسی طرح پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانہ سے کس طرح الگ پہچانا جاسکتا ہے؟کسی مابہ الامتیاز اور کسی تخصیص کے بغیر پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانے سے الگ کرکے کیونکر دیکھا جاسکتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ کی پوپ کہانیوں میں بعض افسانچوں کی طرح ہیں،بعض نثری نظم کے انداز میں،بعض میں خلیل جبران جیسا رنگ درآیا ہے تو بعض ڈرامہ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔اس ہیئتی منظرنامہ سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔

چونکہ پوپ کا لفظ پاپولر میوزک والے پوپ سے لیا گیا ہے۔اس پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے تو ایک اور نکتہ اٹھادیا ہے کہ اگر یہ تعلق کسی موسیقیت کی بنیاد پر ہے تو پھر اردو میں پوپ کہانی کو کلاسیکی موسیقی کے ساتھ بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ان کے بقول:''اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کردیا جائے یا اس سے منسلک کردیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت،تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں،اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہوسکے''۔

لیکن اگر یہ لفظ محض پاپولر کہلانے کی خواہش کا اظہار ہے تو بات بنتی دکھائی نہیں

دیتی۔کیونکہ پریم چند سے لے کر منٹو تک ہمارے ابتدائی اور اہم لکھنے والوں کی کہانیاں تو اردو میں مقبولیت کے سات آسمان چھو چکی ہیں۔اور آج بھی کہانی پڑھنے والوں میں مقبول ہیں۔ان سے زیادہ پاپولر کہانیاں کس نے لکھی ہیں!

پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کو واضح کیے بغیر اور افسانہ وافسانچہ سے اسے الگ دکھائے بغیر اس کی شناخت کا مسئلہ پہلے قدم پر ہی رکا رہے گا۔جہاں تک دوسرے بیان کردہ اوصاف کا تعلق ہے۔مثلاً مقصود الٰہی شیخ کے بقول:''پوپ کہانی،افسانہ،افسانچہ یا پارۂ لطیف سے یکسر جدا ہے۔کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلمبند کرنے کا نام ہے۔جب قلم سے جڑا احساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم لفظوں میں سپردِ قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے''۔۔۔

ان اوصاف کی تو تخلیقی ادب کی تمام اصناف میں ایک جیسی اہمیت اور حیثیت ہے۔ اچانک آمد پر کچھ لکھنا یا کسی واردات کو تحریک ملنے پر لکھ دینا صرف فکشن میں نہیں دوسری تمام تخلیقی اصناف میں بھی ہوتا رہتا ہے۔مقصود الٰہی شیخ نے ''عام فہم لفظوں'' میں لکھنے کا ذکر بھی کیا ہے۔انہوں نے خود زندگی بھر جو لکھا ہے وہ سارا عام فہم ہی ہے۔سو یہ ساری لفظیات ادب کی جملہ اصناف پر عمومی طور پر لاگو کی جا سکتی ہے۔مجھے احساس ہے کہ مقصود الٰہی شیخ بعض مخالفین کی مخالفت کے باعث اس موضوع پر لکھتے ہوئے تھوڑا سا غصہ میں آجاتے ہیں۔تاہم میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایک مضمون ایسا ضرور لکھیں گے جس میں اپنے مخالفین کو یکسر نظر انداز کر کے ان لوگوں کے لیے پوپ کہانی کے خدوخال کو بیان کریں گے جو نیک نیتی کے ساتھ پوپ کہانی کو سمجھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ پوپ کہانی،افسانہ اور افسانچہ سے کیونکر مختلف اور الگ ہے۔اور اس کی کون سی خصوصیات ہیں جو ادب کی دوسری اصناف سے مختلف ہیں۔یہ اعتراض نہیں،سوالات ہیں اور ان کا مقصد پوپ کہانی کی شناخت کو واضح طور پر سمجھنا ہے۔کیونکہ عام فہم لفظوں میں لکھی جانے والی صنف کی شناخت

بھی عام فہم/قابلِ فہم ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ کے لکھنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا نتیجہ تو ان کے پانچ شعری مجموعوں کی کلیات کی صورت میں سامنے آچکا،جس کا ذکر شروع میں کر چکا ہوں۔نثر میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' سال 2000ء میں چھپ گیا تھا۔ان کے لکھے ہوئے متفرق تاثراتی مضامین ادھر اُدھر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔اور اب پوپ کہانی کی جستجو میں انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے'' تیار کر لیا ہے۔اپنے تحریر کردہ پیش لفظ ''پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک'' میں انہوں نے پوپ کہانی کے مسئلہ پر کسی جذباتیت کے بغیر اس کے خدوخال کو سمجھنے کی کاوش کی ہے۔امریکہ میں پوپ کہانی کو کیسے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے؟اس کا بیان بھی اس پیش لفظ میں مل جاتا ہے۔''پوپ کہانی کیوں؟''اور''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے ذیلی عناوین کے تحت انہوں نے مغربی تناظر میں پوپ کہانی کا مسئلہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔پوپ کہانی کیوں؟ میں تو جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے افسانے کی بے بضاعتی کا ذکر ہے۔لوگ ناول پڑھ لیتے ہیں لیکن افسانہ کی طرف دھیان نہیں دیتے۔(میڈیائی یلغار ہی صرف مسئلہ ہے تو پھر ناول کیوں پڑھا جا رہا ہے؟)،شاعری تو بہت پہلے سے نظر انداز کی جا چکی ہے،وغیرہ۔جدید تر میڈیائی یلغار بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔اس کے سامنے صرف افسانہ نہیں،پورا ادب ہی نظر انداز ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔اس چیلنج سے عہدہ براء ہونے کے لیے''پوپ کہانی'' نام رکھ لینے سے لوگ اس طرف راغب نہیں ہوں گے۔اس کے لیے ادب کی مجموعی اور عالمی صورت حال کے پس منظر میں ہی سب کو اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔یہ موضوع بجائے خود ایک الگ مکالمہ اور الگ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے عام کہانی کا نام پوپ کہانی رکھ دینا مناسب نہیں۔رضیہ اسماعیل نے مشرقی موسیقی کے سامنے پوپ کہانی کو ''لولی پوپ'' قرار دیا ہے۔میرا خیال ہے کہ جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے پوپ کہانی کو

پیش کرنا بھی ''لولی پاپ'' دینے کے مترادف ہے۔

''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے تحت مغربی دنیا کے پوپ کہانی والے اسے جن اوصاف کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ سب عمومی اوصاف ہیں، جنہیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی جملہ اصناف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ ادب کو درپیش نئے چیلنجز کے سامنے بعض لکھنے والے سراسیمگی کی کیفیت میں ہیں۔ ایک پاپ اسٹار کی مقبولیت کے سامنے اپنی انتہائی عدم مقبولیت سے دل برداشتہ ہو کر بعض ادیبوں نے جیسے پوپ کہانی کی راہ اپنا لی ہے۔ صرف کہانی کیوں؟ آپ ادب کی ساری اصناف کو بھی پوپ کے سابقہ کے ساتھ جوڑ لیجیے۔ لیکن اس سے مقبولیت تو ملنے سے رہی۔ ادب کے دیار میں قبولیت اور مقبولیت دونوں کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ کسی ادیب کو اچھا لکھنے کی توفیق مل جانا، قبولیت کے زمرہ میں آتا ہے اور ایک اچھے ادیب کے لیے توفیق مل جانا ہی بڑی بات ہے۔ مقبولیت ایک دوسرا موضوع ہے۔ سرِ دست اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ قناعت پسند ادیب قبولیت پر ہی خوش رہتے ہیں۔ آگے جو ملے، نہ ملے، توفیق دینے والے کی مرضی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے امریکہ کے پوپ کہانی لکھنے والے ایک مصنف کنگ وینکلس سے رابطہ کیا اور ان کی دو منتخب پوپ کہانیوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ''مشین'' اور ''سرخ دروازہ'' کے نام سے ترجمہ کی گئی ان دونوں کہانیوں کا ترجمہ اسماعیل اعظم نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ ان دونوں کہانیوں کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ دونوں کہانیاں نیم علامتی پیرائے میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور وہ جو پوپ کہانی کا مطالبہ تھا کہ کہانی عام فہم لفظوں میں ہو، وہ یہاں پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ کہانی ''مشین'' سے مجھے ایسا لگا کہ کنگ وینکلس نئے لکھنے والے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہے لیکن ابھی تک ادب کی بڑی سطح پر ان کا اعتراف نہیں کیا گیا، یا مناسب پذیرائی نہیں کی گئی۔ چنانچہ وہ بڑے لکھنے والوں اور اہم نقادوں کو کہانی میں تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''سُرخ دروازہ'' مختلف رنگوں کی علامات کے سہارے کہانی کو دلچسپ اختتام تک پہنچاتا

ہے۔ دونوں کہانیوں سے ایسا تاثر بھی ملتا ہے کہ امریکہ میں آزادیٔ اظہار کے باوجود بہت کچھ کہنے میں مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کنگ وینکلس نے علامات کا سہارا لے کر اپنے مخصوص نیم علامتی پیرائے میں اپنے دل کی بات کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ''مشین'' میں تو نیم علامتی پیرایہ نیم سے کچھ زیادہ کھلتا دکھائی دیا تو انہیں آخر میں یہ اضافی نوٹ دینا پڑ گیا: ''اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظرکشی کی گئی ہے۔ امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔''

کنگ وینکلس کی دو کہانیوں کے بعد ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی بارہ کہانیاں شامل کی ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ''تھرڈ ورلڈ گرل'' کے اختتام تک پہنچا تو ایسا لگا کہ سچ مچ کوئی گونگی کہانی بول پڑی ہے۔ ''ائر فریشنر'' صرف برطانیہ ہی کی نہیں اب تو یورپ بھر کے پاکستانیوں کی مجموعی فضا کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور ''آنر کلنگ'' پڑھتے ہوئے ایسے لگا کہ کہانی صرف بول نہیں پڑتی بلکہ بعض اوقات چلّاتی بھی ہے۔ قبل از اسلام کے مکہ میں زندہ گاڑ دی جانے والی بیٹیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی جیسے اکیسویں صدی کی انوکھی آنر کلنگ میں شامل ہو گئی ہیں۔ تب اس ظلم کو غیرت کے جاہلانہ تصور پر تحفظ حاصل تھا اور اب اسے خود مذہب کے نام پر تحفظ حاصل ہے۔ ''تھرڈ ڈائمنشن'' برطانیہ میں اسائلم لینے کی سہولتوں سے سچ جھوٹ بولنے کی کسی حد تک چلے جانے والوں کی دلچسپ کہانی ہے۔ باقی ساری کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔ ''ریڈیو کی موت'' کہانی کو میں نے یہ سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا کہ سیٹلائٹ اور ٹیلی ویژن چینلز کی نت نئی کرشمہ سازیوں کے سامنے ریڈیو کے دَم توڑنے کی کہانی ہو گی۔ لیکن یہ تو ایک بھلی مانس سی کہانی نکلی۔ لیکن اپنی بھل منسیٔ کے باوجود کہانی اچھی ہے۔ ''کہانی بول پڑتی ہے'' میں شامل ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بارہ کہانیاں ان کے اندر کی افسانہ نگار کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ کہانیاں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی مختلف النوع کہانیاں ہیں۔ خامیاں اور خوبیاں، دوسروں کی ہوں یا اپنوں کی، ان سب کو ایک توازن کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تبلیغی رنگ غالب ہونے لگتا ہے لیکن

صرف ایک دو کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے۔ بیشتر کہانیوں کا اختتام جیسے ہلکا سا ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے،لیکن یہ عمل کسی نوعیت کا ابہام پیدا نہیں کرتا، بلکہ قاری خود کہانی میں شریک ہو کراسے مکمل کر لیتا ہے، کیونکہ اختتامی ادھورا پن ایک واضح اشارا چھوڑ جاتا ہے۔اس سے کہانی کا سادہ بیانیہ ایک رنگ میں علامتی سا بن جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی یہ کہانیاں اردو افسانے کے سفر کا تسلسل ہیں۔ افسانہ غیر مقبول ہے یا سارا ادب ہی غیر مقبول ہوتا جا رہا ہے؟ وہ مقبولیت کے کسی پھیر میں نہیں پڑیں۔ان کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ انہیں یہ کہانیاں تخلیق کرنے کی توفیق مل گئی۔ قبولیت نصیب ہوگئی۔توفیق ملنے کی اس قبولیت پر میری طرف سے دلی مبارک باد!

14 مئی 2012ء

''آدھی چادر'' کے پورے رنگ

حیدر قریشی
جرمنی

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل،نظم،ماہیا،دوہے،وغیرہ) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔تنقیدی و تعارفی مضامین اور طنز ومزاح پر مشتمل تحریریں وہ ایک عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، پھر ان کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والا کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے''۔یہ ساری شعری ونثری نگارشات میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آرہا ہوں۔اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر شائع ہونے جا رہا ہے۔اس کی ان پیج فائل میرے سامنے ہے۔میں اس مجموعہ کے سارے افسانے پڑھ چکا ہوں اور اب ان کے بارے اپنی رائے دے سکتا ہوں۔پہلے میں ترتیب وار ہر افسانے کا ممکنہ اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا اور آخر میں سارے افسانوں پر اپنی مجموعی رائے بیان کردوں گا۔

''روشنی کا تعاقب''صوفیانہ خیالات سے لبریز انسان کی خارجی خباثتوں اور داخلی خوبصورتیوں کی دلچسپ کہانی ہے۔فرانز کافکا کی کہانی کی طرح رضیہ اسماعیل مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کے عمل سے ایسے گزرتی ہیں کہ خود دیکھنے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی مٹھی بھر زندگی قریب سے دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ایسی زندگی جہاں بہت سارے کہے اوران کہے سوال ہیں اور سوالوں کے اندر ہی کہیں ان کے جوابوں کی روشنی بھی ہے۔

''کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آجاتے۔گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔'' (روشنی کا تعاقب)

''ہرنام داس'' تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے المیہ کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کہانی کار نے اپنے بچپن کی عمر کی سوچ کو جس طرح اظہار کی زبان دی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ایسے ایسے معصومانہ سوال جن کے عقب میں زندگی کی مکاریوں کے کتنے راز چھپے ہوئے ہیں۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' (ہرنام داس)

ہرنام داس کے نام کے سحر میں کھوئی معصوم بچی پر جب اپنے والدین کے دکھوں کا راز کھلتا ہے تو تقسیم کے انسانی المیہ کی دو طرفہ المنا کی مزید دکھی کرنے لگتی ہے۔

''یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔'' (ہرنام داس)

''سوری'' ویسے تو انگلینڈ میں زندگی گزارنے والوں کی ہلکی پھلکی سی روداد ہے لیکن اس کے پس منظر سے عراق پر امریکی و برطانوی حملہ کا المیہ ابھرتا ہے۔کہانی کے مرکزی کرداروں سلمان اور سوسن کو اپنا کالج کے زمانے کا جیک یاد آتا ہے۔بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والا جیک فوج میں چلا گیا تھا اور اسے عراق جنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر پاگل ہو چکا تھا۔ایک پرانے دوست کا طویل عرصہ کے بعد سامنے آنا اور وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔لیکن کہانی کے مرکزی کردار کو احساس ہوتا ہے کہ عراق پر ہونے والے بے جا حملے میں شریک ہو کر جیک کا دیوانہ پن درحقیقت اس کا احساسِ گناہ ہے اور اس احساس کے حوالے سے وہ کہانی کے آخر میں کہتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔'' (سوری)

''چھنال'' پہلے دیپک کی ماں ساوتری کی زندگی کی اور پھر دیپک اور جیوتی کی زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں گھریلو زندگی اور ہندوستانی دیہات کا پرانا سماج مثالی مشرقی ماحول کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

''مکئی کا دانہ'' پاکستانی دیہاتوں کے عمومی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔گاؤں کا نمبردار اپنی جاگیر کے زعم میں گاؤں میں محض اس لیے ہسپتال بننے نہیں دیتا کہ گاؤں کے کمی کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔اولادِ نرینہ سے محروم جاگیردار کے ہاں ایک مدت کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے، لیکن شومئ قسمت بڑی بہن اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے منہ میں مکئی کا دانہ ڈال دیتی ہے جو بچے کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔گاؤں کے کمپاؤنڈر سے بچہ ٹھیک نہیں ہوتا۔آخر شہر سے اسی کمی کے بیٹے ڈاکٹر عباس کو بلایا جاتا ہے۔وہ بچے کو اُلٹا کر کے کمر پر ہاتھ مارتا ہے تو مکئی کا دانہ باہر آجاتا ہے۔لیکن بچہ تو کبھی کا مر چکا تھا۔گاؤں کے نمبردار کا وارث دم توڑ چکا تھا اور نمبردار کی رعونت خاک میں مل چکی تھی۔

لُک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے......لُک چھپ جانا......

کے الفاظ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے ککھ کر دیا تھا۔

ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آ ج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی......نہ زمانہ رہا......اور نہ ہی کائنات۔ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام ونشان کردیا تھا۔''

(مکئی کا دانہ)

''دیوارگریہ'' ایک خوبصورت لڑکی کی دکھ بھری داستان۔خواتین کے جذبات کی عمومی کہانی۔تاہم اس میں عمومیت کے باوجود کچھ خاص محسوس ہوتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کردیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔''

(دیوارگریہ)

''چیچہ وطنی'' پرانے دیہاتی ماحول کی دلچسپ کہانی ہے۔بس ایک روداد سی تھی جسے رضیہ اسماعیل کے اندازِ بیان نے انہماک سے پڑھی جانے والی کہانی بنا دیا ہے۔

دو بیویوں کے شوہر محمد خان کی دوسری بیوی بن جانے والی فاطمہ جٹی سے پہلی ملاقات کا منظر دیکھئے۔

''اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ وسال بھی رک گئی......لمحے سراسیمہ سے ہوگئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کرگئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار

گرتے گرتے بچا۔یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہوگیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کرگیا۔ چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔'' (چیچہ وطنی)

''کیہ جاناں میں کون'' بظاہر ایک فرد کے رقص اور قونیہ میں مولانا روم کے پیروکاروں کے مخصوص صوفیانہ رقص کی منظر کشی سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔لیکن صوفیانہ رمزوں کے کئی اسرار کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھلاتی ہوئی یہ کہانی ایک ایسے ادھورے انسان کی المناک کہانی ہے جسے قدرت نے بناتے ہوئے مکمل نہیں کیا، آدھا، ادھورا رہنے دیا۔نہ مرد بنا، نہ عورت۔کہانی صوفیانہ ماحول سے باہر آتی ہے تو ادب کی فضا چھا جاتی ہے۔اس ادھورے انسان کی دلچسپیوں کا سلسلہ رقص، موسیقی، ادب اور فن کے دوسرے سلسلوں سے بھی کسی نہ کسی طور ملتا جاتا ہے۔دراصل یہ خاکہ نما افسانہ ہے جو افتخار نسیم (افتی نسیم) کی زندگی کی کچھ روداد بیان کرتا ہے اور کچھ افسانہ نگار کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانہ نگار کو افتی سے گہری ہمدردی ہے، لیکن افتی اپنی اضطراری حرکات سے ہر بار افسانہ نگار کو خود سے متنفر کردیتا ہے۔اس کے باوجود افسانہ نگار کی ہمدردی اس کے لیے کم نہیں ہوتی۔اس خاکہ نما کہانی کے اختتام کا یہ قدرے طویل اقتباس دیکھیں۔

''میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا:"It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہوگیا تھا۔میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کردیا ''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟'' میں نے گویا جرح شروع کردی۔ اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہوسکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔'' میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!'' میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟'' اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔ لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔ رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔ جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا...... شاید اچھا ہی ہوا...... رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟'' میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے......

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔'' (کیہ جاناں میں کون)

''باکا'' غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کے دو دوستوں کی داستان ہے۔ کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان انڈونیشیا کی آزادی سے پہلے وہاں جاپانی فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ جاپانی فوجی وہاں جاسوسی کے شبہے میں پکڑے گئے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے اس کا حال جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ بعض واقعات پڑھ کر تو انسان سوچنے لگتا ہے کہ پھر تو امریکہ کے پاس ایٹم بم گرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ کلکتہ کے خوش حال گھرانے کا ڈاکٹر یونس جاپانیوں کے مظالم کا شکار ہو کر پاگل ہو جاتا ہے۔ اس دوران پاکستان بن جاتا ہے اور ڈاکٹر یونس پاکستان کے کسی پاگل خانے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہیں اس کے دیرینہ دوست ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر علاج کے لیے اپنے گھر پر رکھ لیا۔ کہانی پڑھنے سے پہلے کہانی کا عنوان ''باکا'' پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے کہانی کے کسی کردار کا نام مبارک ہوگا لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زبان میں پاگل کو باکا کہتے ہیں۔

''آدھی چادر'' برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک نوحہ سا لکھا گیا ہے۔ اس میں مشترکہ انسانی قدروں کا ذکر بھی ہے اور شدید سماجی تفاوت کا بیان بھی۔ سماجی سطح پر باہم خیر اور بھلائی کے جذبات رکھنے کے باوجود سماجی تضادات کی کشمکش نے تقسیم کے موقعہ پر خونریزی کے المیہ کو جنم دیا۔ ان ساری یادوں کو کہیں ادب کے حوالے سے، کہیں جذباتی رنگ میں، کہیں مذہبی شان کے ساتھ اور کہیں سادہ سے عام انسان کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ کے کئی پہلو اس میں نظرانداز بھی ہوئے ہیں تاہم کہانی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے حال تک کو ایک نظر دیکھا گیا ہے اور اچھے مستقبل کی امید بھی کی گئی ہے۔

''ققنس''۔۔۔ جیسے ''کیہ جاناں میں کون'' خاکہ نما افسانہ ہے ویسے ہی ''ققنس'' رپورتاژ نما افسانہ ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب کوئی لکھنے والا پختہ کار ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں مختلف اصناف کی آمیزش ایک خاص فنکارانہ مہارت کے ساتھ آسکتی

ہے۔رضیہ اسماعیل کی بعض تخلیقات میں ایسا دیکھا جا سکتا ہے۔ ''ققنس'' میں پہلے تو انگلینڈ
کے بعض ادبی اداروں اور تنظیموں کا بالواسطہ تعارف کرایا جاتا ہے۔ پھر بعض ادبی کرداروں
سے ملوایا جاتا ہے۔مختلف ادبی موضوعات پر بحث کے لیے اچھتے اشارے دیئے جاتے
ہیں۔ پھر ایک ادبی ورکشاپ کا حال سنایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک رپورتاژ کی صورت میں
بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے اندر کے افسانہ نگار سے کام لیتے ہوئے اسے
ایک افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

ایک پبلک لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے رضیہ اسماعیل بتاتی ہیں۔

''برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی
نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔انہوں نے شیکسپیئر میموریل
روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز''
(Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔'' (ققنس)

ادبی گروپ ''رائٹرز ودآؤٹ بارڈرز'' کا نام بڑا خوشنما ہے۔لیکن ابھی تک کی عملی سچی
بات یہ ہے کہ تحریریں تو بارڈرز کو کراس کر سکتی ہیں لیکن رائٹرز کو بارڈرز کراس کرنے میں بے
شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔خصوصاً انڈو پاک کے ادیبوں کو ویزے کی رکاوٹیں،
دوسرے ملک میں مشکوک نظروں سے دیکھے جانے کی اذیتیں ایسی ہیں جو بارڈرز کی سخت
اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہیں اور ادیب کی مجبوری کا بھی۔صرف انڈو پاک ہی میں نہیں
اب تو مغربی دنیا میں آنے والوں کو بھی ویسی ہی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔
اور لگ بھگ ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے۔سو رائٹرز ودآؤٹ بارڈرز محض کہنے کی بات
ہے۔

ادبی ورکشاپ میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور ایک ترک رائٹر تک ان الفاظ میں پہنچتی
ہے۔

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں......موڑ

مڑتی ہوئی کہانیاں...... بین کرتی ہوئی کہانیاں...... روٹھی ہوئی کہانیاں...... ہاری ہوئی
کہانیاں......مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں......کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!'' اب کی بار
ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔'' (ققنس)

''ققنس'' میں بنیادی طور پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ جیسے ققنس اپنی آگ میں جل
کر راکھ ہوتا ہے اور پھر اسی راکھ سے اس کا نیا جنم ہوتا ہے ویسے ہی جس کہانی کار کی کہانی
مکمل نہیں ہوتی وہ پھر اپنی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔اور یوں کہانی کہنے کا سلسلہ جاری و
ساری ہے۔اس حوالے سے رضیہ اسماعیل نے ورکشاپ کے شرکاء کی مختلف آراء دینے کے
ساتھ جوگندر پال کے ایک افسانچے کا اقتباس بھی دیا ہے۔

''ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی
تھی۔'' (ققنس)

اس کے بعد رضیہ اسماعیل نے جوگندر پال کے افسانچے کا ادھورا سا اقتباس دیا ہے۔
اگر یہ پورا افسانچہ درج کر دیا جاتا تو ''ققنس'' کا بار بار اپنی راکھ سے جنم لینے کا بھید زیادہ
روشن ہو کر سامنے آجاتا۔ یہاں جوگندر پال کا پورا افسانچہ درج کر دیتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے،اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ہاں،اسی لیے میرا کہنا
ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو۔۔۔اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی
پیدا ہونا ہے۔

ہاں بابو، میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کر لوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا
رہ جاتا ہے۔

نہیں، اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے، اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

مغربی دنیا میں مقیم اردو رائٹرز کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی سچی اور کھری
باتیں کی ہیں۔ایک جھلک یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔کنویں کے مینڈک

کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط وضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئ نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' (ققنس)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس مجموعہ کی گیارہ کہانیوں کا یہ مختصر سا تعارف تھا۔ ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔ آپ ایک افسانہ پڑھنا شروع کریں تو اسے ختم کیے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہے۔ ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول، پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص۔ پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ وجاپان کا کوئی بیان، رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیہ ہی میں نہیں اس ماحول میں بھی پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔ کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ یہ مہارت طویل ریاضت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

بیشتر کہانیوں میں انسانی المیوں کے مختلف روپ سامنے آتے جاتے چلے جاتے ہیں۔ مختلف کرداروں کی انفرادی نوعیت کے زندگی کے گہرے صدمات سے لے کر، تقسیم برصغیر کے وقت ہونے والا قتل وغارت، عراق میں ہونے والی ہولناک جنگ، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے بعض خوفناک واقعات۔ یہ سب ایسے جو اِن افسانوں میں بیان کیے گئے ہیں مؤثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ پھر ان سب کے مقابلہ میں انسانی اقدار کو اجاگر کرتے ہوئے صوفیانہ روایات سے عمدہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس دھرتی کے انسانوں کے لیے امید کی روشنی دکھائی گئی ہے۔ سو براہِ راست کسی نوعیت کی پیغام رسانی نہ کرتے ہوئے بھی رضیہ اسماعیل کے افسانے آج کے گلوبل انسان کے مسائل کو ماضی کے مختلف علاقوں کے مسائل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ پھر وہ انہیں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں انسانی مستقبل کے انسان کے لیے پیار اور محبت کی وہ روشنی دکھاتے ہیں جو دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی ماہیا نگاری

حیدر قریشی
جرمنی

اُردو میں ماہیا نگاری کی جتنی مخالفت ہو رہی ہے اتنی ہی اسے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔تھوڑا عرصہ پہلے برمنگھم میں ممتاز ادیب اور صحافی محمود ہاشمی سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی۔ ماہیے کا ذکر ہوا تو محمود ہاشمی نے بتایا کہ برمنگھم کی ایک شاعرہ اور مزاح نگار رضیہ اسماعیل بھی ماہیے کہہ رہی ہیں۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی تاہم ہلکا سا وسوسہ بھی رہا کہ یہ بھی کہیں عارضی قسم کی ماہیا نگار خاتون نہ نکلیں۔ جب ان سے رابطہ ہوا تو میرا وسوسہ دُور ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے کسی رابطے کے بغیر محض ادبی تحریک سے اتنے ماہیے کہہ چکی تھیں کہ ان کا مجموعہ تیار ہو چکا تھا۔ جب رابطہ ہوا تو ان کا دوسرا ادبی کام سامنے آیا۔خواتین کی ادبی وثقافتی تنظیم ''آ گہی'' قائم کرنے کے علاوہ تخلیقی سطح پر ان کے کام کی کئی جہات ہیں۔غزلوں کا مجموعہ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو!''،طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' اور نثری نظموں (نثرِ لطیف) کا مجموعہ ''میں عورت ہوں'' (اُردو، انگریزی میں ایک ساتھ) شائع ہو چکے ہیں۔شاعری کے بارے میں تو کوئی بات آگے ہوتی رہے گی۔ان کی نثر کے حوالے سے محمود ہاشمی کی رائے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''شاعروں اور مشاعروں کی بالا دستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے

معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اُپج ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جا سکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کیے جا سکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اِس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔''

اب رضیہ اسماعیل کے ڈھیر سارے ماہیے ایک ساتھ پڑھنے کے بعد میرے سامنے رضیہ اسماعیل کی ایک اور جہت روشن ہے۔ ان کے ماہیوں میں ان کے خیالات، احساسات اور تلخ وشیریں تجربات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ایک طرف ان کے ماہیوں میں حمد، نعت، سانحۂ کربلا اور تکریمِ صحابہ سے متعلق ماہیے ملتے ہیں تو دوسری طرف انگلینڈ میں مقیم ہونے کے باعث یہاں کے ثقافتی ٹکراؤ اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پہلے تبرک کے طور پر چند دینی ماہیے دیکھئے۔

تو باغ کا مالی ہے
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے

ربّ کے احکام ہوئے
آقاؐ آپؐ کے ہم
بے دام غلام ہوئے

اک شاخ انجیر کی ہے
رشتہ مدینے سے
صورت زنجیر کی ہے

ہمیں تیرے سہارے ہیں
پیاس بجھا دینا
کوثر کے کنارے ہیں

دریا میں سفینہ ہے
ماہِ رمضاں تو
بخشش کا مہینہ ہے

معراج کی رات آئی
جھولیاں بھر لو تم
ربّ کی سوغات آئی

جب غم کی گھٹا چھائی
پیٹتی سر اپنا
کربل میں قضا آئی

پانی کا سوالی ہے
نانا نبیؐ جس کا
کوثر کا والی ہے

اشکوں سے وضو کر کے
ماہیے لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کر کے

تو آمنہ جایا ہے
بی بی حلیمہ نے
تجھے دودھ پلایا ہے

دو فاطمہؓ جائے تھے
تو نے محبت سے
کاندھوں پہ بٹھائے تھے

بڑے دُکھ سُکھ ہوتے ہیں
تیرے پہلو میں
تیرے یار بھی سوتے ہیں

ان ماہیوں میں مذہبی محبت اور عقیدت کا رنگ غالب ہے۔لیکن مجھے مذہب سے یہ لگاؤ ایک طرح سے ثقافتی رنگ میں بھی محسوس ہوا ہے۔انگلینڈ میں رہتے ہوئے جب ہمیں اپنا دیسی معاشرہ اور ماحول یاد ہے تو اس کا مذہبی رنگ اس انداز سے اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ یوں بھی ثقافت کے ارضی رنگوں کے دوش بدوش آسمانی رنگوں کی آمیزش سے ہی کسی تہذیب کی تکمیل ہوتی ہے۔آسمانی رنگ میں مذہبی عقائد سب سے قوی اور موثر ہوتے ہیں۔

ثقافتی ٹکراؤ یا ثقافتی بحران کی وہی صورت جو برصغیر سے تعلق رکھنے والے، یورپ میں مقیم کم وبیش ہر فرد کو درپیش ہے، رضیہ اسماعیل نے اسے اپنے ماہیوں میں اتنی عمدگی اور خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ یہ گویا ہر دل کی آواز بن گئی ہے۔ایسے ماہیوں کی چند مثالوں سے میری بات بہتر طور پر واضح ہو سکے گی:

کڑوے ہیں سُکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

کلچر کا رونا ہے
آ کے ولایت میں
اب کچھ تو کھونا ہے

سب زخم چھپاتے ہیں
رہنے کا یورپ میں
ہم قرض چکاتے ہیں

یوکے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں

انگلینڈ کے میلے ہیں
جھرمٹ لوگوں کے
ہم پھر بھی اکیلے ہیں

ہیریں ہیں، نہ رانجھے ہیں
ہم نے ہوٹل میں
برتن بھی مانجھے ہیں

یورپ میں مقیم بعض دوسرے ماہیا نگاروں نے بھی یہاں کے مسائل کو عمدگی سے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ایسا انداز کہ جس سے ہم لوگوں کا ثقافتی بحران اور اس مسئلے کی داخلی کیفیات نمایاں ہوسکیں، اس کو رضیہ اسماعیل نے ایسی بے ساختگی سے بیان کیا ہے کہ یہ ان کی انفرادیت بن گئی ہے۔ ایسی انفرادیت جس میں پورے اجتماع کی ترجمانی یا عکاسی موجود ہے۔ یورپی زندگی کی بعض نجی اور اجتماعی نوعیت کی ملی جلی مثالیں بھی دیکھتے چلیں:

کس دیس میں رہتے ہیں
بچے پیرنٹس کو
یہاں شَٹ اَپ کہتے ہیں

دادا ہے، نہ دادی ہے
پکڑ کے ڈیڈی نے
شادی کروا دی ہے

یہاں کون ہمارا ہے
سردی دشمن ہے
ہیٹر کا سہارا ہے

کونجوں کی ڈاریں ہیں
بینیفِٹ آفس میں
بڑی لمبی قطاریں ہیں

مغرب میں رہنے والی ایک پاکستانی عورت کی حیثیت سے ماہیا نگاری کرنے والی رضیہ اسماعیل نے ماہیے کے عمومی موضوعات کو بھی چھوا ہے لیکن ان میں دوسروں میں شامل رہنے کے باوجود ان سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر کے موضوع پر پاکستان اور انڈیا میں الگ الگ رائے پائی جاتی ہے اور دونوں طرف سے ماہیا نگاروں نے اپنے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔

رضیہ اسماعیل نے بھی کشمیر کے حوالے سے دو ماہیے کہے ہیں اور ان میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ تاہم ان کا ایک ماہیا اتنا عمدہ ہے کہ اس کی داد انڈیا کے ادبی ذوق رکھنے والے بھی دیں گے۔

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے

مجھے لگتا ہے کہ یہ ماہیا لکھتے وقت بھی رضیہ کے لاشعور میں یورپی کلچر سے ٹکراؤ کا عمل جاری تھا۔ یہاں بعض والدین نے جس طرح بچوں کی شادیاں جبراً کرنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں جو تلخ مسائل پیدا ہوئے ، رضیہ کے ہاں کشمیر کی سیاسی صورتِ حال پر اپنے پاکستانی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لاشعوری طور پر ان کا اظہار ہوا ہے۔ تاہم یوں بھی نہیں کہ صرف یورپ اور مشرق کے ٹکراؤ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے ہاں ماہیے کا وہ رنگ بھی نمایاں ہے جو پنجاب کا رنگ کہلاتا ہے۔ ان کے ایسے ماہیے دیکھیں:

میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

اک نہر کنارہ ہے
گاؤں کا ہر ذرّہ
مجھے جان سے پیارا ہے

بیلوں کی جوڑی ہے
اس نے شرارت سے
میرے گاگر توڑی ہے

فصلوں کی کٹائی ہے
ساگ پراٹھے ہیں
کہیں دودھ ملائی ہے

ہاتھوں میں لکیریں ہیں
پاؤں میں شوگر کی
میٹھی زنجیریں ہیں

عورت کے حقوق کا موضوع رضیہ اسماعیل کا خاص موضوع ہے جو ان کی غزلوں ، نظموں سے لے کر طنزیہ مزاحیہ مضامین تک نمایاں ہے ۔ ان کے ماہیوں میں بھی اس موضوع کو آنا تھا، سو آیا۔

عورت کو ستاؤ گے
جنم جلی ہے جو
کیا اس کو جلاؤ گے

یہ دیئے کی باتی ہے
قدر کرو اس کی
دکھ سکھ کی ساتھی ہے

عورت کو دغا دو گے
بیوی بنا کر تم
چولھے میں جلا دو گے

کمھار کا آوا ہے
پکتا رہتا ہے
میرے دل میں جو لاوا ہے

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے

رضیہ اسماعیل نے اپنی ماہیا نگاری سے ماہیے کی تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔ انگلینڈ کے مشاعروں سے لے کر بی بی سی ایشیا کے اُردو ادبی پروگراموں تک اُردو ماہیا کو ادبی وقار کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اب ان کے ماہیوں کا مجموعہ چھپنے جا رہا ہے تو مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے۔ ان کے ماہیے ان کے دل کی کہانی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے یہ کہا ہے۔

یہ دل کی کہانی ہے
کوئی نہیں سنتا
اب خود کو سنانی ہے

لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد ماہیے کے قارئین اس کہانی کو دل چسپی سے پڑھیں گے۔ کیوں کہ یہ صرف رضیہ اسماعیل کی اپنی ہی نہیں، ہر صاحبِ دل کی کہانی ہے۔ ماہیا ''کتابِ دل'' ہی تو ہے۔ بہر حال رضیہ اسماعیل کے اس مجموعے کا دلی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

۲۷ر جنوری ۲۰۰۱ء

برگِ گل سے نوکِ خار تک

خواجہ محمد عارف
برمنگھم، برطانیہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے مجموعہ کلام کا نام ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ہے۔ نام بچے کا رکھنا ہو یا کسی دوسری چیز کا، اس پر اکثر خوب غور و خوض کیا جاتا ہے۔ مصنف بھی عام طور پر اپنے کسی مضمون، کہانی یا نظم کو عنوان دیتے وقت کوشش کرتا ہے کہ عنوان کے مختصر سے الفاظ میں اس کے نفسِ مضمون کا مکمل تعارف ہو جائے اور نہ صرف اس کی معنویت کا دریا کوزے میں بند ہو بلکہ اس کے اسلوب تحریر کی جھلک بھی دکھائی دے۔ کتاب کا نام تجویز کرتے وقت کبھی کبھی بہت سے اہلِ علم سے مشوروں کے بعد بھی کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہوتا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو یہ نام ایک بے ساختہ مصرع کی طرح ذہن میں آیا ہے جو اپنے الفاظ و معانی کے لحاظ سے رواں دواں اور مکمل ہے۔ ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کے نام سے مجھے اقبال کی زمین میں کہا جانے والا اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

میرے ندیم و ہم سخن، جو ہو جہاں وہیں چبھن
شعر کو برگ گل بنا، شعر کو نوکِ خار کر!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے حقیقت میں شعر کو برگ گل اور نوک خار دونوں میں حسین اور متوازن امتزاج پیدا کیا ہے۔ اس مناسبت سے ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ایک اسم بہ مسمیٰ کتاب ہے۔

انہوں نے کتاب کا نام رکھتے وقت کیا کیا سوچا ہوگا، اس کی انہوں نے کتاب میں

کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ ہی اس طرف کوئی اشارہ کیا ہے کہ اس میں خوشبو اور گلاب کیا
کیا ہے اور کانٹے کہاں کہاں ہیں۔ یہ کام انہوں نے بالغ نظر قارئین کے شعور واحساس پر
چھوڑ دیا ہے۔ جہاں تک خوشبو کا تعلق ہے، وہ تو خود بخود پھیلنے والی چیز ہے، عطار کو کہنے کی
حاجت نہیں ہوتی۔

بند گلیوں میں بھی خاموش رہا عطر فروش
شور کرتا رہا بازار میں شربت والا

نفسِ مضمون اور اسلوب کے لحاظ سے ایک قادرالکلام شاعر کے لئے غزل نظم، دوہے
اور ماہیے کسی بھی صنف سخن میں پھول کھلانا یا کانٹے اگانا دونوں کام ممکن ہیں۔ اس کا انحصار
شاعر کے علمی پس منظر، سماجی حالات اور انفرادی مزاج وطبیعت پر ہے۔ کسی کے دامن میں
پھول زیادہ اور کانٹے کم ہوں گے تو کسی کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ ڈاکٹر رضیہ
اسماعیل کی شاعری کی تمام اصناف میں اکثر تازہ پھولوں کی مہک کا احساس ہوتا ہے لیکن
کہیں کہیں انسانی سماج کے غیر معتدل رویوں پر ان کا ردعمل تلخی اور اداسی کی شکل اختیار کر لیتا
ہے۔ اظہار کے اس اسلوب کو ہم کانٹے کہہ سکتے ہیں لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کے
ہاں اداسی، مایوسی کی حدوں میں داخل نہیں ہوتی اور نہ ہی تلخی کا اظہار شائستگی کے بندھن توڑتا
ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کانٹے بہت زیادہ نوکیلے یا زہریلے نہیں
ہیں۔ شاید ذرا سخت ہوں گے لیکن بقول میاں محمد بخش:

کنڈے سخت گلاباں والے دوروں ویکھ نہ ڈریے
چوبھاں پھلیئے، رت چوایئے، جھول پھلیں تدھ بھریئے

ان کی شاعری کے معنوی پھولوں سے دامن بھرنے کے لئے کانٹوں کی خراش اور
چبھن سہنی ہوگی۔

اصناف کی تقسیم کے لحاظ سے میں ان کی غزل، پابند اور آزاد نظم کو گلاب سمجھتا ہوں۔
بہت سے مختلف موضوعات میں تقسیم ہونے کے باوجود ان کے ماہیوں کی قدر مشترک

پنجاب کی مٹی کی خوشبو ہے۔ دوہوں میں جدت کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری کی روایت
کے مطابق نسوانی جذبات کی عمدہ عکاسی اور ترجمانی ہے۔ رہی نثری نظم، تو اسے ان کی
اصناف سخن کی تقسیم کے لحاظ سے کانٹے کہا جا سکتا ہے۔ آیئے اسے ذرا تفصیل سے دیکھتے
ہیں۔

اُردو کے ادبی حلقوں میں نثری نظم اپنی ہیئت کے اعتبار سے ابھی زیر بحث مراحل سے
گزر رہی ہے۔ جہاں اہلِ علم کا روایت پسند طبقہ اسے قبول کرنے میں دشواری محسوس کرتا
ہے یا سرے سے مسترد کرتا ہے، وہیں ایک گروہ اس کے حق میں بھی دلائل پیش کرتا ہے۔
درمیانی راہ اختیار کرنے والے اسے ایک تجربہ قرار دیتے ہیں اور ''آزماؤ اور دیکھو'' کے
اصول پر کاربند ہیں۔ ان کے بقول اگر اس صنف ادب میں اظہار اور ابلاغ کی توانائی
موجود ہوئی تو یہ اپنا آپ منوا لے گی ورنہ اسے صرف نام کی جدت یا ندرت سے کبھی قبول
عام نہیں ملے گا۔ مجھے یہاں ان مختلف پہلوؤں سے بحث نہیں۔ نثری نظم کے ادبی مقام اور
افادیت کا تعین آنے والا وقت کرے گا۔ البتہ آخرالذکر رائے کو ترجیح دیتے ہوئے اتنا
کہوں گا کہ

جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اس تجرباتی مراحل سے گزرنے والی اور قدرے غیر مقبول
صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مصنفہ مزاج کے اعتبار سے زندگی کی مشکلوں سے نبرد
آزمائی کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ہر کام کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو خوب سوچ سمجھ کر پرکھتی ہیں
اور جب کام کرنے کا تہیہ کر لیں تو اس کے لئے سخت محنت کرتی ہیں۔ پاؤں کو لہولہان کر کے
کانٹوں پر چلنا سیکھتی ہیں اور پھر بڑے اعتماد سے کہتی ہیں کہ

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

انہوں نے نثری نظم کو بھی تن آسانوں کا مشغلہ نہیں سمجھا بلکہ اس اجنبی صنف کو اچھی

طرح چھان پھٹک کر اپنایا ہے اور اکثر نظموں میں اپنا مافی الضمیر بڑی کامیابی سے بیان کیا ہے۔ ان کی سماجی سرگرمیوں اور شاعری کا غالب حصہ عورت کے درد و کرب اور اس کے حقوق و مسائل کے اظہار سے عبارت ہے۔ بقول غالب:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

شاید اس درد و کرب کی شدت نے انہیں مجبور کیا ہے کہ لے اور نے کا سہارا لیے بغیر یہ کام سرانجام دیں۔

اس بات کو اقبال نے اپنے انداز میں یوں کہا ہے کہ

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے روح میں خیالات کے تلاطم کو عروضی قواعد سے تو آزاد ہی رہنے دیا لیکن الفاظ کے استعمال اور ان میں موجود تہ دار معانی کے ابلاغ پر اپنی گرفت بہت مضبوط رکھی ہے۔ انہیں نہایت توازن اور سلیقے سے برتا ہے۔

ان کی اکثر نثری نظموں میں معاشرے میں موجود ان عورتوں کے حالات و مسائل اور جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے جو ان کی سماجی زندگی یا پیشہ وارانہ تعلق سے ان کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بنے ہیں۔ انہوں نے اس درد کو اس شدت سے محسوس کیا ہے کہ یہ ان کا غم ذات بن گیا اور پھر انہوں نے اس درد کی دولت کو عام آگہی دینے کا فریضہ ایک سماجی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیا۔ اس ذمہ داری کو اس خلوص سے نبھایا کہ اکثر کرداروں کا کرب صیغہ واحد متکلم میں بیان کر کے اسے تاثیر عطا کی۔

مجھے ان کے مجموعہ کلام کو تدوین و ترتیب کے مراحل سے گزرتے وقت بالاستیعاب دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کی اکثر نثری نظموں میں جہاں اختصار اور بلاغت موجود ہے وہیں اسلوب میں کانٹوں کی ہلکی سی چبھن بھی ہے جس نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہ نظمیں پڑھ

کر نثری نظم کے بارے میں میرے خیالات و تاثرات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور روایت پسند گروہ کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ”مدر ٹریسا“، ”سوتیلی بیٹی“، ”بونے“، ”عقل مند“، ”اترن“، ”تعلیم یافتہ“، ”بخیل“ اور ”زیرو بیس (Zero Base)“ جیسی نظموں کی موجودگی اس صنف ادب کے پھلنے پھولنے کے واضح امکانات کی نشان دہی کر رہی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے ان نظموں میں عورت کے جذبات یا متضاد رویوں کا ذکر اپنی قوتِ اظہار کے ذریعے بڑے دل نشیں اسلوب میں کیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر نمونے کے طور پر صرف ایک نظم دیکھئے:

اترن
عورتیں
اترن پہننے سے گھبراتی ہیں
دوسری عورتوں سے ذکر کرتے ہوئے شرماتی ہیں
مگر۔۔۔
دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر
اوڑھ لیتی ہیں!

”اوڑھ لیتی“ کا برمحل استعمال کر کے انہوں نے ان دو لفظوں میں بہت سے مفاہیم داخل کر دیئے ہیں۔ قرآن کے الفاظ کے مطابق میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ لباس عیوب برہنگی کو چھپانے، موسموں کی شدت سے بچانے اور زیب و زینت کا سامان ہے۔ لباس انسان کو حیوانی زندگی سے ممیّز کر کے قابل عزت و تکریم بناتا ہے۔ گویا یہ انسانی فضیلت و احترام کا استعارہ ہے۔ یہ شرف صرف اسی صورت میں برقرار رہتا ہے جب اس لباس کو معاشرے میں رائج جائز اخلاقی اور قانونی ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ چرا کر یا چھین کر پہنے والے کبھی قابل احترام نہیں ہو سکتے۔

”اوڑھ لیتی“ کے استعمال سے ایک فریق کے درد و کرب اور دوسرے فریق کی خود

غرضی کا خوب صورت نقشہ کھینچا ہے۔ ان مہذب الفاظ میں انسانی فطرت کے غیر مہذب رویے کی اس انداز سے تصویر پیش کی گئی کہ طنز کی چبھن اپنی پوری شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔

ان کی ان نظموں میں خیال میں قوت اور سچائی اور اسلوب میں دل کشی و رعنائی بھرپور انداز میں محسوس ہوتی ہے۔ یہی دو چیزیں ابلاغ میں بھی توانائی کا سبب بنتی ہیں۔ اس کی مثالیں ان کی تقریباً تمام نثری نظموں میں دیکھی جا سکتی ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی نثری نظمیں کشت ویراں نہیں بلکہ اپنے جذبے کی سچائی اور الفاظ کے استعمال کے سلیقے نے انہیں دل سے نکل کر دل میں اترنے کا حسن عطا کیا ہے۔ سچی لگن ان نظموں کو نم کر رہی ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی نئی تخلیقات

خواجہ محمد عارف
برمنگھم

معروف شاعرہ اور حقوقِ نسواں کی علم بردار اور ادبی و ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی روحِ رواں محترمہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ کی علمی و ادبی حلقوں کے علاوہ برطانیہ سے باہر بھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔

حال ہی میں ان کی نئی تخلیقات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام آئی ہیں جن میں دو شعری تخلیقات اور ایک نثری تخلیق ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' ہے۔ تینوں کتابیں لاہور سے بک ہوم پبلشرز نے بڑے اہتمام سے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع کی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کی شاعری میں گلاب اور خوشبو کا استعارہ بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ان کی پہلی شعری تحقیق ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' 1999ء کو منصۂ شہود پر آئی تھی۔ ان کے پانچ شعری مجموعے جن میں ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کے علاوہ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''، ''پیپل کی چھاؤں میں''، ''ہوا کے سنگ سنگ'' اور نسائی شاعری مع انگریزی ترجمہ ''میں عورت ہوں'' بصورت کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کے عنوان سے 2012ء میں شائع ہوئی۔ اب ان کے دوہوں کا مجموعہ ''خوشبو اڑتی پھرے'' شائع ہوا ہے جس پر بھارت سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور محفوظ الحسن، جب کہ لندن سے عقیل دانش نے اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب بزرگ ادیب و صحافی

اوردانش ورمحمود ہاشمی مرحوم کے نام ہے۔

ان کی نسائی شاعری کا مجموعہ ''احساس کی خوشبو۔'' The Fragrance of Sentiments'' انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں کل چوالیس (44) نظمیں شامل ہیں۔اپنی شاعری کا ترجمہ کرنے میں رضیہ اسماعیل خود کفیل ہیں۔لندن سے معروف ادیبہ اور شاعرہ حمیدہ معین رضوی نے ان کی شاعری پر انگریزی میں سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔تفصیلی تعارف ڈاکٹر وردہ اسماعیل نے کروایا ہے۔

اس کتاب کے اردو حصے میں شروع میں اہل فکر ونظر کے تاثرات کے عنوان سے انیس (19) ادباوشعرا کی آراان کی نسائی شاعری کے حوالے سے رقم کی گئی ہیں۔فلیپ پر ڈاکٹر شہناز مزمل، بشری رحمٰن ، شبنم شکیل، پروین شیر،حمیدہ معین رضوی، عدیم ہاشمی اور زاہد مسعود کی آرادی گئی ہیں۔

دونوں کتب کی رسم اجرا بک ہوم رائٹرز کلب کے زیراہتمام پاک ٹی ہاؤس لاہور میں 15 راپریل 2012ء زیرصدارت محترم بشری رحمٰن منعقد ہوئی۔تقریب میں مقالات پڑھنے والوں میں زاہدمسعود،شہناز مزمل، پروین سجل اورڈاکٹر فوزیہ تبسم شامل تھیں۔

رضیہ اسماعیل اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر پوری تخلیقی قوت سے لکھی ہے۔2000ء میں ان کا پہلا نثری مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' کے عنوان سے طنزومزاح کی صورت میں قارئین تک پہنچا جب کہ پوپ کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے'' 2012ء میں شائع ہوا۔

''آدھی چادر'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔240 صفحات کے اس مجموعے میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں۔کتاب میں ممتاز شاعر، ادیب، دانشور اور نقاد حیدر قریشی کے علاوہ معروف افسانہ نگار وسفرنامہ نگار سلمٰی اعوان کی آرا شامل ہیں۔فلیپ پر ڈاکٹر شہناز مزمل اور محمود ہاشمی مرحوم کی آرادی گئی ہیں۔

اس کتاب کی رسم اجرا لاہور پنجابی کمپلیکس میں 19 اپریل 2016ء کو زیرصدارت

پروفیسر حسن عسکری کاظمی بڑی عمدگی سے ''ادب سرائے'' کے زیراہتمام منعقد ہوئی جس میں لاہور کے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کر کے تقریب کی رونق کو دوبالا کیا۔تقریب کی نظامت کا فریضہ ''ادب سرائے'' کی چیئر پرسن محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل نے سرانجام دیا۔ دیگر مقررین میں بشریٰ رحمٰن ، ڈاکٹر اجمل نیازی، سلمٰی اعوان ، زاہد مسعود، پروین سجل، ڈاکٹر فوزیہ تبسم اور ڈاکٹر عمران دانش شامل تھے۔

سلمٰی اعوان نے کہا کہ ''رضیہ کہانی لکھنے کا فن جانتی ہی نہیں بلکہ اسے سلیقے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہے۔''

حیدر قریشی نے اپنے تاثرات میں لکھا کہ ''ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔افسانہ نگار جس ماحول یا علاقے کی بات کر رہی ہیں، عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرائیت کر جاتی ہے۔کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے اور یہ مہارت طویل ریاضت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔''

آخر میں پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے رضیہ اسماعیل کی نثری کاوش کو بے حد سراہا اور اس مجموعے کے مرکزی افسانے ''آدھی چادر'' کو ایک شہکار افسانہ قرار دیتے ہوئے اسے اُردو ادب میں نہایت قابل قدر اضافہ قرار دیا۔

رضیہ اسماعیل کی پوپ کہانی

خواجہ محمد عارف

پوپ کہانی یا پاپ کہانی کیا ہے؟ کچھ عرصہ سے اُردو کے ادبی حلقوں میں یہ بحث جاری ہے۔ابھی تک تو اس کے نام کی تصریح ہی نہیں ہوسکی کہ یہ انگریزی لفظ ''پوپ'' ہے اوراس کا پاپائے روم سے بھی کچھ تعلق ہے یا ہندی ''پاپ'' ہے۔عام طور پر اسے پاپولر یعنی مقبول عام انگریزی موسیقی کی طرح کی ادبی صنف سمجھا جاتا ہے۔اس کی قبولیت یا مقبولیت کے بارے میں رائے زنی شاید قبل از وقت نہ سہی لیکن جلد بازی کی ذیل میں ضرور آتی ہے۔اگر چہ اس صنف ادب کی شاید سب سے بڑی پہچان اس میں موجود عجلت پسندی کا عنصر ہی ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے کیا یہ مختصر افسانہ یا افسانچہ ہے یا اس قبیل کی کوئی چیز ہے جسے سعادت حسن منٹو ''منی افسانہ'' کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں؟ نفس مضمون اور اسلوب کے لحاظ سے کیا اس کا نثری نظم سے کچھ رشتہ یا تعلق ہے؟ کیا اُردو ادب میں یہ بالکل نئی اور طبع زاد اختراع ہے یا نظم و نثر کی دوسری بہت سی اصناف کی طرح دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی سے آئی ہے؟ کیا اُردو میں محض نقالی اور جگالی ہو رہی ہے یا کسی دوسرے باغ سے لائی جانے والی یہ داب اُردو معاشرے کی آب و ہوا میں مختلف انداز کے برگ وگل سے مزین ہے؟ اُردو میں اس کا بانی کون ہے؟

ان بہت سے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

میں ذاتی طور پر اسے تیز رفتار زمانے کی پیداوار سمجھتا ہوں۔یہ صنف ادب اور صحافت کے بین کوئی حیثیت رکھتی ہے البتہ ادبی شعبدہ بازی سے اس کا مقام قدرے بلند ہے۔اگر ''پوپ کہانی'' کا اختصار یا ڈرامائیت اس کا خاص وصف مانا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ دنیا میں بیان کیے جانے والے ہزاروں لاکھوں لطیفے اور چٹکلے بہترین ''پوپ کہانیاں'' ہیں۔ان کے نفسِ مضمون سے اخلاقی سبق، ذہنی تفریح یا بے ہودگی اور فحش گوئی کا تعین ہوتا ہے۔کوئی ایک آدھ برجستہ جملہ یا لفظ اسلوب کو پرکشش بنا دیتا ہے جس سے سامع یا قاری طبیعت میں شگفتگی محسوس کرتا ہے۔لطیفے لوک ادب کا حصہ ہیں جن کے تخلیق کار گوشۂ گم نامی میں ہوتے ہیں لیکن ان ادب پاروں کی عوامی مقبولیت سینکڑوں سال برقرار رہتی ہے۔عام طور پر یہ تین چار جملوں میں مکمل ہو جاتے ہیں اور استاد شاگرد، میاں بیوی، باپ بیٹے، مالک نوکر، گاہک دکان دار، مختلف دوستوں، ڈاکٹر اور مریض وغیرہ کے کرداروں کے مکالموں کی صورت میں یک منظری تمثیل کے لوازمات سے بھی مزین ہوتے ہیں۔

زمانے کی تیز رفتاری میں اب اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ وہ ٹالسٹائی کے ناول ''جنگ اور امن''، ممتاز مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' یا اس حجم کے دوسرے فن پاروں سے حظ اٹھا سکے۔نسیم حجازی کے ناول پڑھ کر اسلامی حمیت اور ولولہ دل میں پالے اور پھر عملی نہ سہی لیکن کم از کم فکری دہشت گردی کے جرم میں ماخوذ ہو یا قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور انتظار حسین کے افسانوں میں موجود تہذیبی شعور اور علمیت کو کشید کرنے کے جنجال میں خود کو پھنسا کر اپنا وقت برباد کرے۔مہابھارت، رامائن اور الف لیلہ کی داستانیں پڑھنے اور سننے کے زمانے خواب وخیال ہو گئے ہیں۔اب پشاور کے قصہ خوانی بازار میں لوگ قصوں سے محظوظ نہیں ہوتے بلکہ وہاں ہونے والے دھماکوں اور خودکش حملوں کی بریکنگ نیوز پر مزاحیہ انداز میں تبصرے کیے جاتے ہیں۔پوپ کہانی بھی تو اپنے اندر بریکنگ نیوز جیسا مواد رکھتی ہے۔ زمانے کی تیز رفتاری کی وجہ سے انٹرنیٹ پر دو چار جملوں پر مشتمل الفاظ کا تبادلہ خطوط نویسی کا

قائم مقام بن چکا ہے۔ یوٹیوب وغیرہ کی ایک آدھ منٹ کی کلپ دیکھ کر فلم بینی کا ذوق پورا ہوجاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے جب اُردو کے ادبی جرائد میں پوپ کہانی کے نام اور اس کی تکنیک پر بحث چلی تو ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اس موضوع پر عام اُردو قلم کاروں کے برعکس مکمل طور پر تحقیقی انداز سے سوچا اور پھر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جوابات تلاش کیے۔ ان کی یہ تلاش بالکل علمی انداز کی تھی جس کا ذکر انہوں نے کتاب کے ابتدائیہ میں تفصیل سے کیا ہے۔ انہوں نے پوپ کہانی کے امریکی مصنف کنگ وینکلس سے اس سلسلے میں تبادلہ خیالات کے بعد اپنے طور پر پوپ کہانی کی تعریف متعین کر کے اس کی ہیئت کا خاکہ تیار کیا۔ پھر اس پر بارہ کہانیاں لکھیں۔

رضیہ اسماعیل کی کہانی میں ۔۔۔ انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے ۔۔۔ بلکہ عام سیدھی سادی کہانی کو ذرا جدید اسلوب اور برطانوی ماحول کی عکاسی کی وجہ سے انگریزی آمیز اُردو میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک نقاد ادب نہیں بلکہ عام قاری کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں وہ اکثر کامیاب ہوئی ہیں۔ چوں کہ پوپ کہانی کی تعریف اور خد و خال ابھی زیر بحث ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے مصنّفین کے ہاں بھی ابھی تک اس سلسلے میں کافی ابہام پایا جاتا ہے اس لئے ہم سہولت کے لئے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی پوپ کہانیوں کو ولایتی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ شاعری میں ''ولایتی ماہیے'' کے زیر عنوان برطانوی ماحول کی عکاسی کھٹے میٹھے انداز میں کر چکی ہیں۔

کڑوے ہیں سکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

ماہیوں میں اجمال ہے جب کہ کہانیوں میں وہی کڑوے سکھ ذرا تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

ان کی کہانی میں زیادہ تر برطانوی معاشرے کی ایشیائی بالخصوص مسلم پاکستانی کمیونٹی کے حالات و مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے، بیان میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں۔ کہانیوں کے عنوانات زیادہ تر انگریزی میں ہیں۔ یہاں چند کہانیوں کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

''آنر کلنگ''، ''تھرڈ ڈائمنشن''، ''بھائی جان'' اور ''ریڈیو کی موت'' میں انسانی نفسیات کی الجھنوں اور متضاد رویوں کی خوب صورت ترجمانی ہے۔ مغربی معاشروں میں بسنے والے ایشیائی عام طور پر بچوں کی جبری شادیاں کر کے بچوں کی تباہی اور خاندانوں کی رسوائیوں کا سبب بنتے ہیں۔ کبھی کبھی غیرت کے نام پر قتل کے کیس بھی سامنے آتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل کی کہانی ''آنر کلنگ'' میں جسمانی قتل کا کوئی واقعہ تو نہیں لیکن روایات کی پاس داری اور خاندان کی عزت و ناموس کی غلط تعبیر کر کے معصوم جانوں کے ارمانوں کا خون کر دیا جاتا ہے۔ ایسا جرم جس کا مجرم کسی قانون کی زد میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اوروں کو نصیحت، اپنے تئیں فضیحت ۔۔۔ کے کردار کی بہت عمدہ تصویر کھینچی ہے۔

''تھرڈ ڈائمنشن'' کہانی میں مغربی تہذیب کی نئی روشن خیالی کے ایک غلیظ اور مکروہ رویے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب اسے شخصی آزادی کا نام دے کر اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کو قانونی اور سماجی تحفظ ہونے کی وجہ سے دو پاکستانی مسلمان پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس قانون کی پناہ میں آنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ دل اور شکم کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت وہ شکم کی مان رہے ہیں۔ معاشی اور قانونی ضروریات کے تحت سہولت کی شادیوں کا چلن ایک عام سی بات ہے لیکن انسان کو بھوک کیسی کیسی اختراعیں کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تن من، دین دھرم سب بیچیں، جان پر کھیلیں لوگ
پاپی پیٹ کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلیں لوگ

اُردو میں اس موضوع پر افتخار نسیم نے کچھ افسانوں میں اپنی شخصیت مختلف کرداروں کی صورت میں پیش کر کے شاید اپنا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اس موضوع

پر بالکل دوسرے زاویہ سے دیکھا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے جس پر لکھنا سرکس کے رسے پر چلنے کے مترادف ہے۔ اگر کہیں تھوڑا سا بھی توازن بگڑ جائے تو سنبھلنا ممکن نہیں رہتا۔

’’بھائی جان‘‘ ایک سادہ کہانی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی تسکین کے لئے جہاں اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے کر سلاتا رہتا ہے وہیں تہذیبی قدروں اور مہذب الفاظ کی آڑ میں معاشرے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔

’’ریڈیو کی موت‘‘ میں ایک با صلاحیت اور محنتی خاتون اپنے دیرینہ ذوق کی تسکین کے لئے مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے لیکن اسے اپنے طے شدہ معیار کے مطابق اپنی فنی کارکردگی کا موقع نہیں ملتا۔ آخر اسے ایک ایسی پیشکش کی جاتی ہے جہاں اسے اپنی شناخت کم کرنے کی شرط کے ساتھ شاید فنی صلاحیتوں کے اظہار کا امکان نظر آ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا اندازہ لگا لیا، لہٰذا اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

میرے خیال میں کسی فن پارے کی پرکھ کرتے وقت اصل اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کہنے یا لکھنے والے کے دل و دماغ میں جو خیال و احساس تھا، کیا وہ پوری سچائی اور فنی دیانت داری سے بیان کر سکا ہے یا نہیں اور اگر وہ اپنے تئیں کام یاب ہوا ہے تو کیا سامع، ناظر یا قاری کو اپنا شریک احساس کر کے یہ کہنے پر مجبور کر سکا ہے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شرکت احساس اسی صورت میں ہوگی جب قلم کار کے جذبہ محرکہ کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب میں بھی کشش ہوگی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی یہ ولایتی کہانیاں اس بات کی مستحق ہیں کہ قارئین انہیں پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں جن سے مصنفہ کی حوصلہ افزائی ہو اور اگر ان کی نظر میں کہیں کوئی کمی محسوس ہو تو اسے بھی مثبت انداز میں بیان کریں۔ ہر لکھنے والے کے لئے قارئین کی رائے

جاننا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کے فکری پودوں کی آب یاری ہوتی رہے۔ یہی عمل اس کے قلم کو متحرک رکھتا ہے۔

امید ہے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ولایتی کہانیوں کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھائیں گی۔ ہم تارکین وطن کی زندگیوں میں پرانی اور نئی نسل میں تہذیبی اور فکری کشمکش، سماجی اور خاندانی ڈھانچوں کی توڑ پھوڑ، یہاں کے آزادانہ ماحول میں نئی نسل کی مثبت اور منفی دونوں طرح کی سرگرمیاں ایسے موضوعات ہیں جو لکھنے والوں کو اپنے اوپر عاید سماجی فریضے کی ادائیگی کی دعوت دے رہے ہیں۔

(26 فروری 2014ء)

رضیہ اسماعیل کی شاعری میں فلسفہ، تانیثیت (فیمنزم)

حمیدہ معین رضوی

لندن

فلسفہ طرز فکر کا نام ہے۔ اور رضیہ کی شاعری میں طرز فکر کا ایک مربوط نظریہ موجود ہے جو مغربی تصور سے مختلف ہے مگر عورت کے حقوق کا علمبر دار۔ اس لیے وہ تانیثیت کے فلسفہ کے مطابق لکھ رہی ہیں۔

رضیہ کی کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو دلچسپی کی ڈور سے بندھی میں کھنچتی ہی چلی گئی۔ جب ختم کی تو اداسی کا ایک گہرا رنگ چڑھ گیا، دل سے دماغ تک اوڑھ لی ہے درد کی پیلی ردا۔ والا حال ہوا۔

مبالغہ منافقت کی قسم ہے مگر میں جو تشبیہ رضیہ کی شاعری کی دوں گی وہ بالکل حقیقت ہے۔ رضیہ کی شاعری کو پڑھ کر ایک ہشت پہل ہیرے کا تصور ابھرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہیرے کا ہر عکس ایک جیسا چمکتا ہے اور رضیہ کی شاعری کے ہر پہلو کے چمکنے کا انداز اور رنگ مختلف ہے یعنی اس شعر کی تصویر جو میں والد صاحب سے سنتی تھی۔

یاس و حسرت، رنج و غم، درد و الم، سوز و گداز
دل میں میرے آیئے آٹھوں کا میلہ دیکھیئے

رضیہ کی شاعری ان آٹھ احساسات کا مرکب ہے، جو سلیقے کے ساتھ وارداتِ قلبی کے رنگوں میں ڈبو کر قرطاس پر بکھیری گئی اور شاعری تخلیق ہوگئی کہ درد کے آٹھوں کھونٹ قاری گھومتا ہے اور جب کتاب بند کرتا ہے تو وہ ویسا نہیں رہتا جیسا کتاب پڑھنے سے پہلے تھا نہ

ہو سکتا ہے۔

رضیہ کی کتاب کا نام ہے ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' اور یہ اس شعر کی تلمیح ہے۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

یوں تو ہر عورت کو کانٹوں پہ چلنا پڑتا ہے اسلئے اسے آتا بھی ہے لیکن رضیہ نے اپنے پیشے کی وجہ سے بہت سی عورتوں کو عقوبت سہتے بھی دیکھا ہے جو براہ راست سہنے سے دشوار تر ہے۔ آشوب، آگہی کا کوہ گراں شانوں پہ اٹھائے، فکر کے تازیانوں سے زخمی وجود لئے، احساس کے دردوں کو آنچل میں سمیٹے۔ ناہموار سنگلاخ پہاڑ پہ چڑھائی کا سفر رضیہ کی شاعری کی تعریف ہے کہ وہ دوسروں کے درد میں رنگ جاتی ہیں اور یوں کراہ اٹھتی ہے جیسے یہ اس کا اپنا ذاتی دکھ ہے۔ ہم اور تم کی تفریق نہیں رکھتیں، یہی نسائیت کا فلسفہ بھی ہے۔ شانوں سے شانہ ملا کے بوجھ بٹانا۔ دوسری خواتین کا دکھ درد سمجھنا، سب کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنا۔ طبقاتی خلیج کو ختم کرنا۔ اور انسانیت کی عظمت کے لئے کوشاں رہنا۔

شاعری تو ہزاروں خواتین کر رہی ہیں یہ اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ فرق یہ ہے کہ صرف محبوب کے لئے سولہ سنگھار کر کے پریتم آن ملو کی تانیں بلند اور گل و بلبل کے قصے سنانا ہی شاعری نہیں رہی۔

اب عورت کا نہ شاعری کرنا کوئی انہونی بات رہی نہ ہی نسائی شاعری کرنا، اکیسویں صدی کی ہر ذہین اور خلاق عورت نسائی شاعری ہی کرے گی۔ نسائی یا تانیثی شاعری کے حوالے سے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی نسائی تاریخ کے مطابق فیمنسٹ تحریک نسائی اذیت، جبر، ذلتوں اور حق تلفیوں کے احساس، اس کے شعور، اس کے لئے جدوجہد نسائی تحریک کی محرک بنی جو 1880ء سے شروع ہوئی۔

جب کہ ہندوستاں میں طبقہ بالا کی کچھ خواتین نے بیسویں صدی کے اوئل میں ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ پرورش پائی اور آزادی نسواں کا موضوع برتا ان ادیب خواتین کا

سارا زور اور غصہ مذہب کی مخالفت میں رہا۔اسی لئے انگارے کے مجموعے پر مقدمہ چلا اور مقدمے سے تحریک کی شہرت کو تو ضرور فائدہ پہنچا، خواتین کو نہیں۔۔ نہ خواتین کی حالت سدھری، برطانیہ میں نسائی تحریک کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھوں میں رہی انہیں مزدور طبقے کی خواتین کی حمایت بھی حاصل رہی اور انہوں نے اجتماعی مفاد کے لئے کام کیا جبکہ ہمارے یہاں آزادیٔ نسواں کا مطلب وہ پردہ ہی رہا جو مردوں کی عقل پر پڑا رہا۔اور عورتیں پیر کی جوتی بنی رہیں۔ یا پھر۔مردوں میں مقبول ہونے کے لئے جام و مینا سنبھال کر بیٹھ گئیں۔اور یوں مردوں کے چنگل میں پھنس کر مزید غلام ہو گئیں۔

پاکستان بننے کے بعد طرز زندگی کے ساتھ۔ پرانی قدریں مٹ گئیں۔متوسط طبقے میں تعلیم آئی، اور اس کے ساتھ آشوبِ آگہی بھی۔اب لکھنے کے لئے اور چھپنے کے لئے ترقی پسندی سے وفاداری ضروری نہیں رہی گو کہ ترقی پسند مصنفین نے صرف اپنی پسند کے لوگوں کو آگے بڑھایا اور اپنے ٹولے کی خواتین کو مرکز مہیا کیا اور انہیں مبالغہ آمیز شہرت دی۔۔۔اسی زمانے میں کشور ناہید نے ایک مخصوص نسائی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ یہ شاعری ترقی پسندی کا عکس تو ضرور تھی مگر کسی شعوری نسائی تحریک کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ کشور ناہید کے اپنے حالات تھے اور ان کا سپہ سالار دستہ ہونا تھا۔ زنداں کی دیوار کسی کو تو توڑنی تھی۔کہتی ہیں۔

ہر مرحلہ پہ شوق تمشائی چاہیئے
عشق نمود بستہ کو رسوائی چاہیئے

کشور ناہید کو ظاہراً ایک ایسا ملبوس پہننا پڑا جو اس کے باطن کو چھپا لے کہ وہ قدروں کا زمانہ تھا اور دوغلی قدروں کا، مرد کے لیے اور اصول عورتوں کے لیے اور۔ کشور ناہید نے سنبھل سنبھل کر قدم رکھا اپنی تمام تر بغاوت کے باوجود، اس لیے انہیں چونکانے کے لیے اپنی سوانح کا نام ''ایک بری عورت کی کتھا''۔رکھا۔۔۔کشور کی شاعری مختلف ہو کر بھی محتاط انداز ہی رکھتی ہے۔کشور کی نظمیں اور اس کی لے ایک زخمی کی کراہ کا انداز معلوم ہوتی ہیں،

جس کو ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ایک عورت ہی محسوس کرتی۔کشور کے بعد فہمیدہ نے اس انداز کو آگے بڑھایا انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ بتانے کی کوشش کی کہ نسائی آزادی کا مطلب نسائی جنسی جذبے کا اظہار ہے کہیں کہیں ان کی آواز ایک جھنجھلائی ہوئی عورت کا احتجاج معلوم ہوتی ہے۔نسائی تحریک کے امیزن دور کی خواتین والی جھنجھلاہٹ۔ وقت اور تاریخ کو پیچھے لے جانے کی یا بدل دینے کی بچگانہ کوشش، تاہم ان کی شاعری میں جنسیت کے فروغ کی مردوں کی طرف سے کافی آؤ بھگت کی گئی اور مرد نقادوں نے ہی یہ طے کر لیا کہ نسائی شاعری عورت کی جنسی شاعری ہے گویا۔۔۔عورت صرف جنس ہے اور عقل سے بیدل اور یہ کہ عورت فکری اور فلسفیانہ شاعری نہیں کر سکتی۔۔۔ یہ ایک خطرناک رجحان تھا اور ہے۔۔۔اسی وجہ سے شاعرات کی اکثریت نے فہمیدہ ریاض کی پیروی نہیں کی۔

ستر کی دہائی میں جب پروین شاکر کی شاعری آسمانِ ادب پر نمودار ہوئی، جس میں جنسی جذبوں کے رنگ تو آئے مگر یوں چہرے پہ حیا کی سرخی کا رنگ جو بہت کچھ کہہ بھی جاتا ہے مگر گھناؤنا نہیں لگتا اس کے ساتھ پروین کی شاعری میں فکری رویہ کی منطقی سوجھ بوجھ بھی نمایاں ہوئی۔ پروین کی شاعری میں حیات وکائنات کے مسائل اور مذہبی حوالے سے غور و فکر بھی نظر آیا۔اسی نوے کی دہائی میں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ شاعرات کی جو کھیپ سامنے آئی وہ پروین شاکر کی شاعری کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

رضیہ اسماعیل بھی پروین شاکر کی راہ پر چلیں جس میں فکر کی آمیزش ہے، مسائل کا زندہ احساس ہے۔حیات وکائنات اور سماجی ومعاشرتی الجھنیں ہیں عورت کے گھٹ گھٹ کر مرنے کی داستان ہے۔رضیہ بتاتی ہیں کہ عورت کے اندر محبت کا ایک بحرِ بے کنار ہے مگر اس کی قدر نہیں کی جاتی اسے اس کی کمزوری بنا کر اسے لوٹ لیا جاتا ہے اس لوٹ میں سب شامل ہیں۔کبھی اسے جہیز کم ملنے پہ جلا دیا جاتا ہے۔کبھی اسے وراثت سے محروم کرنے کے لئے قرآن سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے اور اس کی شباب بھری راتیں اذیت کی بھٹی میں سلگا دی جاتی ہیں، اور کبھی باپ اپنے مفاد کیلئے کم عمر دوشیزہ کو بوڑھے نامرد سے بیاہ دیتا

ہے جہاں وہ ہر رات دار پر چڑھائی جاتی ہے۔کبھی سسرال یا ماں باپ کی بے قدر بوگس، عزت کی میت کو عورت کا خون بہا کر بچایا جاتا ہے۔

رضیہ نے ایسی مظلوم خواتین سے ملاقاتیں کیں۔اپنے سوشل ورک ریسرچ کی وجہ سے ہر عورت کا دکھ اوڑھ کر اس کے کردار میں گھس کر دیکھا اور ان جذبات کو زبان دی۔ رضیہ نے ہر واقعہ کو شعر کا پیرہن عطا کیا جو لباس ہے تو لہو رنگ ہے اور بے لباسی میں زخمی لاش، ہر شعر پہ خون کا چھینٹا لگتا ہے۔

آنکھ خوابوں کو تخلیق کرتی رہی

زندگی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہی۔۔۔روشنی چاندنی خوشبوئیں۔۔۔تتلیاں۔۔۔منہ چھپائے چھپائے سسکتی رہیں۔

ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے موضوعات میں بہت تنوع ہے۔جو ان کی ہم عصر شاعرات میں بہت کم ہے۔

رضیہ نے محبت کی شاعری میں بھی گرمجوشی خلوص، وقار اور دبدبہ کا رویہ رکھا ہے۔۔۔ پروین شاکر کی طرح لہجہ میں شیرینی ہی نہیں رضیہ کے ہاں درد کی کاٹ بھی ہے اور وہ مخدوم کی طرح قائل ہیں۔چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو۔مگر۔ان کی نسائی آواز میں بھی ایک توانائی کا مردہ سنائی دیتا ہے، یہ توانا لہجہ نہ فہمیدہ ریاض کی آواز کی طرح ایک باغی کی جھنجھلاہٹ کا طنز ہے نہ کشور ناہید کی شاعری جیسی تلخیاں ہیں جن کو پڑھتے ہوئے قاری کا ذہن تلخ سا ہو جاتا ہے۔کہ ادب ایک مشترکہ سرمایہ ہے مگر رضیہ نے اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔

ہمیں دوسروں کی خوبیوں کو سراہنے کی خو سیکھنی چاہیئے۔خصوصاً خواتین کو۔یہی تانیثی فلسفہ ہے۔رضیہ نے زہریلے مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے بھی لہجہ تلخ نہیں ہونے دیا۔ محبت شاعرانہ اظہار کی بنیاد ہے یہ محبت اصولوں، نظریات سے، اللہ سے، آدرش اور اعلیٰ مقاصد سے، اور جنس مخالف سے بھی ہو سکتی ہے۔

ہم تو محبت کی انہیں حدود کو جانتے ہیں، ویسے تو ہم جنسی بھی مغرب میں عام ہے۔اور امریکہ میں تانیثی تحریک کو اسی ہم جنسی کے رجحان نے بہت نقصان پہنچایا۔خاص طور پر اونچے قدامت پسند لوگ تو اپنی بہو بیٹیوں کو فیمنسٹوں سے ملنے جلنے بھی نہیں دیتے تھے۔

تو بات کر رہی تھی میں اس محبت کی جس پہ کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔رضیہ محبت کا اعلان کر کے شرمندہ نہیں ہوتی محبت میں پانے اور کھونے کے دکھ ساتھ ساتھ ہیں اس کے پا بہ رکاب ہیں محبوب کی یاد میں پگھل کر بھی اس کے قدم نہیں چومتی بلکہ محبوب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے اور انسانیت کی ارتقا میں دکھ اٹھانے کو وصال کی گھڑیوں کا منتہا بنانا چاہتی ہیں۔محبت کے موسم بدلنے کی اذیت ناک یادیں احساس شکایت کو تو اجاگر کرتی ہیں۔رضیہ کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے۔درد کا لہجہ اور لہجے کا درد قاری کو گہری اداسی میں تو مبتلا کرتا ہے مگر قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اکیسویں صدی کی ایک پروقار عورت ہے جو مرد کو للکار کر بتا سکتی ہے۔

اگر موسم بدلتے ہیں تو دل بھی ایک موسم ہے۔عورت کو اب محبت میں آنکھ بند کر کے خود سپردگی کی سولی پر چڑھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لیے اب یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محبوب جو اب تک صرف ظلم ڈھانے کا عادی تھا اسے وفا نہ ملے وہ پچھتا کر لوٹے تو کوئی اس کا منتظر نہ ہو۔۔۔دیکھئے یہ فرق ہے رضیہ کہتی ہے۔

میں نے خود کو چھپا لیا خود سے
اتنی لوگوں میں خود نمائی تھی
شہر میں وصل کے اجالے تھے
اپنی قسمت میں ہی جدائی تھی
رضیہ کی جرأت دیکھئے
نہیں میں اپنی تنہائی کو اب تنہا نہ چھوڑوں گی
میں اس سے منہ، نہ موڑوں گی

یہی بہتر ہے اب واپس نہ آؤ تم
کیونکہ اب میرے پاس عشق میں گھلنے کا وقت نہیں

اسی طرح رضیہ نے محبت کا نیا انداز اختیار کیا ہے۔

کہ تم ہی مرکز ومحور بنے میرے
مرے خوابوں گلابوں رت جگوں ۔قوس قزح، مانوس، نامانوس جذبوں کے
مگر جب لے کے انگڑائی ۔۔اٹھی میں بستر دل سے
اندھیرا چار سو تھا۔گھور اندھیرا
لگا یوں روح جیسے کر چکی پرواز جسم ناتواں ہے
مرے خوابوں، گلابوں رتجگوں قوس قزح کے
رنگ سارے کھو چکے تھے
مرے اس چاہنے والے کے سب جذبے پرانے ہو چکے تھے

مگر وہ اس چاہنے والے کے پیچھے جان نہیں دینا چاہتی بلکہ للکار کر کہتی ہے:

مگر یہ زندگی میری۔مگر یہ دل تو میرا ہے
نئے جذبوں نئے رنگوں سے اس کو پھر سجانا ہے
مجھے اس نے بھلایا ہے مجھے اس کو بھلانا ہے،
مکمل بھول جاتا ہے۔اگر موسم بدلتے ہیں تو دل بھی ایک موسم ہے
اسے بھی لہلہانا ہے اسے بھی مسکرانا ہے

کشور ناہید کہتی ہیں:

کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں
صحبتیں خوب ہیں خوش وقتی غم کی خاطر
میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

رضیہ کی شاعری میں جنونِ عشق ہی نہیں فسونِ عقل بھی ہے وہ انتظار کی سولی پہ بھی پیر کی جوتی نہیں بنتی۔ بلکہ کہتی ہیں۔

خوشی اک عارضی شے ہے
سدا تو غم ہی رہتے ہیں
جنھیں سب ہنس کے سہتے ہیں
وہ ضبط کا پہاڑ بن جاتی ہے میں موت چرالائی ہوں
اپنے ہی کفن سے پھر وہ مشورہ دیتی ہیں
چلو آغاز کرتے ہیں۔کسی انجام سے پہلے
سفر کو ختم کرتے ہیں۔اترتی شام سے پہلے
کسی انجام کی وحشت کا سارا خوف
دریا برد کر ڈالیں
ازل سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے تنہا مسافر کے لیے
تاریک رستے میں کوئی شمع جلا ڈالیں
چلو مٹی کے پیالوں سے چھلکتی مضطرب بے چین روحوں کو
محبت، پیار اور امید کا نغمہ سنا ڈالیں
ہمیں انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کے جتنے بھی حوالے ہیں
سبھی کو ڈھونڈنا ہوگا
ہمیں انسان کے قدموں سے باندھے سب بھنور،
اک ایک کر کے کھولنے ہوں گے،
ہمیں میزان کے پلڑوں میں
سچ اور جھوٹ کے سارے حوالے تولنے ہوں گے،
کسی انجام سے پہلے اگر آغاز ہو جائے

تو پھر انجام کی وحشت کا سارا خوف

اپنے آپ مر جائے

انکی نثری نظمیں خصوصیت سے بامعنی اور اثر آفرینی سے مملو ہیں۔ ''عورت میرا حوالہ۔۔ متلاشی آنکھیں۔ ہوا کا جھونکا۔۔ پیار کی حرارت۔۔ کتبے۔۔ آدھی عورت۔ بند کواڑ۔۔ دستک۔۔ عورت کا گناہ جو ناقابلِ معافی ہے قتل کا لائسنس۔۔ تشنہ لب'' بانجھ عورت۔ ان سب نظموں کو پڑھتے ہوئے۔ دل ابھرتا ڈوبتا کانپتا۔ کائنات کی وسعتوں میں سرگرداں ہوجاتا ہے۔ کسی درد انگیز موسیقی کی فضا میں پھیلتی ہوئی تان کی طرح۔

رضیہ کی بعض نظمیں جہاں تجربہ ہیں وہاں بعض جن میں درد سہنے اور درد کا مشاہدہ کرنے کا تجربہ۔ جو صرف ایک عورت ہی کرسکتی ہے کہ دوسری عورت کی درد کی کراہ اور چیخ میں داخل ہوکر درد اوڑھ لے دکھ پہن لے۔

یہ سمجھنا کسی مرد نقاد کے لئے ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ بعض نظمیں نہ تجربہ ہیں نہ مشاہدہ بلکہ دکھی دلوں کے وصال کی تمنائیں جو مجسم ہوکر چھب دکھا گئیں۔ یا کوئی یادگاری وصال لمحہ جو امر ہوگیا ہے اور سوختہ جاں محبت۔ گریہ کناں، شکوہ کناں ہے کہ وہ اسے گھائل کرتا ہی رہتا ہے۔۔ تجھے دنیا میں رہنا ہے۔۔ سبھی کا درد سہنا ہے، ''یہی حکم الٰہی ہے'' یہ نظمیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ عورت پر ظلم کی تاریخ کی رضیہ نے شاعری میں مصوری کی ہے۔

ان کے کلام میں جدیدیت بھی ہے، شعر ملاحظہ ہو:

عمر بھر دار پہ لٹکی ہوں تمہاری خاطر

اب تو مقتل میں ہے جانے کی تمہاری باری

یہ شعر رضیہ کو کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض سے علیحدہ کردیتا ہے:

راستے میری مسافت سے تھکے جاتے ہیں

میں نہیں راستہ اب آبلہ پا ہوتا ہے

کچھ نظمیں سر ریلزم کے انداز میں بھی ہیں، جیسے سکھ کا دکھ۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔۔۔ پتھر کے خواب۔ احساس ذات ہمیں اب تیز چلتا ہے، سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں، بیوہ، نئی زمین۔ ادھورا خواب، چوتھا موسم۔ رضیہ کی نثری نظمیں بھی فکری طور پہ اپنے مربوط فکری نظام کی وجہ سے اچھی لگیں۔۔ مجھے ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں زیادہ پسند آئیں۔ دوہے اور ماہیا پہ مجھے کچھ مہارت نہیں مگر اچھے لگے اور رضیہ کی وسعت صلاحیت اور قدرت بیان کی گواہی ضرور ملی۔

رضیہ کو میں اہم شاعرہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ ہمہ جہت شاعرہ ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے آچکے ہیں جن میں بتدریج ارتقا ہے، انکی شاعری میں موضوعات کا تنوع اور وسعت ہے۔ غنائیت ہے، نرم روی ہے، اظہار خیال میں کثیر الجہتی ہے۔ اور ان سب کے پیچھے ایک مربوط فکری رویہ ہے۔ اور پھر درد کا وہ گہرا رنگ کہ قاری ڈوب ڈوب جائے۔ اصناف سخن میں غزلیں، نظمیں۔ آزاد نظمیں۔ نثری نظمیں۔ ماہیے، قطعے۔ اور دوہے۔ ان کے ہاں جدیدیت بھی ہے۔۔ نظم۔۔ بند کیواڑ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔۔ چوتھا موسم۔ لکیریں۔ سر ریلزم بھی ہے۔ استعارہ سے ابلاغ تک۔ نیلی رگیں۔ عقوبت خانے، پڑھیئے اور رک کر سوچیئے، اب ایک ماہیا اور ایک دوہا۔ پیش خدمت ہے۔

عورت کو دغا دو گے

بیوی بنا کر تم

چولہے میں جلا دو گے

رونا دھونا چھوڑ ری گوری، جیون ہے انمول

پردیسی پیتم کی خاطر جیون دان نہ رول

عقل کے اندھوں کیوں کہتے ہو یہ تیرا یہ میرا

کون سدا جگ میں رہنے کا چڑیاں رین بسیرا

ابھی تو بات مری ختم ہونہ پائی تھی

مرے دیوانے کو جلدی تھی کتنی جانے کی

رضیہ نے گھریلو تشدد کے موضوع پہ پی۔ایچ۔ڈی کی ہے اور ایک سے ایک دردناک صورت حال کا مشاہدہ کیا ہے۔عورتیں جنہیں شوہر مار مار کر معذور تک کر دیتے ہیں۔اس لیے انہوں نے کہا

سچ کہنے پہ مجبور ہیں پتھر ہمیں مارو
ہم وقت کے منصور ہیں پتھر ہمیں مارو
ہم ذات کے صحرا سے نکل پائیں تو کیسے
ہم خود سے بھی مفرور ہیں پتھر ہمیں مارو
اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا
تجھے پا کر بھی یہ دل ڈھونڈتا رہتا ہے تجھے
تو مرے پاس بھی یوں کھویا ہوا ہوتا ہے

میں ایک اہم بات اور کہنا چاہوں گی کہ مغرب میں فیمنزم کی تحریک انیسوی صدی کے اوائل سے شروع ہوئی جس کے پیچھے عورتوں پر ظلم زیادتی اور ناانصافی کا پس منظر تھا اخلاقی۔ قانونی معاشرتی معاشی اور سماجی ہر محاذ پہ عورت کو ذلیل کیا جاتا اور اسے انسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، اس لیے ڈیڑھ صدی تک مغرب کی عورت خود کو انسان منوانے کے لئے روتی رہی ہے عورتوں نے اپنے حقوق کے لئے بہت جانی و مالی قربانیاں دیں مگر ہمارے معاشرہ نے عورت کی ناک کو خاک آلود کرنا کیوں شروع کیا؟ جبکہ اسلام میں عورت کو بنی نوع انسان پکارا گیا اسے پہلے دن سے حقوق و فرائض دونوں میں مرد کے برابر سمجھا گیا۔

رضیہ کی شاعری کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ مردوں کے خلاف کوئی محاذ کھول رہی ہیں، رضیہ حقوق کی بھیک نہیں مانگ رہی بلکہ وہ حقوق مانگ رہی ہیں جو خالق کائنات نے عورت کو دیے ہیں۔رضیہ اسماعیل نے ایک مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔اور اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے۔

''کہانی بول پڑتی ہے'' ایک جائزہ

حمیدہ معین رضوی
لندن

رضیہ اسماعیل کی کہانیاں یہاں آپ سے اظہار رائے کرنے والوں کی طرح میں نے بھی پڑھی ہیں، اور کہانی کا طرز بیان اور کہانی کی صنف کے بارہ میں ایک بحث چل پڑی ہے۔ بحث کرنا بھی ایک صحت مند علامت ہے اگر بحث میں حصہ لینے والے ایک دوسرے سے منطقی بحث کریں اور اس کے نتیجے میں کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔اور دوسرے کی معقول اور منطقی رائے کو اہمیت دی جائے۔

رضیہ اسماعیل ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور اس کا ثبوت ان کی یہ کتاب ہے۔''کہانی بول پڑتی ہے۔'' شاعری میں ہم ان کی خصوصی طرز بیان کو دیکھ چکے ہیں نثر کی مزاحیہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور اب اس بحث پہ تحقیق مکمل کی ہے کہ کیا واقعی پوپ کہانی کوئی ایجاد بندہ ہے؟ یا ایجاد معاشرت جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ادب معاشرت کو اور معاشرت ادب کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔

ان کی تحقیق آپ سب نے میری طرح پڑھی ہوگی اسے میں ایک مستحسن قدم سمجھتی ہوں اور ادب میں اضافہ بھی کہوں گی انہوں نے انگریزی سے ترجمہ کر کے دو کہانیاں شامل بھی کی ہیں اور پھر بذات خود اس کے طرز پہ کہانیاں لکھ کر بھی دکھا دیں۔دلچسپ حقیقت تو یہ ہے کہ جو انگریزی کہانیاں انہوں نے مثالی طور پہ پیش کی ہیں وہ خود امریکی تعریف کے مطابق نہیں پہلی کہانی واضع طور پہ ادبی صورت حال سے بیزاری پہ ہے، اور دوسری کہانی

پہلی سے بھی زیادہ علامتی ہے اور بہت کچھ اس میں کہا گیا ہے جو غالباً ناک کی سیدھ میں ہونے والی کہانی میں کہنا ممکن نہیں ہوتا۔

اس مجموعے میں رضیہ کی بارہ کہانیاں شامل ہیں اور کسی کہانی سے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ پہلی بار کہانی لکھ رہی ہیں یا تجرباتی طور پر لکھ رہی ہیں۔ یہ کہانیاں سیدھی سادی بیانیہ ہونے کے باوجود دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں تین بنیادی شرائط پائی جاتی ہیں۔

ابتدائیہ درمیانی حصہ اور قاری کے لیے قابل اطمینان اختتام۔ یہ شرائط کہانی قصہ۔ دیہی کہانیاں فوک کہانی۔ ایپک۔ داستان۔ مثنوی سب میں پائی جاتی ہیں آگے بڑھیں تو ابن عربی کی فتوحات مکیہ، گوئیٹے کی ڈیوائین کامیڈی، فارسی میں ترجمہ شدہ کلیلہ دمنہ، فردوسی کا شاہنامہ، ان سب میں بھی یہ خصوصیات ہیں جو رضیہ کی کہانیوں میں ہیں۔ رضیہ کی کہانیاں اسی لیے دلچسپ ہیں کہ ان میں کہانی کے بنیادی عناصر موجود ہیں۔ کہانی کو قاری کے سامنے پیش کئے جانے کا انداز بھی ہلکا پھلکا اور دلچسپ ہے۔ یہ کہانیاں ہماری روزمرہ زندگی اور اس کے تجربات واحساسات پر مبنی ہیں، کسی نے کہا تھا کہ ترک وطن ایک کربناک تجربہ ہی نہیں انسان کی شخصیت کو کچل دینے والا عمل ہے۔ رضیہ کی جو کہانیاں خصوصیت کی حامل ہیں وہ یہ ہیں۔ آنر کلنگ پہ بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں مگر رضیہ کی کہانی میں ایک انفرادی انداز ہے۔ ایئر فریشنر۔ گاربیج۔ پیکی۔ ان میں نسل پرستی کا دکھ ہے جو ہم سب نے زندگی میں ایک آدھ بار ضرور سہا ہے۔ تھرڈ ورلڈ گرل بھی سرمایہ کے استحصال میں امیر قوموں اور غریب قوموں کے افراد کی نفسیات سامنے لائی گئی ہے۔ تھرڈ ورلڈ گرل سوچنے پہ مجبور کرتی ہے نظم کی پیشکش علامتی ہے اور اس کا پیغام ناظر تک واضح ہے۔ باقی کہانیاں بھی کہانی کار کی سوجھ بوجھ اور معاشرت کے شعور کی گواہ ہیں۔ رضیہ نے چھوٹی چھوٹی تصویریں بنائی ہیں مگر تصویریں صحیح ہیں۔ سچی اور اچھی ہیں، قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔

یہ قطعی مبالغہ نہیں اگر میں کہوں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگریزی ادب کے رومانک دور تک افسانہ وجود میں نہیں آیا تھا مگر ناول تھے جین آسٹن ڈیکنز اور مسز گیسکل

وغیرہ کے ناول اسی طرح کے ہیں جیسے رضیہ کی کہانیاں ہیں۔ انگریزی افسانے کا باوائے آدم ایڈگر ایلن پو ہے اور اس کی کہانیاں بھی اسی طرح کی ہیں جیسے رضیہ نے لکھی ہیں ہمارے ادب میں افسانے کا ارتقائی سفر ترقی پسند تحریک کا مرہون منت ہے جو 1930ء کے بعد وجود میں آئی اور متحرک ہوئی جب کہ امریکہ میں کہانیاں سادہ اور دلچسپ انیسویں صدی کی ابتداً سے ہی لکھی جا رہی تھیں جبکہ اردو میں بیسویں صدی کی ابتدا میں اس کی ابتدا ہوئی۔ نمایاں لکھنے والوں میں رسالہ عصمت کی مدیرہ نذر سجاد اور شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن میں سجاد حیدر یلدرم خود عبدالقادر اور کئی اور حضرات کہانیاں لکھتے تھے جس کو Essay اور مضمون کی درمیانی صنف شامل کیا جاتا۔ چارلس لیمب کے ایسے لوگوں کو یاد ہوں گے۔

مخزن اور سہیلی امرتسر کا ایک پرچہ والد صاحب کے رکارڈ میں رکھے تھے اس کی چند کہانیاں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ وہ بھی اسی طرح کی تھیں۔ افسانے اور ناول کی طرز تحریر میں ایک انقلاب۔ جوزیف کونریڈ کی کتاب لارڈ جم سے آیا جو 1900ء میں شائع ہوئی۔ اور جس میں تاریخ۔ فلسفہ نفسیات نسل پرستی۔ سب کچھ تھا مگر طرز نگارش جدید اور دلکش تھا نہیں معلوم کہ جوزیف کونڑید کی کتاب پڑھ کر یا خود بخود آئیرش ناول نگار جیمز جوائیس نے portrait of an artist as a young man یولیسس اور کے بعد کئی اور ناول لکھ کر ادبی دنیا میں دھوم مچا دی خواتین میں ورجینیا ولف نے نئے انداز سے انقلاب برپا کیا اور ان دونوں عظیم لکھنے والوں کی عظمت اردو کی ناول نگار خاتون میں نمایاں ہوئی یعنی قرۃ العین حیدر ہیں جہاں ان کی کم عمری کی کتابیں۔ میرے بھی صنم خانے اور سفینہ غم دل ورجینیا ولف کے ناول لائیٹ ہاؤس کی طرح ہیں وہاں ان کی عظیم کتاب جس میں ہزار صفحے ہیں اور جو چار ہزار برس کی مدت کا احاطہ کرتی یعنی آگ کا دریا۔ گردش رنگ چمن۔ آخر شب کے ہم سفر وہ جیمز جوائیس کے ناولوں کی طرح ہیں جبکہ آخری کتاب چاندنی بیگم اور افسانوی ادب میں سادگی اور پرکاری میں مثالی تحریر ہے۔ ان سب کا تذکرہ کرنے کا مطلب صرف یہ بتانا ہے کہ پوپ کہانی کو ایک انوکھی طرز یا صنف کے طور پہ ادب میں پیش کرنا گاؤ دم ترقی ہے۔

اچھے ناول لکھے جائیں افسانوی ادب لکھنے والوں کو اس طرح دھیان دینا چاہیے تاکہ اپنی ذہنی قوتیں اردو کے ارتقا میں استعمال ہوں۔ نہ کہ اچھے بھلے لکھنے والوں کو دوسطری کہانی لکھنے پہ آمادہ کیا جائے جس میں ذات کے مسائل نہیں سما سکتے' کائنات کے کیا آئیں گے۔ اور دو سطر ہی لکھنا ہے تو غزل کا ایک شعر کیا برا ہے۔ شاہنامے میں دیکھئے فردوسی مملکت میں ایک سیاسی وفد کی آمد کو اور سیاسی گفتگو کو کیسے لکھتا ہے چند لفظوں میں کہتا ہے...... نشستند۔ و گفتند۔ و برخواستند۔

کوئی چیز ایجاد کرنے میں کوئی حرج نہیں نہ ہی روایت سے بغاوت کوئی بری بات ہے لیکن ایجاد ہماری موجودہ ترقی پہ اضافہ ہونا چاہیے ہمارا اقدام پوری صحت مندی کے ساتھ تعمیری ہونا چاہیے۔ نہ کہ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔

اب آخر میں میں صرف ایک ضروری بات اور کہنا چاہوں گی۔ وہ یہ پہلے کہانی کی تعریف تو آپ نے سن لی۔ لیکن وہ سب افسانوی ادب پندرہویں صدی میں ہنری فیلڈنگ سے شروع ہوا۔ جن کو ناول۔ طویل ناول مختصر ناول جیسے گڈبای، مسٹر چپس بھی شامل ہے۔ طویل ناول جیسے۔ ای۔ ایم فورسٹر نے لکھا پھر بیسویں صدی کے دیوقامت کونریڈ...... ہنری جیمز، جیمز جوائس، ورجینیا ولف اور پھر مختصر افسانے طویل افسانے بقول عسکری صاحب کے طویل مختصر افسانے ان کی کیا تعریف ہے جبکہ رضیہ اسماعیل کی کہانیاں افسانے قسم کی چیز نہیں۔

1۔......آغا...... پراسراریت......رازداری، تجسس، الجھنیں، کشمکش، خوشی غم

2۔مسائل......اور کردار کیسے ان مسائل میں الجھے۔ کیونکر الجھے۔ اور ان پہ اس کا عمل ردعمل کیا ہوا اور آخیر میں کیسے ان سے باہر آئے۔

3۔کہانی میں کرداروں کو کشمکش اور تصادم کا سامنا کیسے کرنا پڑا؟ اور تصادم کس نوعیت کا تھا؟ کشمکش کس طرح سامنے آئی؟

4۔پیدا شدہ کشمکش میں کردار ایک دوسرے سے رابطے اور جذباتی رشتوں، محبت،

نفرت، خوشی، غم، الجھنوں، فکروں، مصیبتوں سے کیسے گزرے؟ کیسے کتھارسس واقع ہوا؟ کیا آخر میں کردار کامیاب ہوئے یا مر گئے۔

5۔کیا واقعات اور انسانی نفسیات کو تاریخ کی صورت منجمد کر دیا گیا۔

6۔کہانی کی روح کی طرح جو چیز کہانی کے تمام حصوں کو مضبوطی سے باندھے رکھتی یعنی پلاٹ مضبوط ہے؟

7۔کہانی کی ترتیب کرداروں کے عمل، ردعمل سوچ وسوالات کے جوابات چست مکالموں کے ذریعے واضح کیا گیا؟

8۔ناول یا کہانی میں کتنی پرتیں ہیں؟۔ اور ان میں زیرسطح کتنے پیغامات ہیں؟۔ اشارے کنائے علامات عام فہم ہیں یا خواص کے لیے ہیں اعلامات انفرادی ہیں؟ کہانی عروج تک پھیلا کر پھر اس نے کیسے سمیٹا۔ ناول کے شروع میں اٹھائے گئے تمام سوالات کے جوابات مل گئے؟ کیا تمام کردار انجام تک پہنچ گئے اور قاری مسرت کے ساتھ سوچ پہ مجبور ہوا۔ آج کی کامیاب کہانی ایسی ہونی چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کی ''آدھی چادر''

سلمیٰ اعوان

لاہور

رضیہ اسماعیل اتنی متنوّع صفات کی حامل شخصیت ہیں کہ رشک آتا ہے۔شاعری کا میدان ہو۔اس میں جھنڈے گاڑے بیٹھی ہیں۔پانچ شعری مجموعے اپنا آپ منوا کر مزید ایک نئے اضافے سے خوشبو، گلاب، کانٹے کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔

میری اب تک کی اس خوبصورت شاعرہ سے شناسائی ادبی رسائل میں چھپنے والی اس کی غزلوں، نظموں اور یا پھر اس کی ''پوپ کہانی'' کے حوالے سے تھی۔ادب کی اس صنف کے آغاز اور اس کے بانی پر اس کے تحقیقی مضمون نے جس انداز میں بحث و مباحثے کے دروازے کھولے اور جس سے رسائل میں ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہوا۔سچی بات ہے مجھے یہ سلسلہ اچھا لگا تھا۔یوں میں اس کے شعروں کی فکری گہرائی اور اس کے شعر گوئی میں تنوع کی مداح تو تھی ہی مگر اس کی کلیات نے میرے اوپر بہت سی مزید پرتوں کو وا کیا۔اس کے اندر کی سچائی اور بے باکی جس طرح اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔اس کے کلام کی نغمگی اس میں ٹھاٹھیں مارتی غنایت ایک طرف اگر اس کا حسن بڑھاتی ہے تو وہیں اس کے اندر کے دکھ اس کے لفظوں کے راستوں سے باہر آتے ہیں اور آپ کو افسردہ کرتے ہیں۔

تاہم مجھے اس کے جس پہلو پر کچھ کہنا اور لکھنا ہے وہ اس کی نئی افسانوں کی کتاب ''آدھی چادر'' سے ہے۔مسودے کے مطالعہ سے احساس ہوا کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہی

نہیں بلکہ اسے سلیقے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہے۔''آدھی چادر'' اِس مجموعے کی مرکزی کہانی جہاں وہ پاکستان کی کٹی پھٹی تقسیم پر نوحہ خواں ہے۔مجھے حیرت ہے کہ ہم پاکستانیوں خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بھی اُن حقائق سے آگاہ نہیں جن پر اس کی کہانی نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ جا بجا کرب اور دکھ کا اظہار بھی کرتی ہے۔

''ہرنام داس'' بھی تقسیم کے المیے میں گندھی کہانی ہے۔ایک حساس بچی جو ہرنام داس کی بڑی سی حویلی کے دروازوں، کھڑکیوں، اُن کمروں میں دھرے برتنوں، فرنیچر، اُس گھر کی وسعت اور کھڑکیوں سے باتیں کرتی ہے۔جس کے اندر ایک اسرار پھیلا ہوا ہے جو احساسات کی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے کہانی کو بڑا منطقی انجام دیتا ہے۔دراصل یہ اس کا سفر ہے۔اس ناسٹلجیا کے دُکھوں کا جس میں اس نے اپنا بچپن گزارا۔جس کی تلخ یادیں اس کی یادداشتوں میں کسی خزانے کی طرح پڑی تھیں۔جنہیں وہ اب ایک ایک کر کے کہانیوں کی بُنت میں بن رہی ہے۔

''چیچا وطنی'' اُن کی ایسی ہی ایک اور اثر انگیز کہانی ہے۔دو عورتوں کی محبت کا مرکز واحد مرد۔دو عورتیں ایک خوبصورتی کی انتہاؤں پر اور دوسری قبولیت سے بھی نچلے درجے پر۔کیا مقناطیسی چیز تھی جس نے مرد کو جکڑ لیا۔کہانی میں بکھرا تجسس آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے مگر کہانی کہنے کے انداز کی دل کشی آپ کو روکتی ہے۔موت سے متاثر ماحول کی عکاسی ایک سوگوار موج کی طرح آپ کو اپنے ساتھ بہاتے ہوئے اس کے رنگوں کا آشکارہ کرتی ہے۔

ذرا دیکھئیے۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔
نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔
نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔
نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے راہ تک رہے تھے۔

گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔

ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔

آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔

چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سرزمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔

پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطمہ جٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

''دیوار گریہ'' بھی ایک خوبصورت دردانگیز کہانی ہے۔معاشرے کی جہالت ،مردانہ استحصال،عورت کے تحفظ کی جبلّی خواہش اوراس کے حصول میں پے در پے دھوکوں سے بغل گیری۔

رضیہ کی کہانیوں کی زبان سادہ، اسلوب خوبصورت، موضوعات میرے آپ کے معاشرے کے دُکھ،اس کی کجیاں،اس کے رویّے سبھی زیرِتحریر آتے ہیں۔وہ پراثر لکھنے پر قادر ہیں۔

''کیہ جانان میں کون''ایک اور بے حد اثر انگیز کہانی کہہ لیجئے یا ایک ملاقات آپ کی مرضی۔ رضیہ نے کردار کو براہ راست اس کا حقیقی نام دینے سے پوری رازداری سے کام لیا اور صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں جیسی کیفیت پیدا کرنے کا تاثر قائم کیا۔مگر جاننے والے بھی تو جانتے ہیں۔تاہم یہ ایک بھرپور تاثر چھوڑنے والی تحریر ہے۔جو آپ کو ملول کرتی ہے۔اُن دکھوں سے آشنا کرتی ہے جو خدا کی اِس تخلیق کو نصیب ہوتے ہیں۔

رضیہ کے لئے دعا گو ہوں۔اُن کا یہ فنّی سفر جاری رہے۔ایک وسیع دُنیا اُن کے حصار میں رہتی ہے۔امید ہے کہ وہ مزید کہانیوں سے ہمیں ان کرداروں سے ملواتی رہیں گی جو اُنہیں لکھنے پر اُکساتے ہیں۔

''دھیان کا روشن چراغ'' رضیہ اسماعیل

پروین سجل

لاہور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے ماہنامہ ''لیڈی رپورٹ'' لاہور شروع کیا تھا تو ادیبوں،شعراءاکرام کی طرف سے اکثر ادبی کتب برائے تبصرہ آیا کرتی تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ''چاند میں چڑیلیں'' اور ''میں عورت ہوں'' کسی پروگرام میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے مجھے دی، جس پر معمول کے مطابق تبصرہ لگ گیا یہ بات کوئی 2001ء کی ہے۔ پھر ایک دو مرتبہ کسی مشاعرے میں ان کی شاعری سننے کا موقع بھی ملا......اس کے بعد طویل عرصہ زماں اور روز وشب کے ان گنت شمار کے بعد ڈاکٹر رضیہ اسماعیل سے ملاقات ہوئی تو بے ساختہ خوشی کے ساتھ مقام حیرت اپنی جگہ......مگر مزاج کو خوشی کا کیف نہال کر گیا اور ایسا لگا کہ وہ کسی برگد تلے اپنی عمر کا چلہ کاٹ کر آئی ہیں، گیان نے ان کے اورے کو اک عجب شعوری رنگ دے رکھا ہے کہ ان کی شخصیت...... جو ''خوشبو، گلاب، کانٹے مختلف شعری مجموعوں پر مشتمل اپنی سیر حاصل ضخامت میں نہ جانے کتنی عمروں کے دکھ ساتھ لیے جی رہی ہے...... لہٰذا......اس موقع پر حافظ شیرازی کا یہ شعر بھی خوب رہا کہ:

حافظ آراستہ کن بزم و بگو واعظ را
کہ ببین مجلسم و ترک سر منبر گیر

ترجمہ: اے حافظ مجلس سجا، اور واعظ سے کہہ دے کہ میری مجلس دیکھ اور منبر چھوڑ دے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کا معاشرے میں عورت کے ساتھ امتیاز سلوک پر ایک توانا آواز کے ساتھ حوالہ سامنے آیا، یہ معتبر حوالہ جس کے سر پر ایسے ہی ہما کے بال و پر کا پرچم کشا نہیں ہوا......اس کے لیے شاعرہ نے سماج کے استحصالی رویوں پر قلم کو روشنائی کے طور پر اپنے عمر بھر کے رتجگوں کا لہو پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری جہات غزل، نظم، ماہیے اور دوہے یعنی سبھی اصناف سخن......عورت کے دکھوں پر سینہ کوبی......نوحہ گری......کربلائی صورت میں نہ ختم ہون والی اعزاداری ہے۔

خاص طور پر شاعرہ کے ہاں صنف نظم اور نثر میں اس کی جاں پر اترنے والے احساسی عذاب کسی بسملی جاں کنی سے کم نہیں، ویسے بھی حقیقت قریں ہے کہ نظم کا تخیل روح کے غباری ہیولوں سے دل پذیر اثر انگیزی لیتا ہے جب کہ نثری ہیئت میں بظاہر اظہار کا احاطہ وسعت اختیاری کے ساتھ اپنے بیانیے میں قاری تک بات پہچانے کی حد تک تو بجا ہے مگر اس میں نظم جیسی کوئی غایت ملحوظ خاطر نہیں ٹھہری گو کہ لکھنے والے کی طبع پر منحصر ہے کہ وہ نثر کو بھی چاہے تو حسی رعنائی اور منطقی اسلوب دے سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اسی پہلو نے نثری نظم کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

یہ تو تخلیق کے زمرے میں ایک حوالہ ہے جب کہ سچ تو یہ ہے......کہ شاعرہ کی ذات کا گیان اسی اضافی مراقباتی حال کا حالیہ بیان ہے اور یہ ظہوری اظہار ایسے ہی نہیں ملا کرتا، اس کے لیے منازل ذات کو سفر درکار ہوتا ہے جیسے کہ رضیہ اسماعیل کو ڈاکٹر بننے کے لیے میسر آیا۔ دیکھا جائے تو حقیقت یہی ہے کہ ہم اپنے پاؤں کی مسافتی دھول کیسے پلو میں باندھے رکھتے ہیں یا کیسے پاؤں دھو کر اس پانی سے جاں کا وضو کرتے ہیں اور چشم آشوب میں آنکھیں دھوتے ہیں یہ نسخہ چشم آشوبی ڈاکٹر رضیہ اسماعیل خوب جانتی ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں سے زمانے بولتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو...... میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے شعری مجموعہ احساس کی خوشبو ان نظموں کے عنوانات کو بتدریج نظم کی صورت پیش کرتی ہوں جو انہوں نے انگلش میں بھی منتقل کی ہیں اور دیکھے کیسے یہ عنوانات ایک اور نظم کی تسبیح بن کر ذکر

جاں کر رہے ہیں جیسے کہ:

پھر پوچھیں گے......
سچ......خوشبو سے کیا کہوں گی
قید تنہائی......خواب گر
احساس ذات......قبر سے سوال
عقوبت خانے......خراج
مدر ٹریسا......خوش قسمت
چاندنی......جاگیر
متلاشی آنکھیں......ہوا کا جھونکا
بونے......کتبے
سورج کی موت......دھنک رنگ
بدن میں آنکھ......سرگوشی
روح کا جشن......جل تھل
آدمی عورت......بند کواڑ
ستارے......دریدہ بدن
جدائی......اُترن
تیسری اولاد......عورت کا گناہ
بدن سو گیا......قتل کا لائسنس
بیوہ......اگر
یک طرفہ محبتیں......دردزہ
غوطہ خور......
میں کون ہوں......؟

چوتھا موسم......

مجھے بولنا کیوں سکھایا......

اُجالا...... پورا خواب

شاعرہ کی ذات پر ان نظموں میں حقائق اور سچ پر مبنی جونزولی کیفیت محسوس کی جاتی ہے جن کی شعری سطح ایک خاص اپچ کی حامل ہے۔ تخلیقی وفور اپنا بھرپور اظہار لیے ہوئے ہے، سفری آبلہ پائی میں بھی شاعرہ کے پاؤں ڈگمائے نہیں اور نہ ہی تھکن، کم مائیگی کا احساس قریب آنے دیا بلکہ شاعرہ اپنی ذات سے نکل کر لمحہ بہ لمحہ کائناتی سفر کی صعوبتیں اختیار کرتی ہے اور ایسے میں...... پھر سخن گوئی کی روایات میں رہتے ہوئے معاشرے کو جس طرح سے آئینہ دکھایا وہ انتہائی متفکرانہ پہلو ہے جیسے کہ نظم ''بخیل'' میں دیکھئے:

''بخیل''

مرد......

جو اپنی بیٹی سے بھی

محبت کے اظہار میں بخیل ہوتا ہے

یہ کیسے ممکن ہے

کسی دوسری عورت کو

بیٹی بنالے......!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے ہاں سچائی ابہام کے ابرقی غلاف میں نہیں بلکہ روزِ روشن کی طرح شہود کی دیوار پر کھونٹی سے لٹکی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کہ قادرِ مطلق کی جانب سے جس عورت کو تخلیق انساں کے لے منتخب کیا گیا، یعنی پیغمبر سے لے کر خاص و عام کو جنم دینے والی اس عورت کے ساتھ معاشرتی اخلاقی رویے اس قدر متشدد کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی یہ عورت اپنے زخموں کی بخیہ گری کرتی نظر آتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ شاعرہ ان زخموں کا نمک کتنی تلخی سے چاٹے ہوئے ہے اسی لیے......اس کا یہ ماہیا دیکھئے جو جوالامکھی کے اسباب

کا مظہر نہیں تو کیا ہے؟ ایک طرح سے جگ بیتی اور آپ بیتی کا حال بیان کر رہا ہے کہ:

کمہار کا آوا ہے

پکتا رہتا ہے

میرے دل میں جولا وا ہے

یقیناً ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی پُرعزم ذات اتنی تیرہ شبی کی ہیبت میں بھی دھیان کا روشن چراغ جلائے مسلسل آگے بڑھ رہی ہے، کیونکہ......آخر میں نظم ''بونے'' جس نے ظاہری اور باطنی قدوقامت کی حقیقت کچھ اس طرح بیان کی یعنی......ایسا سچ جس میں کوئی شائبہ نہیں لہٰذا......اپنے اپنے مشاہدات اور تجربات کے ساتھ اجازت:

''بونے''

کوہ قاف میں جا کر

بونے......

دیکھنے کی مجھے بہت خواہش تھی

دنیا میں......

قد آور لوگوں کو قریب سے دیکھا

میری خواہش کی تکمیل ہوگئی!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کلیات ''خوشبو، گلاب کانٹے''

ڈاکٹر فوزیہ تبسم

میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو ان کی کلیات کی اشاعت پر جس کا عنوان ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ہے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ یہ ان کے پانچوں مجموعہ کلام پر محیط ہے انہوں نے بجا طور پر اس کا عنوان ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' رکھا ہے کیونکہ اس میں جذبوں کی خوشبو بھی ہے محبتوں کے گلاب بھی ہیں اور سماجی دکھوں کے کانٹے بھی جا بجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے نا صرف غزلوں نظموں بلکہ دوہے اور ماہیوں کی اصناف میں بھی شاعری کی ہے اور بہت خوبصورت کی ہے۔

ان کی غزلوں کے کچھ رنگ دیکھئے:

اک پتا ٹوٹ کے آیا ہے
پیغام خزاں کا لایا ہے
ہر سپنہ آنکھ سے بہہ نکلا
یہ کیسا آنسو آیا ہے
دیوار بنا کر تو دیکھو
ہر دھوپ میں پنہاں سایا ہے

....

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں مجھ میں
میں بارش ہوں برسنا چاہتی ہوں

ان کے اشعار صاف رواں اور دلچسپ ہیں ان میں عصر حاضر پر کچھ طنز ہے کچھ تنقید زندگی کا درد بھی ہے اور اپنے احساس کی لطافت و نزاکت بھی یہ دردمندی اور پاکیزگی کا امتزاج ایک چونکے ہوئے شعور اور سُلجھی ہوئی طبیعت کی غماز ہے۔ ان کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

زخموں سے شہر دل کو سجاتی چلی گئی
میں سلسلے وفا کے نبھاتی چلی گئی

ڈاکٹر رضیہ کی فکر میں انفرادیت ہے ادبی سچائیاں ہیں۔ وقت کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات کو فن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب اس نے بلایا ہے تو جانا ہی پڑے گا
بے نام سا رشتہ ہے نبھانا ہی پڑے گا
آنکھیں میری دیواریں تو آنسو ہیں دریچے
اب درد کا اک شہر بسانا ہی پڑے گا

کیا بات سنائیں لوگوں کو ہم سب کی کہانی ایک سی ہے
اب کس کس بات کو یاد کریں ہر بات پرانی ایک سی ہے
ہر مفلس کو تو روشن دن بھی شام غریباں لگتا ہے
زرداروں کی زر والوں کی ہر شام سہانی ایک سی ہے

ان کی نظمیں زندگی کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتی ہیں خاص طور پر ان کی نظموں ___ تحریر، آغاز نو، میں تم سے محبت کرتا ہوں، بیٹی، خزاں کی زد میں یادیں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

ایک نظم ملاحظہ ہو جس کا عنوان ہے

''پھر پوچھیں گے''

گفتار کو ہونٹوں سے
رفتار کو پاؤں سے
آندھی کو بلاؤں سے
سورج کو ضیاؤں سے
بادل کو گھٹاؤں سے
خوشبو کو ہواؤں سے
تم کر کے جدا دیکھو
پھر پوچھیں گے ہم تم سے
کیا حال تمہارا ہے

ہماری خواتین شاعرات میں زیادہ تر غزلیں یا نظمیں لکھنے کا رواج ہے لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحبہ نے دوہے بھی لکھے اور اس صنف میں بھی خواتین کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

ان کے چند دوہے ملاحظہ ہوں:

آدم کو جنت سے نکالا کیسا تھا یہ نائک
حشر تلک اب اس جنت کا بند رہے گا پھاٹک

جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی بانگیں کتنی ڈھیلی کر دیں

تیری عبادت کریں فرشتے اور انہیں کیا کام
سارے کام تو ہم کو سونپے پھر بھی ہم بدنام

پریت کے نام لگا بیٹھی ہوں جیون، جاگ، سویرا
پیار میں ایسی سدھ بدھ کھوئی، کیا تیرا کیا میرا

ڈاکٹر رضیہ نے اس طرح ماہیا لکھ کر بھی اپنی شاعری کے کینوس کو مزید وسیع کیا ہے۔

انہوں نے حیدر قریشی اور سید حنا کے ماہیوں سے متاثر ہو کر ماہیا نگاری شروع کی اور یوں اس میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ان کے ماہیوں میں پردیسی ہونے کا غم بھی جھلکتا ہے

باغوں میں جھولے ہیں
دیس کی یادیں تو
صحرا میں بگولے ہیں

....

بڑے اچھے فائٹر ہیں
اک دن مانو گے
یو کے کے رائٹر ہیں

ان کی شاعری میں عصر حاضر کے زخموں کی گواہی ہے اور روح کو پگھلانے والے احساسات بھی ہیں۔

کڑوے ہیں سکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دکھ ماہیا

میں اُمید کرتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ کی کلیات کو ادبی حلقوں اور قارعین میں بھی پذیرائی حاصل ہوگی اور ان کی شاعری کی خوشبو ہمیں دیر تک مہکاتی رہے گی اس کے ساتھ میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر صاحبہ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں اور اجازت چاہتی ہوں۔شکریہ۔

(4اپریل2012ءڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب کی رونمائی پر لکھا گیا)

تبصرہ

زاہد مسعود

لاہور

''کہانی بول پڑتی ہے''(پوپ کہانیاں)
مصنفہ:۔ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
ناشر:۔ بک ہوم،مزنگ روڈ لاہور
صفحات:۔136
قیمت:7پونڈ،12ڈالراور300پاکستانی روپے
مبصر:۔زاہد مسعود،لاہور

برطانیہ(برمنگم) میں مقیم معروف شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے شعری کلیات''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کے بعد اب ان کی دوسری نثری کاوش پوپ کہانیوں کا مجموعہ اشاعت کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آ چکا ہے۔اس سے قبل 2000ء میں ان کا طنزومزاح پر مبنی انشائیوں کا مجموعہ''چاند میں چڑیلیں'' شائع ہو کر قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔

ادھر کچھ عرصے سے اردو ادب کے ایوانوں اور بالخصوص برطانیہ میں''پوپ کہانی'' کی بازگشت سنائی دے رہی ہے مگر تا حال پوپ کہانی کی خدوخال اوراس کی ہیئت پوری طرح واضح ہو کر سامنے نہیں آسکی ہے۔

مصنفہ نے پوپ کہانی پر تحقیق کر کے مختلف حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ پوپ

کہانی کوئی نئی نثری صنف نہیں ہے بلکہ امریکی ادب میں پوپ کہانی بڑے واضح خدوخال اور ہیئت کے ساتھ عرصہ دراز سے لکھی جا رہی ہے اور اسے امریکی ادب میں ایک نہایت پختہ نثری صنف کی حیثیت حاصل ہے۔مصنفہ نے امریکی پوپ رائٹر سے رابطے کرنے کے بعد اس کی چند پوپ کہانیوں کے اردو تراجم بھی کتاب میں شامل کئے ہیں تاکہ قارئین کو امریکی ادب مں لکھی جانے والی پوپ کہانی کی موجودہ صورت سے آگہی حاصل ہو سکے۔ جس سے اردو پوپ کہانی لکھنے والے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

پوپ کہانی کو خالص مشرقی قالب میں ڈھالنے کے لیے مصنفہ نے کئی تجاویز بھی پیش کی ہیں جن پر مزید غوروخوص کی ضرورت ہے۔

دیدہ زیب سرورق کہانی کی ارتقائی منازل کی نشاندہی بڑی خوبصورتی سے کر رہا ہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے امریکن پوپ کہانی کاروں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق بارہ پوپ کہانیاں خود بھی لکھی ہیں۔جنہیں وہ تجرباتی کہانیوں کا نام دیتی ہیں۔مزید برآں کہ ''تجربے میں بہتری اور نکھار کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔''

یہ پُراثر کہانیاں برطانیہ میں ایشیائی ممالک سے آ کر آباد ہونے والی خواتین کے شب و روز کی کشمکش بہت خوبصورتی سے بیان کر کے برطانیہ میں ثقافتی ٹکراؤ کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

کتاب میں ممتاز ادیب،محقق،نقاداوردانشور ڈاکٹر خواجہ زکریا اور جرمنی میں مقیم نامور شاعر،ادیب اور دانشور حیدر قریشی کے تبصرے اور آراء شامل ہیں۔

برطانیہ میں پوپ کہانی پر شروع ہونے والی ابتدائی بحث کو مصنفہ نے آگے بڑھا کر اردو ادب میں بنیادی نوعیت کا کام کرتے ہوئے ایک علمی اورادبی بحث کا آغاز کیا ہے جس پر وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

تبصرہ

محمد طارق علی

نام کتاب: آدھی چادر
مصنفہ:۔ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
مبصر:۔محمد طارق علی

ایک بہت ٹیلنٹیڈ پاکستانی رائٹر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل چالیس سال سے زائد عرصہ سے برمنگھم (یو کے) میں مقیم ہیں۔معروف شاعرہ اور ادیبہ ہونے کے علاوہ وہ ایک ہر دل عزیز سماجی کارکن اور حقوق نسواں کی علمبردار بھی ہیں۔ برمنگھم میں ایک ادبی تنظیم ''آگہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔ وہ پچھلے بیس برس سے مختلف سماجی اور ثقافتی مسائل پر بھرپور انداز میں سوشل اور کمیونٹی ورک کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ملکہ برطانیہ کی سالگرہ کے موقع پر ایم بی ای (ممبر آف برٹش ایمپائر) کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انہیں بہترین کمیونٹی ورک پر ملینیم کمیشن کی تاحیات فیلوشپ بھی دی گئی۔خواتین کے مختلف ثقافتی اور سماجی مسائل کی نشاندہی ان کا خصوصی موضوع ہے۔اس کے علاوہ وہ بہت سی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ اور برطانیہ سے باہر مختلف ادبی رسالوں کی مدیرہ، سرپرست اور مشیر بھی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اتنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ اپنے وطن کی مٹی سے جڑی ہیں۔ وہ پچھلی صدی کی ستر کی دہائی کے شروع میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کرنے کے بعد برمنگھم (یو کے) چلی گئی تھیں۔ وہاں اعلیٰ تعلیم

حاصل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری پائی، ملازمتیں بھی کیں لیکن بالآخر سوشل ورک کو مستقلاً اپنا لیا۔سوشل ورک کا تعلق بنیادی طور پر فیلڈ سے ہوتا ہے لیکن انہوں نے قلم بھی مضبوطی سے تھاما ہوا ہے۔ان کی شعری ونثری تخلیقات مختلف بین الاقوامی موضوعات پر مبنی ہونے کے علاوہ پاکستانی معاشرت کے زمینی حقائق کی بھی عکاس ہوتی ہیں۔ان کی مجموعی تخلیقات کی بات کی جائے تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ بیس تصنیفات و تالیفات (بشمول ''آگہی'' ویب سائٹ اور تین زیرِ طبع کتابیں) اس مصروف شخصیت کے کریڈٹ پر ہیں۔ زیر نظر کتاب حال ہی میں چھپی ہے۔اس میں کل گیارہ افسانے ہیں، زمینی حقائق کے بیجوں سے نکلے ہوئے۔پیش لفظ میں مصنفہ کہتی ہیں: ''مجھے اپنے افسانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا کیونکہ یہ محض افسانے نہیں ہیں، میرے اندر کا شور ہے جس نے بہت عرصہ سے میرے اندر ایک اودھم مچایا ہوا تھا۔کاغذی پیراہن سے لپٹ کر ممکن ہے اسے کچھ قرار آ گیا ہو...... جب تک یہ کہانیاں باہر نہ آتیں، دوسری ان گنت کہانیوں کو راستہ ملنا دشوار تھا۔'' تاہم اصل بات یہ ہے کہ محترمہ کا تحریری سفر اچھے خاصے طویل زمانوں پر پھیلے تجربوں کے رنگوں میں ڈھلا ہوا ہے۔ان کا تخلیقی اُپج بہت گہرا ہے۔''آدھی چادر'' پڑھنے کے لائق ہے۔ بہت سے مقامی و بیرونی گم نام چہرے نقاب ہٹا کر اپنے حقائق سامنے لاتے ہیں۔ بقول حیدر قریشی (جرمنی) ''ختم کئے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا (کیونکہ) افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں، عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرائیت کر جاتی ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ رضیہ اسماعیل کی سی فنی مہارت طویل ریاضت کے بغیر ممکن نہیں۔ کتاب کے کل صفحات دو سو چالیس، خوبصورت گرد پوش عمدہ کاغذ اور چھپائی اور قیمت صرف چھ سو روپے۔ پاکستان میں ملنے کا پتہ: میسرز بک ہوم، بک سٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب ''خوشبو،گلاب،کانٹے'' پہ لطیف راز کے تاثرات

لطیف راز

یو۔کے

میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب خوشبو گلاب اور کانٹے پہ ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی تو مجھے کتاب کے اوراق میں پردہ نشین ایک انتہائی حساس دیدہ ور چھپا نظر آیا مجھے افسوس ہوا کہ مجھے بھی انگلستان میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے مگر رضیہ اسماعیل کو ملنے اور پڑھے جاننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ تو ماہنامہ ساحل میں ان کی تحریر پوپ کہانی کے متعلق نظر نواز ہوئی تو راز کھلا کہ برمنگھم میں کوئی دیدہ ور خاتون ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بھی ہے ان کی تحریر دیکھی تو غائبانہ تعارف ہوا مجھے تو یہ تک بھی معلوم نہیں تھا کہ رضیہ اسماعیل صاحبہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں یا ڈاکٹر آف لٹریچر ہیں میں گزشتہ تیرہ سال سے پاکستان سے شائع ہونے والے ماہنامہ الحمراء کا قاری ہوں وہ بھی اتفاق سے ہمارے لور پول یونیورسٹی میں دو سٹورز ہیں جو میں نے 1982ء میں سول سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد بنالئے تھے جن کی وجہ سے میرا ہمیشہ یونیورسٹی سے تعلق رہا ویسے بھی ہر نئے پاکستان سے آنے والے سٹوڈنٹ کا ہمارا سٹور ملتان نیوز مرکز نگاہ تھا میرے پاس لندن سے ایک ریٹائرڈ ٹیچر ایک دن تشریف لائے جس کے بیٹے کو لور پول میں ہی جاب ملی تھی نقوی صاحب اور ان کی شریک حیات اپنے بیٹے اور بہو کو لور پول چھوڑنے آئے تھے پھر ان کی روزانہ کی روٹین ہو گئی آتے اور پھر چائے کی ایک پیالی پہ ہماری گپ شپ ہو جاتی۔ ایک دن تشریف لائے تو فرمانے لگے راز صاحب

ہمارے مکان پہ پچھلے تین مہینے سے لاہور سے ایک میگزین الحمرا Miss Naqvi کے نام پہ آرہا ہے جو نام کی مماثلت کی وجہ سے ہمیں مل رہا ہے آپ لور پول میں پرانے پاکستانی ہیں اگر آپ مس نقوی کو جانتے ہوں تو یہ میگزین ان کو پہنچایا جا سکتا ہے میں نے نقوی صاحب سے کہا اگلی بار جب آپ تشریف لائیں تو وہ رسالہ ساتھ لیتے آنا پھر میں سکاٹ لینڈ یارڈ بنے کی سرتوڑ کوشش کروں گا اگلے دن نقوی صاحب الحمرا ساتھ لائے میں نے الحمرا کے ایڈیٹر شاہد علی خان کو فون کیا کہ یہ معاملہ معمہ بنا ہوا ہے آپ بتائیں رسالہ کس کو بھیجا جا رہا ہے عقدہ کھل گیا ان کے ایک لکھاری مشہور ادیب اشفاق نقوی کی صاحب زادی اسی سٹریٹ میں ان کے اگلے فلیٹ میں رہتی تھی ایڈریس پہ صرف نقوی لکھا ہونے کی وجہ سے پوسٹ میں ان کے لیٹر بکس میں Mail ڈراپ کر جاتا میں نے خاتون کا ایڈریس لے کر الحمراء ان تک پہنچا دیا جس میں اس کے والد اشفاق نقوی صاحب کی Autobiography قسط وار آرہی تھی شاہد علی خان نے میری ادائے دیوانگی سے خوش ہو کر مجھ سے میرا ڈریس مانگا اور مجھے اعزازی پرچہ بھیجنا شروع کر دیا اپنی بری عادت کے مطابق میں نے شاہد علی خان کو مفت خوری لگانے کی بجائے تین سال کی الحمرا کی پیشگی ادائیگی کر دی اس طرح سے میں الحمراء کا قاری بن گیا وہ شراکت آج تک چلی آرہی ہے جو خلوص کی وجہ سے برادرانہ ہو چکی ہے شاہد علی خان کے الحمرا نے مجھے مصور اقبال اسلم کمال سے ملایا جس کا میں ان دیکھا ان ملا بڑا بھائی بن گیا اسلم کی تحریر واقعات میں مسجد نبوی کی خطاطی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ مجھے اسے 219 اشعار پہ مشتمل ایک بددعا دینی پڑی جو بذات خود ایک شعر ہے۔

اسلم کمال دے رہا ہوں تم کو بددعا
عشق رسول پاک میں ہو جاؤ مبتلا

شاہد علی خان مولانا ظفر علی خان اور پروفیسر حمید احمد خان کے بھتیجے اور ولانا حامد علی خان کے صاحبزادے نکل آئے جن کا میں بچپن سے ہی مداح تھا حمید احمد خان میرے انگلش کے استاد بھی تھے اب رضیہ اسماعیل بھی جالندھری اور وزیر آبادی نکل آئی ہے مولانا

ظفر علی خان جہاں کے تھے انگلستان سے نکلنے والے رسائل میں سے کوئی ایسا رسالہ نہ تھا جو
میری ادبی تشنگی کو سیراب کرتا چونکہ رضیہ اسماعیل صاحبہ کی کوئی تخلیق میری نظر سے نہیں گزری
تھی اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان کی تخلیقات سے محروم رہا بریڈفورڈ کے شیخ
مقصود الٰہی صاحب نے اپنی راوی بند کرنے کے بعد ایک ادبی رسالہ سالنامے کے طور مخزن
جو علامہ اقبال کے زمانے میں شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکلتا تھا اور حفیظ جالندھری بھی
کبھی جس کے ایڈیٹر ہوتے تھے نکالنا شروع کیا تو اس میں کافی ان کے من پسند اور مطلب
کے ادیب شامل تھے میں اس کا Permanat خریدار تھا مگر ان کے میگزین میں مجھے رضیہ
اسماعیل کبھی نظر نہ آئی اس لیے میں اس نابغۂ روزگار شاعرہ ادیبہ اور افسانہ نگار سے متعارف
نہ ہو سکا اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس بینکر کو جس کو تنویر اختر کہتے تھے جس کے
ساحل نے مجھے پہلی بار رضیہ اسماعیل کی خبر دی یہ نہیں کہ رضیہ اسماعیل کو کوئی نہیں جانتا تھا یہ تو
صرف مری ہی لاعلمی لیا سمجھو یا میری ہی کم نصیبی تھی کہ میں ایک سلجھی ہوئی صاف ستھرا لکھنے
والی ادیبہ شاعرہ اور افسانہ نگار کو پڑھنے سے محروم رہا اب میں نے رضیہ اسماعیل کی تخلیق
خوشبو گلاب اور کانٹے پائی ہے تو کانٹے میں الجھ کے رہ گیا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں میرا
مطلب کہنے کا صرف یہ ہے کہ میں کتاب مذکورہ کے متعلق کچھ کہنا کہاں سے شروع کروں
کیونکہ ہر سطر اور ہر ورق کی ہر نظم تقاضا زن ہے کہ جاؤ نہ چھوڑ کے مجھے اب اس کتاب پہ میں
کیا تبصرہ کروں جس کی ہر سطر اور ہر شعر اس قابل ہے کہ مجھ جیسا ناقص العقل بھی اس کے
ایک ایک شعر پہ ایک ایک کتابچہ لکھ سکتا ہے مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطا بگوید میں
اگر ایک ایک شعر پہ کچھ کہنا چاہوں تو سفینہ چاہیے بحر بیکراں کے لیے سوچتا ہوں کوئی ایسی
ترکیب میرے ہاتھ آ جائے جو میں سینکڑوں اشعار کو تبصرے کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی
بجائے باقی اشعار اور افسانوں کو ناراض کئے بغیر اپنے محسوسات کی ایک عاجزانہ سی ترجمانی
کر دوں کارے مشکل است مگر میں کوشش کرنے کی کوشش کرتا ہوں میں چند حوالوں پہ اکتفا
کرنے کی کوشش کروں گا پوری دیگ کے چند دانے ہی بتا دیتے ہیں کہ دیگ کے اندر کیا

ہے اور اس کی Quality کیا ہے، اس لیے I will go for quality not for
quantity رضیہ اسماعیل کی شاعری کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اگر میں ان کی نثری
نگارشات پہ کچھ عرض کرلوں تو وہ بہتر ہوگا ورنہ وہ صنف Ignore ہو جائے گی، میں نے
جب رضیہ اسماعیل کا مقالہ ساحل میں پوپ کہانی پر پڑھا تو بہت متاثر ہوا مجھے رضیہ اسماعیل
کی تحقیق اور Research پہ داد دینی پڑی ہم نے بھی اپنے زمانہ طالب علمی میں پروفیسر
صادق سے اس بارے میں کافی پڑھا جو Short story اور Short essay تک محدود تھا
لیکن انگلستان میں جب کسی نامور نقاد اور ادیب نے پوپ کہانی کا موجد ہونے کا Claim
کیا تو رضیہ اسماعیل کو حقائق اور دلائل کا سہارا لے کر کلمہ حق کہنا ہی پڑا کہ پوپ کہانی کا موجد
کون ہے رضیہ اسماعیل کا موقف دلائل اور حقائق کی بنا پر مضبوط تھا اس لیے حق آیا اور باطل
کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا جسے کچھ لوگوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر اپنی مشکلات میں اضافہ
کر کے اسے اپنے لیے مفت کی سردردی بنا لیا ہے کہنے جو رضیہ اسماعیل نے اپنے اشعار میں
جو کچھ بھی کہا ہے اور جو کچھ بھی کہنے کی سعی فرمائی ہے اس کو اپنے احساس کے اوپر طاری
کرنے کے بعد ہی کچھ کہا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شاعرہ کے اپنے اشعار کے دل کی
دھڑکنوں کی آواز ہے جو حقائق کے اتنا قریب ہے کہ قاری کی سماعت کا تصور بھی اس سے
لطف اندوز ہو سکتا ہے ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ اس لیے رضیہ
اسماعیل کے ہاں آمد زیادہ اور آورد ذرا کم دکھائی دیتی ہے اس لیے اس کی کوئی تحریر بناوٹی
نہیں لگتی یہی وجہ ہے کہ رضیہ اسماعیل کی تحریریوں میں تصنع کم اور حقیقت زیادہ ہے یہی بات تو
رضیہ اسماعیل کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتی ہے اسی لیے اس کے منظوم اور نثری کلام میں
انفرادیت پائی جاتی ازادنظم میں بھی بہاؤ ہے میں چاہتا ہوں ان کی تحریریں سکول کے A
level & other educational levels کے اردو کورسز میں شامل کی جائیں جس پہ خدا
وندان درس و تدریس کی بذریعہ اپنے لوکل MPs توجہ دلانے کی ضرورت ہے رضیہ اسماعیل
نے بلاشبہ اردو ادب کے ہر شعبے میں جاں سوزی محنت اور ایمانداری سے ادیبانہ سپرٹ کے

ساتھ بے لوث و بے غرض خدمات انجام دی ہیں اور ہنوز دے رہی ہیں جن کا اعتراف کیا جانا چاہیے رضیہ اسماعیل کے کارہائے نمایاں قابل تقلید ہیں شاعر وقت کی آواز ہوتا ہے۔

مبتلائے درد کوئی جسم و روتی ہے
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

رضیہ اسماعیل کی نظم اور نثر میں مجھے وہ احساس نظر آیا جس کا ذکر علامہ نے اپنی منظوم شاعری میں کیا ہے رضیہ اسماعیل بھی اپنے کلام اور تحریروں سے معاشرے کی اصلاح کی خواہاں معلوم ہوتی ہے اس لیے اس نے ہر موضوع پہ کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے اس کے Vision میں مغربی تعلیم کی وسعت نظری بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لیکن اس نے اسے بے لگام نہیں ہونے دیا اس نے اپنے اجداد کی تعلیمات کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے بات کی ہے اپنے خیالات پہ پابندیاں نہیں لگائیں مگر انہیں بے لگام بھی نہیں ہونے دیا میں چاہتا تو اس کے اپنے اشعار سے کئی صفحات پر کر دیتا مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تا کہ میں اپنے محسوسات کے ساتھ زیادتی نہ کر جاؤں اور ان کی جگہ رضیہ اسماعیل کے لیے اپنے ہی بہت سے اشعار سنا کر خانہ پُری کر دوں چند اشعار کو اس لیے پیش کروں گا تا کہ قاری پہ میری خشک گفتاری بوجھل نہ ہو جائے اس لیے ذائقہ بدلنے کے لیے مجھے رضیہ اسماعیل کے اشعار کا سہارا لینا ہی پڑے گا چند اشعار کو میں رضیہ اسماعیل کے Notice میں پہلے ہی لا چکا ہوں وہ ایک معروضی تحریر تھی جسے میں نے پرنٹ ہونے کا اذن نہیں دیا تھا ویسے اس پہ پابندی بھی نہیں رضیہ اسماعیل اگر چاہے تو تھوڑی سی قطع و برید کے بعد اسے شائع بھی کیا جا سکتا ہے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس تحریر کے مندرجات کو دہرانے سے اجتناب کروں گا تا کہ میں کچھ مختلف اشعار کو بزم سخن میں پیش کر سکوں میرے پاس رضیہ اسماعیل کی بیاض کے اتنے اشعار ہیں کہ قاری کو تنگیِ داماں کا احساس ہونے لگے گا۔

میری راتیں ہیں کہ احساس پہ چلتی آری
میر صبحیں تو ہیں اب نور سے خالی ساری

عمر بھر دار پہ لٹکی ہوں تمہاری خاطر
اب تو مقتل میں ہے جانے کی تمہاری باری
خواب رستے میں ہی دم توڑ رہے ہیں اب تو
نیند آوارہ ہے کہ اب پھرتی ہے ماری ماری
رات آتی ہے تو پلکوں کو جلا دیتی ہے
آگ کا کھیل ہے اب آنکھ میں جاری و ساری
دل دھڑکتا ہے تو نبضیں بھی پھڑک اٹھتی ہیں
سانس رکتی ہے تو لگتا ہے ہماری باری

رضیہ اسماعیل کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے خیالات میں شریک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے پڑھنے والا اس کے تخیل کے ساتھ محوِ پرواز ہو کر اپنی چشم تصور سے مشاہدات سے لطف اندوز ہوتا ہے جو اس کی ادبی پیاس کو سیراب کرتے ہیں رضیہ اسماعیل نے بہت سے عنوانات پہ قلم اٹھایا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی کے واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں قاری کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے شاعرہ اس کے محسوسات کی ترجمانی کر رہی ہے اور وہ ان کے محسوسات کو زبان دے رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک عام عورت بن کر سوچتی ہے اس لیے کہ حقیقت دلنشیں ہوتی ہے افسانے نہیں ہوتے اس کے لیے وسیع مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے جو تخیل کو جلا بخشتی ہے اس کی نثر اور منظوم تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ رضیہ اسماعیل کا نالج اس کا راہبر اور معاون ہے مغربی تعلیم نے اس کے کلام کو وسعت نظری دے کر لبرل بنا دیا لیکن وہ تھوتھا چنا اور باجے گھنا کی مانند نہیں اس کی تحریر میں مشرقی شرم وحیات کا نور ہے جو اس کی بہت قیمتی اور قابل فخر میراث ہے جو قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی رضیہ اسماعیل کی نگارشات میں مقصدیت مستور ہے اس کا کلام یا وہ گوئیات کی بازی نہیں وہ ناپ تول کی بات کرتی ہے جو اس کی ذہنی بلوغت کی نشاندہی کرتا ہے میں یہ جنرل بات کر رہا ہوں جس میں نظم نثر افسانہ تمام قسم کی تحریر شامل ہیں ان صفات کے

اوصاف ہر ایک ادیب یا شاعر میں نہیں پائے جاتے اور یہ چیز بغیر لگن مطالعے کے حاصل نہیں ہوتی کافی جگہ محسوس ہوتا ہے وہ ایک ناصح کا کام بھی کر رہی ہے سوشل ورک بھی جاری ہے پھر اس میں تحریر کا وقت نکالنا بڑی بات ہے رضیہ اسماعیل کو معلوم ہے کچھ ہاتھ نہیں آتا بن آہِ سحر گاہی اس لیے وہ اس سے بھی غافل نہیں رہتی۔

بہتر ہے کہ تم وقت کی رفتار کو دیکھو
گر چاک گریباں ہو تو دستار کو دیکھو
شوریدہ سمندر ہے غضب ناک ہوائیں
طوفان بلاخیز ہے پتوار کو دیکھو

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی قوت محسوسات بڑی Strong ہے وہ ماں باپ کے مقام اور احترام کو مقدم سمجھتی ہے اس لیے وہ اپنی بچیوں کی صرف ماں نہیں بلکہ ان کی ایک سہیلی بن کے اس کی روزمرہ زندگی میں شامل ہے اور وہ ماں کے لیے بھی ایسے ہی جذبات رکھتی ہے۔

کہا ہر دم زمیں کی گود کیوں بے چین رہتی ہے
جواب آیا کہ ماں اولاد کے دکھ دل پہ سہتی ہے
کہا ممتا کے دم سے ہی زمانے میں اجالا ہے
جواب آیا کہ یہ ہستی ہمارے دل میں رہتی ہے
کہا دریا محبت کے کبھی سوکھے نہیں دیکھے
جاب آیا یہ وہ ندی ہے جو ہر وقت بہتی ہے
کہا جب ماں بچھڑ جائے تو کس دنیا میں جاتی ہے
جواب آیا کبھی کرنوں کبھی تاروں میں رہتی ہے
کہا جذبات کی لہروں کو دل میں کس طرح دیکھوں
جواب آیا کہ ممتا ہر سمندر میں ہی بہتی ہے

قطرے پہ گہر ہونے تک

آغا علی مزمل

دنیا کے اس چمن زار میں انسان ایک پھول کی طرح ہے جس کی زندگی خوشبو رنگ اور کانٹوں سے عبارت ہے۔

جو انسان اس دنیا کی رنگ و بوب میں کھو جاتا ہے تو اس کی اپنی خوشبو کھو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ رنگت بھی اڑ جاتی ہے اور اس کی زندگی میں سوائے کانٹوں کے کچھ باقی نہیں بچتا۔

مگر جو انسان اس چمن زار کی آبیاری کرنے والے کی خوشبو کو تلاش کر لیتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو اس کی رنگت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے وہ سراپا خوشبو بن جاتا ہے۔ پھر جب وہ بات کرتا ہے تو اس کی باتوں سے پھول جڑھتے ہیں جب وہ سوچتا ہے تو موسموں میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے جب وہ لکھتا ہے تو الفاظ مہکنے لگتے ہیں مگر یہ راہ عشق کی پہلی منزل ہے یہ جستجو کا پہلا قدم ہے اس راہ میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ ہزاروں سخت مقام آتے ہیں۔ راہ عشق کی آخری منزل درد سے آشنائی کی اور فوگرِ غم کی منزل ہے جب انسان اس منزل سے دیوانہ وار سے آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ نشاط رنج سے آشنا ہو جاتا ہے۔

یہ وہی منزل ہے جس پہ غالب نے کہا تھا:

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

یہی احساس رضیہ اسماعیل کے اس شعر سے بھی جھلکتا ہے۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھ کانٹوں پر چلنا آ گیا ہے

یہ منزل بڑی عجیب منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان کو حقیقت سے آشنائی ہو جاتی ہے انسان کو اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے دولت درد ہی زندگی کا حاصل ہے۔

متاع بے بہا ہے سوز و درد آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خاوندی
(اقبال)

مگر یہ متاع درد اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی یہ ثمر بڑی ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے۔

بقول سعدی:

؎ بسیار سفر باید تا پختہ شود خاصی

یہ سفر لمحوں کا سفر نہیں صدیوں کا سفر ہے یہ سفر ذات کی پہنائیوں کا سفر ہے۔ یہ راجی سے رضیہ اسماعیل کی بات نہیں، یہ وزیر آباد کی کچھ گلیوں سے لندن کی روشن شاہراہوں کی کہانی نہیں۔

یہ قطرے سے گہر تک کا سفر ہے جو رضیہ اسماعیل نے طے کیا ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی شاعری میں پھولوں کی تازگی بھی ہے۔

داخلی احساسات کی خوشبو بھی ہے عقیدتوں کی حلاوت بھی اور اپنی مٹی سے محبت کی باس بھی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' پڑھ کے یہ احساس ہوتا ہے کہ

سخن وراں پے سخن محمد دیں گواہی حالوں
جس پلڑے پھل بدھے ہوون آوے باس رمالوں

رضیہ اسماعیل کی سانولی سلونی شاعری کی معنویت

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
انڈیا

معنی آگیں آفاقی بصیرت کو تخلیقی ویژن عطا کرنا فن کاری ہے۔ رضیہ اسماعیل نثر لکھتی ہیں تو یافت کی مختلف کیفیات سے طلوع ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں اور شاعری کرتی ہیں تو صداقت کی اڑان پر اپنے پنکھ تولتی اور ادراک کو لطافت بخشتی دکھائی دیتی ہیں۔

وہ غزل، نظم اور دوہا کے ذریعہ آشنا حقیقتوں کی خیال افروزی کی طلسم کشائی بھی کرتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسوانی جذبات کی عکاسی ضرور کرتی ہیں۔ آئے دن کے مسائل کو دور سے تماشا دیکھنے والے کی طرح نہیں پیش کرتیں بلکہ اس رخ کو پیش کرتی ہیں جو ہر فرد کے سامنے آتا ہے۔ اپنے احساس اور تجربے کو تخلیق کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسلوب کی تازگی پر اور اظہار کی معصومیت اور سچائی پر ان کی نظر یقیناً ہوتی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی غزلیہ شاعری کی بنیاد ایسی ہے جس میں تخلیقیت شناسی کی مقناطیسی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اپنے لہجے کے نئے پن کے باوجود کلاسیکی مزاج سے الگ نہیں ہیں۔ اپنی غزلوں میں تخلیقی آگہی کا عرفان پیدا کر کے ذہن اور احساس کے لئے نئی جوت جگاتی ہیں اور داخلی شعور کو سامنے لاتی ہیں جس میں حقائق کے نئے پہلو ہوتے ہیں اور زندگی کی معنی خیز ترجمانی جس کے کے ذریعے عمل میں ترقی ہے۔

راتوں کا ندھیرا ہے، تنہائی ہے اور میں ہوں
ایسے میں کوئی جگنو پہلو سے لگا ہوتا

یادیں جب بھی بانہیں کھول کے آتی ہیں
یادوں سے میں ہاتھ چھڑاتی رہتی ہوں

مرنا پڑے سو بار اگر تو مر جاؤ
پر اپنے کردار کو مرنے مت دینا

مرد و زن کے لئے شرم و غیرت حیا لازمی ہیں مگر
مرد جیسا بھی ہو، آنکھ میں عورتوں کی حیا ڈھونڈتا ہے

کمندیں ڈال کر تم مہر و مہ پر بھول بیٹھے ہو
ابھی تو آدمی کو بھی یہاں انسان ہونا ہے

لہجے کی نرمی اور لطافت وخلوص کا احساس رضیہ اسماعیل کے یہاں جا بجا ملتا ہے لیکن تلخیٔ الم کی شدت نہیں ملتی۔اس نرمی اور شیرینِ سخن کا سہارا لے کر انھوں نے تلخ سے تلخ حقیقت کو گوارا بنا لیا ہے۔وہ اپنے مزاج کی سادگی کے ساتھ آفاقی صداقت کو فنی لوازم کے کینوس پر شعر کا جامہ پہنانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔اس جاننے میں لطیف نفسیاتی نکتے اور اشارے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ان کی غزلوں میں تخلیقی آگہی کی جلوہ گری کی ایک صورت یہ بھی ملتی ہے کہ وہ روح کے نازک بندھنوں کو جذبے کی طاقت عطا کرتی ہیں اور غم کو جذباتی گرمی سے متاثر کرتی ہیں۔

بہت پتھر کیا تھا خود کو میں نے
تو بچھڑا تو پگھلنا آ گیا ہے

فقط دو بول ہی کافی نہیں رشتوں کے بندھن کو
ابھی تک جسم ہیں دونوں، انھیں یک جان ہونا ہے

رضیہ اسماعیل کی غزلیں پڑھ کر لگتا ہے کہ اندر سے باہر کی طرف اور سوچ سے دل کی طرف سفر میں ہیں۔یہ وہ منزل ہے جہاں سے خود دریافتی اور خود آگاہی کی نبرد آزمائی شروع ہوتی ہے۔اسی کشفِ ذات کے احساس اور تخلیقی تنہائی کی ساعت سے اکائی کی شناخت بنتی ہے، تخلیقیت شناسی کے جوہر واضح ہوتے ہیں اور تخلیقی رویہ داخل سے پھوٹتا اور خارج میں ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

رضیہ اسماعیل نے نثری نظمیں زیادہ کہی ہیں جن میں ان کی سوچ کے بے کل دھارے زیادہ ملتے ہیں۔وجود کی سخت زمین کو توڑ کر اظہار کی بے قراری ملتی ہے اور نا آسودگی کے داخلی المیے کے استعارے اور تراکیب ملتے ہیں۔معنویت کو آشکار کرنے کے لئے قلمی تاثیر کی آئینہ داری دیکھی جا سکتی ہے۔

مگر لفظوں کو سو سو بار لکھنے پر
کئی نقطے لگانے اور مٹانے پر
کوئی بھی عکس تو کاغذ کی بانہوں میں نہیں آتا
کہاں ہو تم......کتابِ زندگی کے
کون سے پنّے میں رہتے ہو!
ہمیں لفظوں کے گھر میں چھوڑ کر
تم نے کہاں پر گھر بنایا ہے!
ہمیں کیسے بھلایا ہے!
نہیں آنا، نہیں ملنا
کوئی تحریر ہی بھیجو
کہ اک تحریر کا تحریر سے رشتہ تو ہوتا ہے!

(تحریر)

احساسات کے آتشِ سیّال کو فن کے پیمانے میں ڈھال کر رضیہ اسماعیل حرف و معنی کے پھول کھلاتی ہیں اور تمنا کے خار اگاتی ہیں۔

ہمیں رستے میں حائل سب فصیلوں کو
کسی جذبے کی ٹھوکر سے گرانا ہے
ہمارے پاؤں سے لپٹے ہوئے جتنے سمندر ہیں
ہمیں کڑوے کسیلے پانیوں کو
اسمِ اعظم پڑھ کے
زم زم میں بدلنا ہے
بدن کی چاندنی......
صحرا کی تپتی ریت میں کندن بنانی ہے
کہیں سے ڈھونڈ کر ہم کو
کٹھالی عشق کی لانی ہے
جس میں مرغِ بسمل کی طرح سے رقص کرنا ہے
ہمیں جانا ہے نگری پیار کی
اور گھر کا رستہ بھول جانا ہے

(سوچ سمندر)

بے خودی و ہشیاری عطا کرنے کی حقیقت نگاری کی جلوہ آرائی رضیہ اسماعیل کی انفرادیت ہے۔ان کی بعض نظمیں ایسا چہرہ ابھارتی ہیں جن کی لکیریں آشوبِ ذات کے ادراک سے منور ہیں اور آگہی کے ابلاغ کے لئے تڑپ رہی ہیں۔احساس کی گہرائی اور جذبے کی سلگتی ہوئی آنچ کی تمازت دیکھیے۔

زندگی کے عقوبت خانے میں
صرف جسم ہی قید نہیں ہوتے

ضمیر دربان بن جاتے ہیں
سوچوں کے چہرے پر سیاہی مل دی جاتی ہے
خیالوں کے پاکیزہ بدن کو
ناپاک ہاتھ چھوتے ہیں
اندھیرا روشنی کی آبروریزی کرتا ہے
رات، دن کی داشتہ بنتی ہے
خواب اندھے ہو جاتے ہیں
خوشبو بیوہ ہو جاتی ہے
عورتیں مرد بن جاتی ہیں......!

(عقوبت خانے)

بہت سارے موضوعات ہیں جن پر اپنے انداز اور فکر کی روشنی میں رضیہ اسماعیل نے نظمیں لکھی ہیں۔وہ صداقت اور اظہار کی رعنائی سے کام لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے دوہے میں بھی تجربے کیے ہیں۔ گیارہ اور تیرہ ماتراؤں کی یہ صنف تہذیبی میراث اور ثقافتی شناخت رکھتی ہیں۔دو مصرعوں میں رضیہ اسماعیل نے بھی فکر کی جولانیاں دکھلائی ہیں اور جامعیت و معنویت کے ساتھ تلخ حقائق سے روشناس کرایا ہے۔انھوں نے خطابت کو دوآتشہ بنا کر سچائی کو جس طرح آب و رنگ عطا کیا ہے، یہ ان ہی کا حصہ ہے۔خدا سے مخاطب ہو کر علوئے خیال کی رنگ آمیزی میں جہاں شکوہ ہے وہیں کیفیتِ قلبی بھی ہے۔

آدم کو جنت سے نکالا، کیسا تھا یہ ناٹک؟
حشر تلک اب اس جنت کا بند رہے گا پھاٹک

جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی باگیں کتنی ڈھیلی کر دیں

تیری عبادت کریں فرشتے، اور انھیں کیا کام
سارے کام تو ہم کو سونپے، پھر بھی ہم بدنام

آتما تن کا ایسا ناتا، بھید نہ کوئی پائے
جب تو چاہے تیرا فرشتہ آ کر روح لے جائے

آشوبِ آگہی اور روحِ عصر کی فکری توجیہ سے رشتہ جوڑ کر زندگی کی نئی تعبیر کا حوالہ رضیہ اسماعیل نے اپنے دوہے میں تواتر سے دیا ہے۔ نئے آفاق، نئے امکانات وانکشافات اور معنی ومفہوم اور بندش کے البیلے ذائقے کو انھوں نے اسلامی اساطیر میں تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علامتی انداز کے ایسے دوہے جداگانہ انفرادیت رکھتے ہیں۔

تین سو تیرہ تیرے مجاہد، کھڑی کفار کی فوج
ہار کہاں سکتے ہیں ربّا، کریں جو حق کی کھوج

ابراہیم کی آنکھ کا تارا، ماں کا راج دُلارا
اک بچے کی قربانی نے سب کا بخت سنوارا

صفا سے لے کر مردہ تلک پھرتی تھی ماری ماری
چاروں اور وہ کھوجے جَل کو، سمے بڑا تھا بھاری

کومل کومل ایڑیوں سے پھر پھوٹا ایسا چشمہ
چشمہ زم زم کا تھا گویا ربّ کا ایک کرشمہ

کالی کملی کاندھے پر تھی، آنکھ بڑی متوالی
ڈوب رہی بحرِ عصیاں میں دنیا اس نے بچا لی

رضیہ اسماعیل کے دوہے میں سوچ کے دائرے پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زندگی کسی سانولے سلونے محبوب کی طرح ان کی آغوش میں اور ہجر وفراق ان کے بازوؤں میں

سوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آشا اور نراشا کے بیچ کتنے ہی خواب جاگتے ہیں اور کتنی ہی خواہشیں مرتی ہیں۔

چُن چُن سپنے آشاؤں کے ہار پروتی جاؤں
جب بھی پیتم آئے دوارے، اس کو ہی پہناؤں

کھلے شگوفے پیڑوں پر، رُت پیا مِلن کی آئی
من ہی من میں دیکھ کے اس کو گوری ہے شرمائی

کاجل، ٹیکا، مہندی، پائل سب ہی شور مچائیں
یاد کریں بچھڑے پیتم کو، ہر دم اُسے بلائیں

کاجل، مسّی، بِندیا، پائل پیار کے سب پہناوے
آ جائے گا ساجن تیرا، کیوں کجلا بکھراوے

دھیمی دھیمی پریم کی اگنی کیسے من کو جلائے
دل کی پیتم اپنی بھاشا کوئی سمجھ نہ پائے

بیر بہوٹی بن کر بیٹھی، کب ساجن گھر آئے
پاگل منوا پہلو میں رہ رہ کر شور مچائے

پانے کی خواہش کو وجود میں اتارتے ہوئے رضیہ اسماعیل معرفت کے دروازے کھولتی ہوئی نظر آتی ہیں جس کے راستے عصری تقاضے میں پوشیدہ ہیں، جہاں زندگی کے لہو کی سرخی بے حد نمایاں ہے۔ وہ نیستی کو سمجھ کر دوہے کے ذریعے عمل پر زور دیتی ہیں اور نظامِ عقائد کو بھی جاننے کی کوشش کرتی ہیں۔ روایت کی عکاسی ان کے دوہے میں تاثیر انگیزی اور موضوع کی ہمہ گیر جامعیت ومعنویت کی دنیا سجاتی نظر آتی ہے۔

جگ کی رِیت نرالی بابا، ہم کو سمجھ نہ آئے
جو دُکھیوں کی کرے ہے چِنتا، وہ روگی کہلائے

پی کے خون غریبوں کا اب لوگ بنیں دھن وان
حال غریب کا کوئی نہ پوچھے، کہاں ہے تُو بھگوان

عقل کے اندھو! کیوں کہتے ہو، یہ تیرا یہ میرا
کون سدا جگ میں رہنے کا، چڑیاں رین بسیرا

جوگی والا پھیرا سب کا، جگ تیرا نہ میرا
من میں پیار کی جوت جگا لو، جس میں گھور اندھیرا

یہ حسنِ گمان ہے اور زندگی سے لگاؤ بھی۔ جذبے کے ان الگ الگ رنگوں میں رضیہ اسماعیل کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ایک طرف نسوانی جذبات و احساسات اور ہجر و وصال کے معاملات ہیں تو دوسری طرف نیرنگیٔ حالات کی وجود پذیری بھی ہے۔ ساتھ ہی وقیع تر شعور و آگہی کی پوری گھلاوٹ ملتی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی ماہیا گوئی

ساحر شیوی
لندن

''ماہیا'' اردو دنیا میں اب ''غزل'' کی طرح معروف ہو گیا ہے۔ جس طرح غزل کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں کہ غزل کسے کہتے ہیں اور یہ کس طرح کہی جاتی ہے اسی طرح ماہیا کی ہیئت و آہنگ سے بھی سبھی اردو داں اور شعراء بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان کی یہ لوک صنف ہندوستان و پاکستان کی سرحد میں پار کر کے انگلستان میں بھی شعری اظہار کا وسیلہ بن گئی ہے۔ جرمنی میں مقیم حیدر قریشی کی ماہیا تحریک نے اس مختصر صنف سخن کو اتنا عروج بخش دیا ہے کہ ہر کس و ناکس اس میں طبع آزمائی کو ضروری سمجھنے لگا ہے یعنی ماہیا کا جادو شعراء کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

برطانیہ کے شہر برمنگھم میں رہنے والی رضیہ اسماعیل ایسی شاعرہ اور ادیبہ ہیں جنھوں نے انگلستان میں اپنی تخلیقی قوتوں سے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ نثر و نظم کی ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں ان کی فعالیت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے ماہیوں کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں'' میں منظر عام پر آ چکا ہے یہی نہیں انہوں نے انگلینڈ کے مشاعروں اور بی بی سی ایشیا لندن کے ادب پروگراموں میں بھی اردو ماہیا کی ادبی وقار کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ ''ماہیا'' کے روزان و آہنگ کی بحث سے قطع نظر واضح ہو کہ رضیہ اسماعیل بڑی خوبصورت ماہیا نگاری کرتی ہیں وہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں اس لیے وہ اپنی شاعری میں قلبی واردات اور دلی جذبات کو منعکس کرتی ہیں۔ ان کے ماہیے بھی ان کے دل کی کہانی

کہتے ہیں اوران کی دلی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔وہ خود کہتی ہیں:

1۔یہ دل کی کہانی ہے
کوئی ہیں سنتا
اب خود کو سنانی ہے

2۔اشکوں سے وضو کر کے
ماہیۓ لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کر کے

غزل کی طرح لب ماہیا کے موضوعات بھی محدود نہیں رہے رضیہ اسماعیل کے ڈھیر سارے ماہیۓ جب میں نے پڑھے تو اندازہ ہوا کہ ان میں تو موضوعات کی قوس قزح کھلی ہوئی ہے اور مختلف النوع رنگوں نے ان کی جاذبیت ودلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔سلیقہ سے وہ ماہیا گوئی کا اہتمام کرتی ہیں اور موضوع میں بے ساختہ اظہار سے جان ڈالتی ہیں۔ان کے رنگا رنگ ماہیوں کے ہر رنگ سے ان کی دانشوری جھلکتی ہے کچھ رنگوں کی کیفیات کا جائزہ ضروری ہے۔

رضیہ اسماعیل نے چمنستان ماہیا میں حمد ونعت کے پھول بھی کھلائے ہیں اور دینی عقیدت واحترام کے غنچے بھی چٹخائے ہیں جن سے ان کی ذہنی کیفیت ورجحان کا پتہ چلتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے میں رہتے ہوئے بھی مذہب سے لگاؤ رکھتی ہیں اور برمنگھم کے بے ہنگم معاشرے میں بھی اپنی مذہبی وثقافتی پہچان کو نہیں بھولی ہیں۔اس ضمن میں چند ماہیۓ دیکھیں:

☆ تو باغ کا مالی ہے۔
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے

☆ ہم تیرے سہارے ہیں
پیاس بجھا دینا
کوثر کے کنارے ہیں

☆ معراج کی رات آئی
جھولیاں بھر لو تم
رب کی سوغات آئی

☆ تو آمنہؓ جایا ہے
بی بی حلیمہ نے
تجھے دودھ پلایا ہے

☆ دریا میں سفینہ ہے
ماہِ رمضان تو
بخشش کا مہینہ ہے

''ماہیا'' کا اصلی رنگ تو پنجابی رنگ ہے۔لوک گیت کی جو دردیلی کیفیت ہے اور جو دل ودماغ کو کچھ کہتی ے وہ جب ماہیا میں سرائیت کرتی ہے تو پونے تین مصرعوں میں جان سی پڑ جاتی ہے......ملاحظہ فرمائیں:

☆ بیلوں کی جوڑی ہے
اس نے شرارت سے
میری گاگر توڑی ہے

☆ میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں

☆ اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

☆ کمہار کا آوا ہے
پکتا رہتا ہے
میرے دل کا جولا وا ہے

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جس ماحول میں اور جس معاشرے میں رہتی ہیں وہ ان کے لیے نامانوس ہی نہیں بلکہ ان کی اپنی تہذیب وثقافت سے بالکل مختلف ہے مشرق و مغرب میں جو بعد ہے وہ بھی ان کے کچوکے لگاتا ہے اور کلچر بھی ان کے درد میں اضافہ کرتا ہے۔ثقافتی بحران سے پریشان ہوکر وہ ماہیوں میں اپنے دکھ کا اظہار کرتی ہیں:

☆ کڑوے ہیں سکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دکھ ماہیا

☆ سب زخم چھپاتے ہیں
رہنے کا یورپ میں
ہم قرض چکاتے ہیں

☆ کلچر کا رونا ہے
آ کے ولایت میں
اب کچھ تو کھونا ہے

☆ کس دیس میں رہتے ہیں
بچے پیرنٹس کو
یہاں شٹ اپ کہتے ہیں

☆ یہاں کوئی ہمارا ہے
سردی دشمن ہے
ہیٹر کا سہارا ہے

شاعر تو ویسے ہی حساس طبع ہوتا ہے اور پھر تو وہ عورت ہیں، محسوسات کا مجموعہ، مگر یورپ میں عورت کی قدر کہاں ہے وہ وہاں مرد کے دشمن بدوش کام کرتی ہے۔اور خانگی ذمہ داریاں بھی نبھاتی ہے۔مگر مشرق کی طرح اس کو کوئی ارفع مقام حاصل نہیں۔اسی لیے وہ عورتوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے سرگرم کار ہیں اور کئی فلاحی اداروں سے جڑی ہوئی ہیں اور رضا کارانہ خدمات انجام دیتی ہیں۔شاعری ہو یا مضمون نگاری وہ عورت کے حقوق کے موضوع کو اپنا خاص موضوع سمجھتی ہیں۔ماہیوں میں بھی ان کا کرب جابجا جھلکتا ہے۔

☆ عورت کو ستاؤ گے
جنم جلی ہے جو
کیا اس کو جلاؤ گے

☆ یہ دیئے کی باتی ہے
قدر کرو اس کی
دکھ سکھ کی ساتھی ہے

☆ عورت کو دغا دو گے
بیوی بنا کر تم
چولہے میں جلا دو گے

سچ تو یہ ہے کہ رضیہ اسماعیل نے اپنے ماہیوں کو تنوع اور ندرت سے مالا مال کیا ہے اور اس طرح اپنی ماہیا نگاری سے ماہیے کی عالمی تحریک کو غیر محسوس طور پر تقویت بہم پہنچائی ہے۔ اپنے موقف کے اظہار میں وہ دوسرے ماہیا نگاروں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ میں ان کی تخلیقی قوتوں اور شعری صلاحیتوں کو سلام کرتا ہوں۔

تبصرہ

محمد شریف بقا
لندن

کتاب کا نام: ''خوشبو، گلاب، کانٹے

مصنفہ: ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

پبلشرز: بک ہوم، 46 بک سٹریٹ، مزنگ لاہور

قیمت: 12 پاؤنڈ، صفحات: 672

رابطہ کے لئے فون نمبر: 0750-646659

مندرجہ بالا کتاب کی مصنفہ محترمہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ایک معروف شاعرہ، بلند پایہ نثر نگار اور ہر دلعزیز سوشل ورکر ہیں۔ اگرچہ وہ برمنگھم میں مقیم ہیں تاہم ان کی روز افزوں شہرت برمنگھم تک محدود نہیں رہی۔ وہ گزشتہ 17 سالوں سے اپنی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کے زیر اہتمام متعدد تقریبات منعقد کر کے علم و ادب خصوصاً ایشیائی خواتین کے گونا گوں سماجی امور اور فلاحی کاموں کے ضمن میں قابل قدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ ان سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار زیادہ تر عورتوں کے عصری مسائل کے حل اور ان کے لئے مفید فلاحی منصوبوں سے منسلک ہے۔ انہوں نے ایم اے انگلش بھی کیا ہے اور سوشل ورک میں پی ایچ ڈی بھی حاصل کی ہوئی ہے۔ انہیں جنون کی حد تک فلاحی کاموں سے دلچسپی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں بڑے فخر سے کہا تھا۔ ''میرے خیال میں اللہ کی عبادت کے بعد

خدمت خلق بڑی عبادت ہے۔'' حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ ''**خیر الناس من ینفع الناس**'' (بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو زیادہ سے نفع پہنچائے۔) انسانوں کی بھلائی کے لئے زیادہ سے زیادہ انسانیت ساز اور انسانیت نواز کام کرنا یقیناً بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اپنی مصروف ترین زندگی یعنی سماجی سرگرمیوں کے باوجود اب تک 15 کتابیں تحریر کر چکی ہیں۔ 6 کتب شاعری سے متعلق ہیں اور بقیہ 9 کتب ان کی نثری نگارشات پر مبنی ہیں۔ اس طرح وہ دن رات گلشن علم و ادب کی آبیاری کرنے کا عزم بالجزم کئے ہوئے ہیں۔ ؎ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ان کی زیر تبصرہ کتاب ظاہری اور باطنی محاسن کی آئینہ دار ہے۔ کتابت اور طباعت بے حد دلکش اور دیدہ زیب ہے۔ اس مجلّہ کتاب کا سرورق مجرد آرٹ کا حسین نمونہ پیش کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بڑا عام فہم انداز اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سی غزلوں، نظموں، دوہوں اور ماہیوں کا مجموعہ ہے۔ جدت خیال کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید اسلوب بیان اور آزاد شاعری کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ ان کی جدت پسندی شعر و ادب کی قدیم اعلیٰ روایت سے مربوط نظر آتی ہے۔ ان کی اس کتاب کے اہم ترین موضوعات اہم سماجی امور، عورت کی مظلومیت، جفاکشی، وطن دوستی، انسانی فلاح و بہبود، صدائے احتجاج اور تفسیر حیات ہیں۔ شاعرانہ تعلّی کا کہیں بھی سراغ نہیں ملتا۔ انہوں نے اس کتاب کے شروع میں جو انتساب لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو:

''رب جلیل کے نام جس نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کر کے قلم اور تخیل کی نعمت سے نوازا۔'' کتاب کے آخری حصے میں دو ابواب امتیازی شان رکھتے ہیں۔ پہلے باب (''اہل نظر کے تاثرات'') میں ستائیں مشہور و معروف شعرائے کرام اور ادبائے عظام کے خراج عقیدت پر مبنی تاثرات شامل ہیں۔ یہ تاثرات دراصل ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی تحسین و آفریت کے حامل ہیں۔ محترم اقبال راہی نے اپنی نظم ''ہدیہ سپاس'' میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دوسرا باب ''تعارف و تخلیقی

سفر‘‘ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل صاحبہ کے سوانح حیات، تعلیمی اعزازات اور ان کی تصانیف و تالیفات کے ذکرِ حسین کا عکاس ہے۔

اب آخر میں ان کی اس کتاب ’’خوشبو، گلاب، کانٹے‘‘ سے انتخاب شدہ چند اشعار قارئین کرام کے حسنِ ذوق کی تسکین کے لیے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ گویا ’’مشتے نمونہ از خروارے‘‘ کا مصداق ہیں:۔

حمد یہ شعر ملاحظہ ہو:

کوئی حدیں ہی نہیں ہیں تری حکومت کی
جدھر نگاہ اٹھاؤں تری حضوری ہے

حضورؐ کی بارگاہ میں یوں گویا ہوتی ہے:۔

من کی آنکھوں سے دیکھتی ہوں تجھے
کاش میں آنکھ آنکھ ہو جاؤں

غزل سرائی کا انداد یکھئے:

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آگیا ہے

ہے جال اندھیروں کا جاؤں تو کدھر جاؤں
رستے میں ترے گھر کے اک دیپ جلا ہوتا

غم گھر کی منڈیروں پر آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اس کے آثار نہیں ملتے

تالے مرے جا پہنچے ہیں اب عرش بریں پر
میں اپنی دعاؤں کا اثر دیکھ رہی ہوں

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

ذرا سی بات پہ وہ روٹھ کر چلا بھی گیا
اب ایک عمر لگے گی اسے منانے میں

ہم خاکی صورت لوگ جہاں میں
کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں

سب ڈھونگ یہیں رہ جاتے ہیں
ہم مٹی میں مل جاتے ہیں

بیٹی کی پیدائش پر جو لوگ ناراض اور غم زدہ ہوتے ہیں وہ اس رحمت خداوندی کو بھول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی کئی نظموں میں اس اندازِ فکر کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

رضیہ اسماعیل کے دوہے۔ایک مطالعہ

محفوظ الحسن
بہار

دوہا خالص ہندوستانی صنفِ شاعری ہے۔امیر خسرؔو سے لے کر آج تک شعرا دوہے پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔اس کی تاریخ طویل ہے اور تسلسل قائم۔ابتدا میں اس کی رفتار دھیمی رہی ہے۔پھر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب اس کی آواز کم کم سنائی دیتی رہی ہے۔بیسویں صدی میں دوہے نے نئی انگڑائی لی ہے اور نئی شان سے شعری افق پر اس کی جلوہ گری ہوئی ہے۔موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ عالمی سطح پر دوہا نگاری کو فروغ ہوا ہے اور برصغیر ہند و پاک کے علاوہ خلیجی ممالک، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور جرمنی وغیرہ میں مقیم ہندوستانی و پاکستانی شعرا نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔دوہے کی اس مقبولیت کا راز میرے خیال میں غزل سے اس صنف کی قربت کا ہونا ہے۔قربت سے میری مراد غزل کے اشعار کا ظاہری طور پر ایک دوسرے سے بے ربط ہونے سے ہے۔یعنی جس طرح غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور مکمل بھی، اسی طرح دوہا بھی اپنے آپ میں مکمل اکائی ہوتا ہے۔ میرے مطالعہ کی حد تک ۔

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

کو پہلا دوہا قرار دیا گیا ہے۔یہ دوہا برہن کے جذبات کا عکاس ہے۔کہہ سکتے ہیں کہ عشق دوہے کی بنیاد میں شامل ہے۔لیکن جیسے جیسے علم کا دریا وسیع ہوتا گیا، دائرہ بڑھتا اور

پھیلتا گیا۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہوتی گئی۔دوہے کے موضوعات و مضامین میں بھی وسعت آتی گئی۔آج کا دوہا نگار صرف عشق، حسن، ہجر و وصال کے حصار میں مقیّد نہیں بلکہ وسیع تر کائنات اس کی نگاہوں میں ہے۔لہٰذا آج کے دوہے میں وسیع تر کائنات کے حالات کی عکاسی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

قبل اس کے کہ میں رضیہ اسماعیل کے دوہوں پر گفتگو کروں، میں چاہتا ہوں کہ ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی شاعر کے دوہے کے تعلق سے خیالات نذرِ قارئین کروں تا کہ صنف دوہا، اس کی فنی حیثیت و شناخت اور مضامین و موضوعات کے تعلق سے واقفیت ہو جائے۔

تیرہ، گیارہ ماترا، بیچ بیچ وشرام
دو مصرعوں کی شاعری، دوہا جس کا نام
(فراز حامدی)

نا مانگے پچیس یہ، نا راکھے تئیس
دوہے کی ہر سطر میں حرف سجیں چوبیس

تیرہ پر لے سانس پھر باقی گیارہ جوڑ
دوہے کے اس روپ کی نہیں ادب میں ہوڑ

دو مصرع میں باندھ کر داد، نصیحت، پریت
بھید کھولنا جگت کے ہے دوہے کی رِیت
فعلن، فعلن، فاعلن، فعلن، فعلن، فاع
دوہے کا یہ وزن ہے، کہتے ہیں طباع
(تاج قائم خانی)

میرے خیال میں صنف دوہا کے فن اور موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے

لہٰذا میں رضیہ اسماعیل کے دوہوں پر گفتگو کی ابتدا کرتا ہوں۔

کسی فن کار کے فن پر گفتگو کے لئے اس فن کار کی شخصیت اور دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر وفن کے مکمل نمونے جب تک سامنے نہ ہوں، انصاف کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ میں نے رضیہ اسماعیل کو ''پرواز'' کے علاوہ کہیں نہیں پڑھا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی نثری یا شعری مجموعہ پیشِ نظر رہا ہے۔ ایسی صورت میں ساحر شیوی کے ذریعے مرسلہ محض پچاس ساٹھ دوہوں کی روشنی میں میں جو گفتگو کروں گا ممکن ہے اس سے رضیہ اسماعیل کی فن کاری کے پورے سچ پر روشنی نہ پڑ سکے۔ لہٰذا قارئین سے پہلے ہی معذرت کر لیتا ہوں کہ اگر میں رضیہ اسماعیل کو اچھی طرح پیش نہ کر سکوں تو مجھے معاف فرمائیں گے۔

رضیہ اسماعیل کے دوہے میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ رضیہ اسماعیل اپنے ماضی سے خوب واقف ہیں۔ اسلامی تاریخ ان کی نظروں میں ہے۔ انھوں نے اس کا نہ صرف گہرائی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ اس کو دل کی گہرائیوں میں اتارا ہے اور اس پر عمل پیرا رہی ہیں۔ دوم یہ کہ انھوں نے اپنے دوہوں میں حمد و نعت کے مضامین کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے نیز حمد کہتے وقت دیوانگی اور نعت کے وقت ہشیاری کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ انھوں نے عورت کی مختلف جذباتی کیفیات کو بڑی خوبی سے دوہوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اور چوتھی چیز یہ کہ اخلاقی تقاضے بھی ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔

ان کے دوہوں سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں کہ میں اپنی گفتگو کو مدلل کروں۔

حمدیہ اور نعتیہ دوہے تقریباً تمام دوہا نگاروں نے لکھے ہیں لیکن رضیہ اسماعیل کی حمد نگاری اور نعت نگاری نیز ان کی اسلامی و انسانی تاریخ سے واقفیت کا اندازہ لگانا ہو اور ان کا منفرد اظہار یہ دیکھنا ہو تو مندرجہ ذیل دوہے ملاحظہ فرمائیں۔

اونچی تیری شان ہے مولا، اونچا راج سنگھاسن
عیب نہیں کوئی تجھ میں مولا، کیوں کر گنوں محاسن

سارے جگ کا رکھوالا تو، ہم تیرے محتاج
حکم عدولی کرتے ہوئے کیوں آئے نہ ہم کو لاج؟

کالی کملی کاندھے پر تھی، آنکھ بڑی متوالی
ڈوب رہی بحرِ عصیاں میں دنیا اس نے بچا لی

کفر و شرک کی کالی آندھی سنے نہ کوئی بات
ٹھان لی جی میں لیکن اس نے، دے کے رہیں گے مات

دُرِّ یتیم بنایا اس کو، بھید بڑا تھا گہرا
دُکھ اس کی جاگیر بنائے، اس پر غم کا پہرا
آدم کو جنت سے نکالا، کیسا تھا یہ ناٹک؟
حشر تلک اب اس جنت کا بند رہے گا پھاٹک

جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی باگیں کتنی ڈھیلی کر دیں

تیری عبادت کریں فرشتے، اور انھیں کیا کام
سارے کام تو ہم کو سونپے، پھر بھی ہم بدنام

آتما تن کا ایسا ناتا، بھید نہ کوئی پائے
جب تو چاہے تیرا فرشتہ آ کر روح لے جائے

ابراہیم کی آنکھ کا تارا، ماں کا راج دُلارا
اک بچے کی قربانی نے سب کا بخت سنوارا

صفا سے لے کر مردہ تلک پھرتی تھی ماری ماری
چاروں اور وہ کھوجے جَل کو، سمے بڑا تھا بھاری

تین سو تیرہ تیرے مجاہد، کھڑی کفار کی فوج
ہار کہاں سکتے ہیں ربّا، کریں جو حق کی کھوج

مندرجہ بالا دوہوں میں آپ کو یقیناً حمد و نعت کا نرالا اور اچھوتا انداز نظر آیا ہو گا۔انسان اور فرشتوں کا فرق، روح اور بدن کی حقیقت، آدم کا جنت سے نکلنا، حضرت ابراہیم اور اسماعیل کی قربانی، حضرت ہاجرہ کی پریشانی، زم زم کا چشمہ بہنا، جنگِ بدر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کرب ناک پہلوؤں کو کس خوب صورتی سے ادب کے قالب میں ڈھالا ہے، اسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ضرورتاً ہندی الفاظ کے استعمال سے اثر آفرینی کا کام لیا گیا ہے۔اسے فن کارانہ چابک دستی کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کی کوشش بھی کم اہم نہیں۔

مندر جاؤ، مسجد جاؤ، ربّ تو ایک ہے بھائی
وہ ہی احد، وہ ہی واحد، دوئی کاہے بنائی

اس دوہے میں لفظ ''کاہے'' جو خالص بہاری لفظ ہے، کا استعمال کر کے فن کار نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ زبان زبان ہوتی ہے، کسی ایک علاقے کی جاگیر نہیں۔پھر ''کاہے'' کے استعمال نے جو ایک فطری انداز پیدا کر دیا ہے، اس کی داد نہ دینا قرینِ انصاف نہیں۔

میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ رضیہ عورت ہیں لہٰذا انھوں نے مختلف ساعتوں میں عورتوں کے جذبات کی بھی خوب عکاسی کی ہے۔ان دوہوں میں حسن کی چھیڑ چھاڑ ہے،

عشق کی تڑپ ہے، برہ اور برہن کا دکھ ہے، ملن کی آس ہے، وصال کی خوشبو ہے، ملن کا جوش ہے، ایک دوسرے میں سما جانے کی تمنا اور کھو جانے کی آرزو ہے۔یہ سب کچھ نرا بیان نہیں بلکہ شاعرانہ اقدار کی پاس داری کے ساتھ فکری و فنی حسن کی آمیزش کا خوب صورت نمونہ بھی ہے۔یہاں اگر پیا کے لئے سپردگی ہے تو پیا سے دو دو ہاتھ کرنے کی دھمکی بھی ہے۔یعنی رضیہ کی عورت محض مجبور نہیں بلکہ خود اپنے وزن و وقار کو بھی محسوس کرتی ہے۔

رضیہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ زمانہ حسن و عشق کا دشمن ہوتا ہے لہٰذا انھوں نے حسن کو زمانے سے بچنے کی بھی صلاح دی ہے۔چند دوہے ملاحظہ فرمائیے۔

بستی بستی، قریہ قریہ دھواں اڑاتے پھرتے ہو
کس کی دید کی آس لگائے اشک بہاتے پھرتے ہو

خواب چرائے آنکھوں کے یہ راتوں کی بے خوابی
دھول اڑے انکھین نگری میں بڑھے ہے جب بے تابی

عشق کی مے ہم پی بیٹھے ہیں، یار نظر نہ آئے
مرتے دم تک اس کو کھوجیں، چاہے جہاں چھپ جائے

عشق ترے نے من کے اندر ایسی جوت جگائی
تیرے بنا کچھ نظر نہ آئے، حاضر کُل خدائی

جیم جدائی کی گھڑیاں اب بیتیں نہیں اکیلے
آن ملو اب ساجن تم بھی کس کارن کے میلے

دُور نظر سے ہو جاؤ پر دل سے دُور نہ ہونا
لاکھ جتن سے پیار خزانہ پایا، اب نہ کھونا

رات مرادوں والی آئی، من کا پنچھی چہکے
خوشبو اُڑتی پھرے سانوریا، گجرا ہر سو مہکے

دھیمی دھیمی پریم کی اگنی کیسے من کو جلائے
دل کی پیتم اپنی بھاشا کوئی سمجھ نہ پائے

برکھا اور بادل کو دیکھو، کھیلیں آنکھ مچولی
من سے میرے ہُوک سی اٹھے کہاں مِرا ہمجولی

لوک لاج کو تج کے میں تو چلی پیا کے ساتھ
روک سکو تو روک لو مجھ کو، پکڑا پی کا ہاتھ

پکڑ کے پی کا ہاتھ چلی ہو، اتنا رہے گمان
نظر نہ لاگے پیار کو تیرے، بیری کُل جہان

کاجل، ٹیکا، مہندی، پائل سب ہی شور مچائیں
یاد کریں بچھڑے پیتم کو، ہر دم اُسے بلائیں

سو گئے تارے، نیند کے مارے اور جاگے اِک برہن
لوٹ کے جانے کب آؤ گے، چوکھٹ پر ہیں نینن
میں سلفے کی لاٹ ہوں سجناں، تو گھبرو پنجابی
سیدھے راہ پہ آ جا ورنہ ہو گی بڑی خرابی

تو پنجاب کا گھبرو ہے تو میں بھی روپ کٹاری
دیکھے مجھ کو جو بھی تاکے اور نہ کوئی ناری

چھوڑ دی گاگر بیچ بجریا، لاج اسے نہ آئے
گھاگرا چولی بھیگا، گوری لاج سے مرتی جائے

گوری بن میں جھولا جھولے، گیت مِلن کے گائے
آئے ساجن چپکے سے اور من کے پھول کھلائے

اتنا ہی نہیں غریبوں، بے کسوں اور لاچاروں کی کس مپرسی پر رضیہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہیں۔

پی کے خون غریبوں کا اب لوگ بنے دھن وان
حال غریب کا کوئی نہ پوچھے، کہاں ہے تُو بھگوان؟

اور پھر یہ اخلاقی درس بھی ملاحظہ ہو۔

عقل کے اندھو! کیوں کہتے ہو، یہ تیرا یہ میرا
کون سدا جگ میں رہنے کا، چڑیاں رین بسیرا
جوگی والا پھیرا سب کا، جگ تیرا نہ میرا
من میں پیار کی جوت جگا لو، جس میں گھور اندھیرا

اور آخر میں علم وجہل کے تعلق سے یہ دوہا ملاحظہ ہو۔

علم تو ہے اک نقطہ سائیں، کاہے سمجھ نہ آوے
جاہلوں جیسی باتیں کر کے کیوں تو اسے بڑھاوے

رضیہ پاکستان نژاد اور برطانوی شاعرہ ہیں۔ ان کے دوہوں میں پاکستانی یا برصغیر کی عورت تو نظر آتی ہے مگر برطانوی عورت نظر نہیں آتی، کم از کم ان دوہوں کی حد تک جو مجھے بھیجے گئے ہیں۔

رضیہ کی دوسری ادبی اور سماجی مصروفیات بھی ہیں جہاں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے غزل، نظم اور نثر کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ رضیہ کو سلیقۂ گفتار بھی حاصل ہے اور سلیقۂ اظہار بھی۔ الفاظ کے استعمال پر، زبان و بیان پر دسترس بھی ہے اور ادبی اقدار کا تحفظ بھی ان کو آتا ہے۔

فنی و عروضی سطح پر ان دوہوں کی کیا حیثیت ہے؟ اس کا فیصلہ تو وہ کریں گے جو ماہرِ عروض ہیں۔ میری نظر میں رضیہ کے دوہے قابلِ مطالعہ ضرور ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے''

امجد مرزا امجد

زندگی کی ترجمانی کرنے والی شاعری کو بلا کسی تردد بڑی شاعری کی سند سے سرفراز کیا جا سکتا ہے کیونکہ ادب کا نصب العین زندگی کی حقیقتوں سے انسانی ذاتی کو روشناس کرانا ہوتا ہے اور ادب جب حیات و کائنات کے رموز سے الجھتا ہے تو فلسفوں کی مشعل راہ بھی تلاش کر لیتا ہے۔ اسی طرح ادب جب شعور کی تربیت کرتا ہے تو ذات کے عرفان اور کائنات کی آگہی کے در کھلتے جاتے ہیں۔ دل کی ریاست میں قدم رکھنے کے بعد بادشاہی کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور شان فقیری کا ادراک ہوتا ہے اور اسی بیداری کے سبب انسان کی ذات سرچشمہ رحمت بن جاتی ہے۔ اس کی نظر محبت کی نظر اور اس کی فکر فکر خیر کے سوا کچھ نہیں ہوتی، محترمہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی شاعری بھی حقیقتوں کی شاعری، بیداری کی شاعری، صدائے حق کی تبلیغ اور فکر احسن کی شاعری ہے۔

ایک سچا اور حقیقی شاعر شعر کی تخلیق کرتے وقت کن کن مراحل سے گزرتا ہے یہ وہی جانتا ہے کہ اس نے ایک ایک شعر کے لیے کتنا خون جلایا ہے۔

آنسو لہو میں ڈوب گئے تو خبر ہوئی
طوفان دل نے درد کے کیا کیا اٹھائے ہیں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بھی اپنے اشعار میں کتنے آنسو لہو میں ڈوب کر کتنے درد کے طوفان دل میں اٹھا کر اپنے زندگی کے کتنے دن رات آنکھوں میں کاٹ کر اپنے جذبات کو الفاظ کا پیرہن دے کر اشعار کا روپ دیا ہوگا۔ وہ کہتی ہیں کہ۔

"میں سمجھتی ہوں کہ قلم کے سینے میں وقت کی امانتیں دفن ہوتی ہیں اور ایک سچے قلم کار کا فرض ہے کہ وہ ان امانتوں کو پوری دیانت داری سے قلم کے سپرد کرے۔"

یہ واقعی ان کی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے چالیس سالہ تخلیقی سرمائے کو ضائع نہیں ہونے دیا اور اپنے مجموعات کے علاوہ ہندو پاک اور برطانیہ و یورپ کے رسائل واخبارات کی زینت بنائے رکھا اور لاکھوں قارئین مستفید ہوئے اور ہو رہے اور ہوتے رہیں گے۔

میں انہیں کئی برسوں سے "ماہنامہ پرواز" میں پڑھتا رہا ان کے افسانے اور اشعار دل کو چھوتے رہے مگر میری کاہلی کہ ان کو تلاش نہ کر سکا جبکہ انہوں نے مجھے کھوج ڈالا جو ان کی ادب کے ساتھ گہری محبت کا ثبوت ہے اور اپنے دوسرے قلمکار ساتھیوں کی حوصلہ افزائی اور محبت ہے۔ انہوں نے مجھے نہ صرف اپنے پانچ مجموعات "گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو، سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں، میں عورت ہوں، پیپل کی چھاؤں میں اور ہوا کے سنگ سنگ" کو ایک نہایت خوبصورت کلیات میں بنام "خوشبو گلاب کانٹے" کے بھیجا جو ماشاءاللہ نہایت ضخیم کتاب کی صورت میں 672 صفحات پر مشتمل خوبصورت اسی گرام کے سفید کاغذ پر دیدہ زیب سرورق کے ساتھ آنکھوں کو بھاتی ہے ہاتھوں سے نہیں چھٹتی۔ چونکہ میں لندن کے معروف اخبار "یو کے ٹائمز" کا ادبی صفحہ بھی مرتب کرتا ہوں تو انہوں نے کمال محبت سے اپنی پوری کلیات ان پیج میں بھیج دی تا کہ مجھے مزید آسانی ہو جائے میں کیسے شکریہ ادا کروں ان کی اس ادب نوازی کا۔

میں جوں جوں اس کلیات کے ورق پلٹتا جا رہا ہوں ڈاکٹر رضیہ کی ادبی دنیا کے نئے نئے باب کھل رہے ہیں۔ برطانیہ کی ایک قلمکار جس کی کتابوں کی تعارفی تقریبات پر پاکستان برطانیہ کے نامور و معروف دانش ور افتخار عارف، فرحت عباس شاہ، بشریٰ رحمٰن، رضا علی عابدی اور ڈاکٹر شہناز مزمل جیسی قد آور ادبی ہستیوں نے صدارت کی ہو، جس کی ادبی زندگی اور تخلیقات کے بارے میں سلطانہ مہر، ڈاکٹر صفات علوی، عدیم ہاشمی، بشریٰ رحمٰن،

حیدر قریشی، ڈاکٹر حسن رضوی، فرحت عباس شاہ، محمود ہاشمی، پاکیزہ بیگ، طلعت سلیم، پروین شیر، شاہدہ احمد، یعقوب نظامی، عصمت بانو، صفیہ صدیقی اور دیگر درجنوں ادباء وشعراء نے خراج تحسین پیش کیا اور ان کی شاعری ونثر کو اپنے خوبصورت الفاظ میں سراہا ہو...... وہاں میرے جیسا کم علم و کم فہم کیا لکھے گا......!!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے خلوص و پیار اور بہنوں جیسے پیار پر بس میری آنکھیں نم ہو کر ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں اور انگلیاں لرزنے لگتی ہیں کہ کیا لکھوں......!!

ڈاکٹر صاحبہ کو ادب سے پیار نہیں عشق ہے جس کے لیے وہ دن رات بیقرار رہتی ہیں اور انہوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کی تمام اصناف کو بڑی ہنرمندی و مہارت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ یہی جذبہ عشق انسانی فطرت کا اٹوٹ جز ہے جس کی حقیقت دل پر آشکارہ ہو جانے کے بعد انسانی ذات وسعت بے پایاں و بے کراں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ دل کی نرم مٹی سے جب یہ پودا نشو ونما پاتا ہے تو اس کی شاخوں پر صفات احسن کے پھول کھل اٹھتے ہیں اور کردار سرچشمۂ سوز و گداز ہو کر سلامتی اور امن کی علامت بن جاتا ہے۔ اسی سوتے سے الفت کے ترانے پھوٹتے ہیں اور اخوت، انسان دوستی، رواداری، خاکساری کی لے پر موجزن اطوار پاکیزہ کے نغموں سے ماحول عطر بیز ہو جاتا ہے۔

اس خزینہ ادب میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے ہر طرح کے ادبی پارے محفوظ کر لیے ہیں۔ اشعار، قطعات، غزلیں، نظمیں، نثری نظمیں، ماہیے، مضامین اور اپنا مفصل تعارف و تخلیقی سفر۔ اور یہ سفر ابھی مکمل نہیں ہوا ہنوز جاری ہے اور ہماری معروف شاعرہ مزید اپنا کلام دنیائے ادب کو دان کر رہی ہیں۔

آج کے دور میں کتاب شائع کرانا کوئی اتنا آسان نہیں ہے برسوں کی بچت کے ساتھ ساتھ مہینوں ناشر کی منتیں ہزاروں فون کالز، پھر کتابوں کو پاکستان سے منگوانا انہیں مفت دوستوں میں تقسیم کرنا ہی نہیں انہیں پڑھنے کے لیے آنکھوں میں منت وسماجت کی نمی لے کر دینا......رسم اجرء پر ہزاروں کے اخراجات کر کے انہیں دعوتیں دینا۔

برطانیہ ہی نہیں ہندو پاکستان میں بھی کتابوں کا یہی حال ہے کہ وہ لوگ جو ادب کے جھنڈے اٹھائے پھرتے نعرے لگاتے نہیں تھکتے تین چار پونڈ کی کتاب خرید کر مصنف کی حوصلہ افزائی تک نہیں کرتے۔ مجھے تو اپنے قلمکاروں سے بھی گلہ ہے کہ عام قاری کتاب پڑھ کر شیلف میں رکھ دیتا ہے اور پھر ساری عمر اس کے گھر والے اس کی دھول صاف کرتے رہتے ہیں مگر قلمکار پر یہ فرض لاگو ہوتا ہے کہ اسے پڑھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرے مصنف کی حوصلہ افزائی کرے کیونکہ ہر مصنف کا دکھ سانجھا ہے وہ کتاب کی تحریر سے چھپائی اور رسم اجراء تک کی صعوبتیں تکلیفیں برداشت کر چکا ہوتا ہے اسے دوسرے مصنف کا دکھ بانٹنا فرض ہو جاتا ہے مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا...... میں خود بارہ کتابیں شائع کروا کر ہزاروں کو بانٹ چکا ہوں مگر افسوس کہ آدھ فیصد بھی لوگ اس کا حق نہیں پورا کرتے...... خیر......!

جن کو بھی ادب سے محبت ہے وہ اپنی محبت و عشق سے مجبور ہیں اور ایسے عشاق ادب لکھتے رہیں گے کتابیں بھی شائع کرتے رہیں گے اور اپنے دوستوں کو بانٹتے بھی رہیں گے......اور انہی عشاق میں ہماری محترمہ بہن ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بھی شامل ہیں۔ ہماری قلم کار خواتین کا احترام میرے دل میں مرد قلم کاروں سے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے گھر بار بچوں کے فرائض پورے کرنے کے بعد ادب کی آب یاری بھی کرتی ہیں اور جو خواتین ان تمام فرائض کے ساتھ کہیں نوکری بھی کرتی ہیں ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک ڈاکٹر صاحب کی قلم میں مزید برکت دے وہ ادب کی اسی طرح خدمت کرتی رہیں اور اپنی تخلیق سے دنیائے ادب کو سنوارتی رہیں۔ اس سارے جذبے اور خدمت کا اجر اللہ انہیں دے گا۔ ابھی بہت سے ایسے اللہ والے زندہ ہیں جو ڈاکٹر رضیہ اسماعیل جیسے قلمکاروں کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں اور ان کی ہر تخلیق کے لیے آنکھیں بچھائے منتظر ہیں۔

ان کی دو مزید کتابیں بھی میرے پاس موجود ہیں جن پر انشاء اللہ جلد ہی اپنے خیالات کا اظہار کروں گا جو مجھ پر قرض ہے۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ اختتام کرتا ہوں کہ......اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

پوپ کہانی ہی کیوں؟

امجد مرزا امجد

اس سے پہلے بریڈفورڈ کے معروف کہانی کار محترم مقصود الٰہی شیخ کی پوپ کہانیوں پر میرا ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔ جس کے نتیجے میں میں ایک پرانے شناسا سے ناآشنا بن گیا۔ کیونکہ مجھے پہلا اعتراض یہ تھا کہ صنف اردو کی ہو اور نام انگریزی کا......کوئی چچتا ہیں......پھر مختصر کہانی کو صدیوں سے افسانچہ یا مختصر کہانی ہی کہا جاتا ہے ایسی کون سی نئی بات ہوگئی کہ اس کا نام ہی بدل دیا جائے......ہاں البتہ ایک نیا نام دے کر اپنا نام بلند کرنا ہو تو الگ بات ہے اور ادب میں ایسی رسم چل نکلی تو کل غزل، نظم، قطعات کے ساتھ اللہ جانے کیا حشر ہوگا......اور پھر پہلے یہ تو فیصلہ کرلیں کہ یہ نیا نام ''پوپ'' ہے یا ''پاپ''......؟

اور جو کہانیاں پوپ یا پاپ کے نام سے لکھی بھی گئیں ان میں کون سی ایسی انوکھی بات ہے جسے الگ سے نام دیا جائے......کہانی میں خوبصورت و دلچسپ ابتدا، کلائمکس اور انجام وہ بھی ایک نصیحت آموز و جو قارئین کے لیے اچھا پیغام ہو تو وہ مکمل کہانی ہوتی ہے......کوئی معمل بے مقصد خیال ذہن میں آنے پر اسے قلمبند کر لینے سے 'پاپ' تو ہو سکتا ہے 'پوپ' کہانی نہیں بن جاتی۔ جسے قاری پڑھ کر سوچتا رہے کہ یہ تھا کیا......!!

میں اپنی عادت سے مجبور ہوں کہ جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہی لکھ دیتا ہوں کیونکہ یہی قلم کی حرمت ہے محسوس کچھ اور ہو لکھنے میں کچھ اور ہو تو وہ یہ منافقت ہو جاتی ہے اور میں اپنے قلم کے ساتھ کبھی منافقت نہیں کرتا جس کی پاداش میں دو بار کورٹ کچہریاں بھی دیکھ آیا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرا اور میری قلم کا بھرم قائم رہا۔ میری بہت ہی محترم بہن ڈاکٹر

رضیہ اسماعیل صاحبہ کی بھی یہی خوبی ہے کہ وہ سچ کی تلاش میں رات دن ایک کر دیتی ہیں اور انگلینڈ امریکہ کی لائبریریوں کو کھنگال کر سچ نکال لاتی ہیں۔ انہوں نے جب 'پوپ' کہانی کی تاریخ کی تلاش شروع کی تو کہاں سے کہاں جا پہنچی اور پوری ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام نہایت خوبصورت رکھا ''کہانی بول پڑتی ہے'' سچ ہے اگر کہانی نہ بولے تو وہ کہانی نہیں ہے......کوئی پاپ یا پوپ قسم کی ہی چیز ہوتی ہے......!!

کہانی کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے ہر دور میں کہانی زندہ رہی اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اگر کہانی اس دور کے حالات کا عکس نہیں ہے جس میں وہ سنائی یا لکھی جاتی ہے تو وہ محض الفاظی ہے جو قاری کو منٹوں میں بور کر دیتی ہے۔ کہانی وہ ہے جو آپ کی انگلی تھامے اختتام تک لے جائے اور پڑھنے کے بعد آپ آنکھیں بند کر کے گھنٹوں اس کے سحر میں گرفتار رہیں اور دل سے واہ واہ نکلے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحبہ نے 'پوپ' کہانی پر طویل بحث کی ہے اور ثبوت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ 'پوپ' کی پیدائش بریڈفورڈ میں نہیں ہوئی بلکہ امریکہ میں بھی لکھی گئی اور وہ قطعی دو تین سطری کہانی نہیں یا بقول شیخ صاحب ایک ایسا خیال نہیں جو فوراً ذہن میں آئے اور اسے آپ قلم بند کر لیں بلکہ ایک مکمل طویل کہانی ہے جو کئی صفحات تک بھی چلی جائے۔ جس طرح ڈاکٹر صاحبہ نے کنگ وینکلس کی کہانی ''مشین'' کا ترجمہ لکھا جو سات صفحات تک ہے اس طرح دوسری کہانی سرخ، دروازہ، جو نو صفحات تک پھیلاؤ رکھتی ہے۔ پھر انہوں نے خود 'پوپ' کہانیوں کا نام دے کر ''تھرڈ ورلڈ گرل'' جو سات صفحے کی، ''ایئر فریشنر'' چھ صفحات ''آنر کلنگ'' چھ صفحات، ''تھرڈ ڈائمنشن'' سات صفحات، ''گلاس کٹر'' پانچ صفحات، ''گاربیج'' چھ صفحات، المختصر کہ ان کی تمام کہانیاں مکمل کہانیاں ہیں جن میں صفحات کی قید نہیں مگر ان میں کوئی واعظ نہیں اور نہ ہی کوئی فضول تفصیل اور طوالت ہے۔ ان کی گیارہ کہانیاں چاہیے ان کا نام ''پوپ'' ہی کیوں نہ ہو مکمل کہانیاں ہیں جن کو پڑھ کر بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور ایک کے بعد ایک کہانی قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنے مضمون میں قبول کیا ہے کہ 'پوپ' چونکہ انگلش صنف ہے لہٰذا شاید انگریزی الفاظ شامل کرنا ناگزیر ہوں لہٰذا انہوں نے ان کے نام بھی انگریزی رکھے اور الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے جس کو میں ایسا برا بھی نہیں سمجھتا کہ ہماری اردو کئی زبانوں کا مرکب ہے اور آج ہزاروں ایسے نئے الفاظ شامل ہو گئے ہیں جن کا متبادل اردو میں نہیں ملتا۔ اور پھر جو زبانیں غیر ملکی الفاظ کے لیے دروازہ بند کر لیتی ہیں وہ ترقی نہیں کر پاتیں۔ آج انگلش زبان اگر عالمی زبان کا درجہ رکھتی ہے تو اس کی بڑی جہ اس کی فرخدالی ہے کہ اس نے دنیا کے ہر ملک کی زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ ہاں اگر اپنی زبان میں ان الفاظ کا متبادل ہو تو پھر ضروری نہیں کہ غیر ملکی الفاظ کا سہارا لیا جائے کہ ہر کسی کو اپنی زبان سے اتنا پیار ضرور ہوتا ہے۔ میری اردو زبان میں ''افسانہ'' افسانچہ مختصر کہانی، دوسطری کہانی'' جیسے الفاظ موجود ہیں تو مجھ کیا ضرورت ہے کہ اپنی کہانی کا نام ''پوپ یا پاپ'' رکھوں...... ہاں اگر کوئی نیا نام رکھنا ہی ہے تو میں کیوں نہ اسے کہانی اور افسانے کے پیوند سے جنم ہونے والی ''کانچی'' کا نام دوں گا...... نیا نام اگر دریافت ہی کرنا ہے تو اردو میں تو ہوگا نا......آخر پوپ کہانی ہی کیوں......؟

رضیہ اسماعیل......ایک نئی شعری تہذیب

علی اکبر منصور

لاہور

اُردو شاعری میں شاعرات کو فنی و معنوی حوالے سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے جنھوں نے محض روایتِ شعر کی پیروی میں شاعری کی اور ان شاعرات کی فنی و معنوی حوالے سے اپنی کوئی شناخت نہ بن سکی۔ دوسرے قبیلے میں پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور چند اور شاعرات کے نام اہم ہیں۔ انھوں نے اپنی خالص نسوانی ذات اور فطری واردات کو شاعری کا منبع بنایا اور خصوصاً پروین شاکر نے اُردو شاعری کو ایک خوب صورت اور منفرد رنگ دیا۔ پروین کے ہاں عورت اپنے خالص، فطری اور تخلیقی وجود کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھلتی ہے۔ اس کے ہاں فیمنسٹ تحریک کے زیرِ اثر کسی قسم کی مزاحمتی شاعری مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ اس کے برعکس فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید جیسی شاعرات کے ہاں نسوانی تحریک اپنے برہنہ اور غیر فطری خدوخال کے ساتھ موضوعِ شعر بنتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کا یہ مسئلہ رہا کہ وہ ایک مخصوص (Elite) کلاس کی عورت کی جذباتی کیفیات و نفسیات سے باہر نہ نکل سکی۔ چناں چہ اس کی عورت معنوی سطح پر ایک عالم گیر تصور نہیں بنتی۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض کے قبیلے کا مسئلہ یہ رہا کہ انھوں نے خلوصِ شعر و تخلیق کو بہت پیچھے کہیں گم کرنے کے بعد سطحی اور غیر فطری نعرہ بازی کی پیروی اختیار کر لی۔ چناں چہ اُردو شاعری میں خواتین کی شاعری تا حال کسی فلسفیانہ نظام یا کم از کم عورت کے کسی عالم گیر صورت تک نہیں پہنچ سکی۔

اس صورتِ حال میں دیارِ غیر میں بیٹھ کر اور بہت سی ادبی گروہ بندیوں اور سرگرمیوں

سے دور رہ کر رضیہ اسماعیل جو شاعری کر رہی ہیں وہ انتہائی حیران کر دینے والی ہے۔ شاعری نے اس کی روح کو اپنے اندر بسا لیا ہے اور یوں اس پر ہر لمحہ وجدان و آگہی کے لاتعداد در وا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی ذات میں موجزن روحِ شعر نے اسے تمام روایتی سہاروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ چناں چہ وہ خالصتاً اپنی تخلیقی قوت پر انحصار کرتے ہوئے زمینِ ادب پر اپنی بستی اور تہذیب بسا رہی ہے۔

رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور درد کے مماثل ہے، جو ہستی کے مماثل ہے۔ عورت کا یہ عالم گیر تصور اسے تمام خواتین شعرا میں ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان، اسلوب اور موضوعات اس کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتے ہیں۔ گویا اس کا ذاتی شعور اتنا پختہ ہے، ہمہ جہت اور مکمل ہے کہ اسے کسی خارجی نعرے کے سہارے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کی تمام شاعری میں جذبے، احساس اور معنویت کی غیر ممیّز فراوانی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک مکمل فکرمندی (Thesis) موجود ہے لیکن یہ فکر، یہ فلسفہ چوں کہ رضیہ اسماعیل کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتا ہے اس لئے کہیں بھی کوملتا اور احساس سے عاری نہیں ہوتا۔

اس کے ہاں عورت کے ہر روپ کی واردات اور شدتِ احساس زندہ ہے۔ اس کی فکر سے جذبہ پھوٹتا ہے اور جذبے سے فکر و فلسفہ۔

اگر چہ رضیہ اسماعیل کے ہاں ہیئت (Structure) ابھی اپنی پختگی کو مکمل طور پر نہیں پہنچی لیکن یہی امر شاید اس کے اندر نئی ہیئتوں کی تخلیق کا باعث بن جائے۔ اس کے ہاں بعض بنیادی فلسفیانہ موضوعات اور سوالات اور پھر ان کے فکری جوابات ایک ساتھ ذاتی واردات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے حیات و موت، جبر و قدر، انسان اور زندگی کے بارے میں بالکل نیا، جدا اور مؤثر بلکہ زندہ فکری آہنگ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے شعری مضامین میں یہ تمام معنوی صورتیں بالکل فطری، غیر محسوس اور خارجی مطالعے کے اثرات سے پاک محض باطنی واردات کے طور پر شامل ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے شعریت اور فکر و معنویت دونوں انتہائی طاقت ور ہیں اور اس کی شاعری کی صورت میں اُردو ادب ایک نئی شعری تہذیب سے آشنا ہو رہا ہے۔

رضیہ اسماعیل کی غزلیہ شاعری

ڈاکٹر فراز حامدی

انڈیا

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برمنگھم (برطانیہ) میں رہتی ہیں اور بہت باذوق، نہایت باصلاحیت خاتون ہیں۔ شاعری بھی کرتی ہیں اور نثر کے میدان میں بھی اپنے قلم کو جولانی دکھاتی ہیں۔ عام طور پر اردو کے ناقدین کی یہ سوچ ہے کہ اردو کی تیسری بستیوں میں رہنے والے اور سات سمندر پار بسنے والے قلم کار ڈالر اور پونڈ کے بل بوتے پر اردو شعر و ادب کا دم بھرتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن فنکار چھپا نہیں رہتا۔ اس کا فن ہر جگہ بولتا ہے اور وہ اس کی شناخت کو مستحکم کر دیتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کی تخلیقی تصانیف کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ہر ایک قاری یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ وہ ایک اوریجنل شاعرہ اور جینوئن ادیبہ ہیں۔ مانگے کے اجالے سے بہت سے قلم کاروں نے اپنے چراغ روشن کئے ہوں گے لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے ایوانِ شاعری میں جتنی قندیلیں روشن کی ہیں وہ ان کی محنتوں کا ثمرہ ہیں اور پورا برطانیہ ان کی تخلیقی قوتوں کا لوہا مانتا ہے پھر ان کی شاعری بھی غضب کی ہے۔ اگر چہ انہوں نے غزلیں کہی ہیں، نظموں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، ماہیئے لکھے ہیں اور دوہوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور بقول بشریٰ رحمٰن:

ــــ ''رضیہ اسماعیل کی ساری کی ساری شاعری خوبصورت ہے ــــ''

مگر مجھے ان کی غزلیہ شاعری پر گفتگو کرنی ہے کیونکہ ''غزل'' ہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی شخصیت کا قد ناپا جا سکتا ہے اور ''غزل'' ہی وہ آئینہ ہے جس میں شاعر کی فنی بصیرت اور فکری بالیدگی اُجاگر ہوتی ہے۔ رضیہ اسماعیل کو اس کا ہنر بھی آتا ہے۔ عورت تو تخلیق کا منبع

ہے جب وہ خوبصورت بچوں کو جنم دے سکتی ہے تو خوبصورت شعروں کی بھی منصۂ شہود پر لا سکتی ہے ویسے بھی بہ نسبت مردوں کے عورتوں میں حسیات کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ شعر بھی کہتی ہیں تو جذبات و احساسات میں ڈوب کر کہتی ہیں۔ ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض پروین شاکر وغیرہ مشاعرات کی شاعری نے اردو شعریات میں جو تہلکہ مچایا وہ ''عیاں راچہ بیان'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ رضیہ اسماعیل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں اور اپنی شعری صلاحیتوں سے تمام اردو دنیا کو مسحور کر رہی ہیں۔ ان کی ممتاز شاعرانہ خوبی جذبے کی صداقت اور نفاست ہے، وہ اپنے کسی بھی خیال کو پوری وضاحت، دیانت اور شفافیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیواروں پر نقش بناتی رہتی ہوں
خود کو لکھتی اور مٹاتی رہتی ہوں

یاد میں جب بھی باہیں کھول کے آتی ہیں
یادوں سے میں ہاتھ چھڑاتی رہتی ہوں

یہ کیسی درد کی سوغات دی ہے
بنا شعلوں کے جلنا آگیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آگیا ہے

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

ٹوٹا ہوا خوابوں کا نگر دیکھ رہی ہوں
اب دید کی خواہش نہیں پر دیکھ رہی ہوں

یہ چند اشعار منتخبہ اور چنیدہ ہیں۔ بلکہ یہاں وہاں سے اٹھا لیے گئے ہیں کہ ان کی شاعری کا رنگ واضح ہو جائے، واضح ہو کر پروین شاکر نے اپنی خلاقانہ قوت اور فنی صلاحیت سے اردو شاعری کو مالا مال کیا۔ ان کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عورت کے مشہر ذات کے دروازے کھولنے کے لیے ''ضمیر متکلم'' کا واضح طور پر استعمال کیا اور کامیابی و سرخروئی سے ہمکنار ہوئیں۔ رضیہ اسماعیل نے بھی اپنی ذات کے انکشاف کے لیے یہی پیرایہ اپنایا ہے اور جب وہ اشعار کے ذریعے گویا ہوتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری سے برملا باتیں کر رہی ہوں۔ کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں، بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ فکر کی رنگینی اور فن کی سادگی شعر کو دوآتشہ بنا دیتی ہے۔ نسوانی لب ولہجہ میں ان کی نسوانیت، رومانیت کے پہلو بہ پہلو جلوہ گر ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری میں رومانوی خیالات کی فراوانی ہے جو غزل کا خاصہ ہیں۔ مگر ان کی غزل رومانیت سے جدیدیت کی طرف بھی اپنے قدم بڑھا رہی ہے'' گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کہہ کر صرف قلبی واردات کا ذکر نہیں کرتیں بلکہ معاشرتی حالات جب ان کے ذہن وہ دل پر حاوی ہوتے ہیں تو انہیں کہنا پڑتا ہے کہ '' مجھے کانٹوں پر چلنا آ گیا۔'' ان کی غزلوں میں یک گونہ تازگی ہے جو دل و دماغ کو متاثر ہی نہیں کرتی بلکہ دیرپا نقش چھوڑتی ہے۔ ان کے پارہ ہائے دل جب پارہ ہائے افکار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اشعار کی معنویت بدل جاتی ہے، مثلاً:

اک لفظ بھی نظر نہیں آتا کتاب میں
یہ کیا لکھا ہوا ہے محبت کے باب میں

قاتل سمجھ رہا تھا قدموں پہ گر پڑوں گی
پاؤں وہیں تھے آگے مرا سر چلا گیا

دستار سلامت ہے نہ اب سر ہیں سلامت
شانوں پہ لٹکتے ہوئے سر دیکھ رہی ہوں

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

مل جاتے ہیں غم لیکن غم خوار نہیں ملتے
بکتی ہوں جہاں خوشیاں بازار نہیں ملتے

اس قبیل کے بہت سے اشعار یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ معیاری شاعری کرتی ہیں اور عصری حسیات کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بناتی ہیں۔ شاعر ہو یا شاعرہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کبھی کبھی استعارے اور کنایہ سے کام لیتا ہے کیونکہ واشگاف لہجہ غزل کو بوجھل کر دیتا ہے اور جمالیاتی پہلو بھی مجروح ہو جاتا ہے۔ کوئی دریا، پہاڑ کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے تو کوئی چاند ستاروں کو بطور استعارہ استعمال کرتا ہے۔ جگنو، شمع، چراغ جیسی لفظیات بھی کنایۃً شاعری میں برتی گئی ہیں۔ اگر ہم پروین شاکر کی ہی شاعری کا جائزہ لیں تو بارش، شبنم، روشنی، دھوپ، تتلی، گلاب، سانپ، آندھی وغیرہ وہ استعارے ہیں جو ان کی شاعری کو قابلِ قدر بناتے ہیں۔ رضیہ اسماعیل بھی تشبیہ و استعارہ کی مدد سے اپنے غزلیہ اشعار کو پُر تاثیر بناتی ہیں اور اس طرح ان میں دل کشی و جاذبیت پیدا کرتی ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

خالی مکان رہ گیا اور گھر چلا گیا
دیوار چیختی ہے مرا در چلا گیا

پاؤں میں جگنو باندھ کے نکلی سفر پہ جب
رستے سبھی چراغ تھے رہبر چلا گیا

دور کہیں پربت پر سورج روتا ہے
روٹھا ہوا اک چاند مناتی رہتی ہوں

اینٹوں سے مکان بنتے ہیں گھر پیار، وفا سے
بازار میں بکتے ہوئے گھر دیکھ رہی ہوں

غم گھر کی منڈیروں پر آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اس کے آثار نہیں ملتے

بہت پتھر کیا تھا خود کو میں نے
تو بچھڑا تو پگھلنا آ گیا ہے

ہنگامہ ہائے زندگی اور حوادث روزگار اکثر قلم کار کو فکری طور پر بے راہ رو کر دیتے ہیں مگر غنیمت ہے کہ رضیہ اسماعیل نے انگلینڈ کی ہنگامہ خیز زندگی میں بھی اپنی تخلیقی قوتوں کو کسی بیجا آلائش سے آلودہ نہیں کیا ہے اور نہ سستی نعرہ بازی کو اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ پھر ادبی سیاست سے بھی وہ کوسوں دور رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رضیہ جو کچھ کہتی ہیں، اور جو دل پر گزرتی ہے اسی کو بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ کائنات حیرت کدہ ہے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ حیرت زدہ آنکھوں نے جب ارد گرد دیکھا تو سب اپنا ہی لگا، ہر آنکھ اپنی آنکھ اور ہر روشنی اپنی روشنی تھی۔ میری آنکھیں میری نہ رہیں، کائنات میں بکھر کے ہر منظر کے چہرے پر ثبت ہو گئیں، اس اول دل میں سب آنکھیں میری آنکھیں بن گئیں۔ سب نقش میرے تھے، سب رنگ، سب جذبہ، سب کیف و مستی میرے اندر موجود تھی، رگوں میں میں دوڑتا ہوا لہو، ثنا خوانی کر رہا تھا، دل کسی کی یاد میں گریہ وزاری کر رہا تھا۔ ایک شور تھا جو کبھی سکوت میں ڈھل گیا تو کبھی شعروں میں تو کبھی نثر میں اتر کر کاغذ کے وجود سے لپٹ گیا۔ ملی جلی کیفیات کا یہی اظہار کاغذ پر کھینچتی ہوئی لکیروں میں ہے اور یہ متاع حیات قارئین کی نذر رہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ رضیہ نے بہت بہترین طریقے سے اپنے شعری نظریہ کی وضاحت کر دی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ لکھتے وقت اور شعر کہتے وقت ان پر کیا گزرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یک گونہ سرشاری کی کیفیت ملتی ہے اور جذبے کی صداقت ہمیں مسحور کر دیتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں احساسات کی گہرائی و گیرائی دیکھیں:

مرنا پڑے سو بار اگر تو مر جاؤ
پر اپنے کردار کو مرنے مت دینا

منزل دور بہت اور پاؤں زخمی ہیں
چلتے رہو، رفتار کو مرنے مت دینا

کیوں مسیحا مرے درد دل کی دوا ڈھونڈتا ہے
میں تو حیراں ہوں، درد دے کے مجھ اب وہ کیا ڈھونڈتا ہے

روشنی میں اندھیرا، اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن ہے
میں دیئے کو نہیں ڈھونڈتی، اب تو مجھ کو وبا ڈھونڈتا ہے

کہاں جب ماں بچھڑ جائے تو کس دنیا میں جاتی ہے
جواب آیا کبھی کرنوں، کبھی تاروں میں رہتی ہے

کیا جذبات کی لہروں کو دل میں کس طرح دیکھوں
جواب آیا کہ ممتا ہر سمندر میں ہی بہتی ہے

آخر میں راقم الحروف خداوند عالم سے دعا گو ہے کہ مد رضیہ اسماعیل کی تخلیقی توفیقات میں اضافہ فرمائے تاکہ وہ اردو ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے سکیں......

ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد

ایک خوبصورت کتاب ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' جس کا مطالعہ عبادت سے کم نہیں

سلطانہ مہر

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بہت سی نظمیں، نثری کہانیاں ہیں۔ جن میں سماجی عمل کروٹیں لیتا ہے۔ چند مصرعے بہت سی المناک کہانیاں کہہ جاتے ہیں اور اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم جو بظاہر معصوم سے انسان ہیں کس قدر ظالم اور اذیت رساں بھی ہیں۔

کتاب کے صفحہ نمبر 401 پر ایک نظم رقم ہے:

سوگوار بیوہ نے خزاں رسیدہ گلشن سے کہا:

''تمہاری خزاں عارضی ہے
میری بربادی مستقل
بہار آئے گی
مردہ پودے جی اٹھیں گے
مگر مجھ بیوہ کو......
کوئی موسم سہاگن نہ بنا سکے گا!''

کتنے سلیقے سے ڈاکٹر رضیہ نے ایک بیوہ کی زندگی کا پورا کردار ہمارے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ایک زندہ کردار لیکن موت سے ہمکنار، خوشیوں سے محروم، ہمارے آس پاس ہمارے کنبے میں رہتے ہوئے محروم زندگی، معاشرے ہی کی نہیں کنبے کی ماری ہوئی، رنگین کپڑوں سے محروم، قہقہے لگانے سے محروم، حالانکہ اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے اس

پر کسی خوشی کا دروازہ بند نہیں۔ مگر ہم نے اس کی زندگی کا تماشا بنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے یہی نیکی کا کام کیا ہے۔ ہمیں آئینہ دکھایا۔ ان چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظموں کے ذریعے ہمیں آمادہ کیا ہے کہ ہم معاشرے کے فعال افراد کی طرح ان غلط رسم و رواج کے پرخچے اڑا دیں۔ پہلا قدم اٹھائیں۔ اپنے اردگرد دیکھیں اور ایسا کوئی بیوہ کردار نظر آئے تو اسے زندگی دینے میں آگے بڑھیں۔ جرأت سے کام لیں اور اللہ رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کریں۔ بجائے ایسے کاموں اور ایسے افعال کو برے الفاظ سے نوازنے کی غلطی کریں۔

ڈاکٹر رضیہ کی کتاب ''خوشبو گلاب'' کانٹے کے صفحہ 421 پر ایک نظم ہے ''بانجھ''۔ چھوٹی سی نظم ہے۔ سنیئے۔

''کتنی بانجھ عورتیں، بچہ نہ ہونے کی جرم میں، گھروں کی چار دیواری سے باہر دھکیل دی جاتی ہیں بچے تو مرد کا نصیب ہیں'' مگر یہ بات مردوں کی سمجھ میں نہیں آتی ''شاید سمجھ میں آتی ہوگی'' مگر لوگ جان کر بھی انجان بن جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر رضیہ نے کئی جگہ ایسے خودغرض لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے جو جان کر بھی انجان بن جاتے ہیں۔ کیونکہ جان کر انجان بن جانے میں عافیت ہے۔ حالانکہ ہم نئے زمانے میں بیٹھے ہیں مگر یہ نیا زمانہ امریکہ یورپ اور انگلینڈ میں ہے۔ ہندوستان پاکستان میں نہیں۔ وہاں کے گاؤں میں نہیں۔ وارث پیدا نہ ہو تو مرد کو پیدائشی حق مل جاتا ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ تیسری شادی کرلے۔ بانجھ کے نام پر عورت کو طلاق دے۔ اسے بے سہارا بنانے اور روٹی اور سائباں کے سکھ سے محروم کردے۔

گاؤں کے ہسپتالوں میں ڈی این اے کی سہولتیں میسر نہیں اور کہیں میسر ہوں تو مرد کے لیے ان ہسپتالوں کے چکر کاٹ کر علاج کرانے سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ دوسری لگائی اٹھا لائے۔ وارث پیدا کرنا تو تاجداری حاصل کرنے جیسا مرتبہ ہے۔ عورت کو کیا دینا ہے۔ اسے تو صرف روکھی روٹی دینا ہے اور مفت میں گھر کا، کھیت کا اور فصل کا کام لینا۔ ایسا مفت مزدور کہاں ملتا ہے جس کا مقدر آنسو بہانا ہو اور وہ بھی خاموشی سے۔ کوئی صدا بلند نہ ہو۔

میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہے اور بڑی خوبصورت اور جاندار نظموں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نظمیں اس لیے نہیں کہ ہم ورق الٹتے چلے جائیں۔ ان کی کہی ایک نظم آپ کے پیروں سے لپٹی آپ سے تقاضا کرتی ہے کہ مجھے پڑھو۔ مجھے سمجھو اور مجھے برتو۔ میں اسی معاشرے کی تبدیلی کی داعی ہوں۔ میں آج کے دور کی تحریر ہوں۔

ایک دور تھا کہ کسی خاتون کی تحریر کو اخبار میں چھاپنے کی اجازت ہرگز نہ تھی۔ مردوں کا راج تھا مگر ان میں بھی آپس میں حسد بہت تھا۔ مرد حضرات بھی ایک دوسرے کے خلاف کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کی زندگی میں بھی ایک ایسا دور آیا جب ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں انہوں نے شاعری ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تب جناب سر عبدالقادر نے کہا تھا:

''اقبال ایسا ظلم نہ کرنا۔ تمہاری شاعری کی مسلمانوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت اگر سر عبدالقادر بھی اقبال کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو آج ہم بھی علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر سے محروم رہ جاتے۔ اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اچھے معتبر اور سمجھدار دوست اپنے دوستوں کی ہی نہیں قوموں کی زندگی بدلنے کا کردار بھی ادا کر سکتے ہیں۔

خواتین نے بھی اس معاشرے کو معتبر بنانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ عورت ایک گھر کی خالق ہے۔ معاشرے کی خالق ہے۔ اور ایک قوم کی بھی خالق ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو آج ہماری قوم مشرق سے نکل کر مغرب کو نہ صرف آباد کرتی ہے بلکہ یہاں خوشحالی بھی لاتی ہے۔ آج نہ صرف امریکہ پورا یورپ اور انگلینڈ کی روشن روشن مثالیں ہمارے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بڑے خوبصورت نرم لہجے میں احتجاجی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے صفحہ 430 پر مجھے بولنا کیوں سکھایا؟ صفحہ 433 پر اجالا۔

رضیہ نے بے شمار ماہیئے بھی لکھے ہیں۔ اہل نظر کے تاثرات میں ہمارے مطالعہ کے لیے ان کی آرا جمع کی ہیں۔ شاعری کی دلہن غزلوں سے بھی صفحات مزین کئے ہیں۔ غرض کہ رضیہ نے اس کتاب پر جگہ جگہ اپنی تصویری چھاپ مرتب کی ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ رضیہ کو اس کی محنت کی داد دامے درمے قدمے سخنے دی جائے۔

میری طرف سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو سرتا پا مبارک اور پیار ہی پیار۔

ایک حوصلہ مند شاعرہ

سلطانہ مہر
کیلی فورنیا

بچپن میں والدین کی دی ہوئی تعلیم زندگی بھر کے لئے مشعلِ راہ بنی رہتی ہے۔ رضیہ اسماعیل کے والدین نے بھی انھیں بچپن میں حوصلہ مند رہنے اور سچ بولنے کی تعلیم دی تھی۔ رضیہ اسماعیل نے اس پر ہمیشہ عمل کیا۔ گو بقول رضیہ، اس خوبی نے انھیں بہت دکھ دیئے مگر انھوں نے ریا کاری اور منافقت سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ جو سچ جانا، اسے بہانگِ دُہل کہا اور یہی رویہ اس نے اپنی شاعری میں بھی اپنایا۔ مثلاً

جوان چہرے لٹے لٹے سے، نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اجڑی جوانیوں کو میں کیسے عہدِ شباب لکھوں

رضیہ اسماعیل کے ذہن پر بچپن کے تاثرات بہت گہرے ہیں۔ گاؤں کی کھلی فضا، لہلہاتے کھیت، بہتی ندیاں، تاروں بھری راتوں کی مسحور کن فضا میں بالخصوص تہجد کے وقت ان کے والد کے ''اللہ ہُو'' کے دل کش وِرد نے رضیہ کو بہت متاثر کیا۔ کم سن لڑکی رضیہ کے ذہن میں اس کے اطراف و نواح کے ماحول سے جنم پانے والے سوالات نے اس میں غور و فکر کی عادت ڈال دی۔ لیکن ان کا جواب اسے بہت بعد میں ملا۔

رضیہ اسماعیل نے صنفِ شاعری میں غزل کے ساتھ نظم (آزاد، پابند اور نثری) کے علاوہ ماہیے اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ '' گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی پہلی شعری کاوش تھی جس کے بعد ۲۰۰۱ء میں ان کی تین کتابیں نظموں کا مجموعہ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''،

ماہیوں کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں میں'' اور نثری نظموں کا مجموعہ انگریزی تراجم کے ساتھ ''میں عورت ہوں'' شائع ہوا۔ رضیہ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے لکھے، اردو اور انگریزی میں مختصر دورانیے کے سٹیج ڈرامے لکھے۔ کالم نویسی اور رپورتاژ بھی کی۔ مگر طبیعت کی روانی انشاپردازی اور ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی طرف مائل رہی۔ چناں چہ ۲۰۰۰ء میں ''چاند میں چڑیلیں'' کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا۔

نثری نظم کے بارے ان کا کہنا ہے کہ شاعری میں ہر قسم کے تجربے ہونے چاہیے۔ کیوں کہ انسانی طبیعت یکسانیت سے اکتا جاتی ہے۔ نثری نظم کو ابھی تک اُردو ادب میں دل سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اسے اپنی جگہ بنانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر انگریزی اور مغربی ادب میں یہ تجربہ نیا نہیں ہے بلکہ وہاں یہ ایک پختہ صنف کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکی ہے بلکہ اس کے بارے میں تو جارج ایلیٹ نے کہا تھا کہ ''شاعری کی معراج نثری نظم ہے''

رضیہ کے نزدیک کبھی غزل، نظم کے مقابلے میں احساسات کی ترجمانی کر دیتی ہے اور کبھی نظم، غزل کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ یہ سب لکھنے والے کے مزاج کی بات ہے۔ ویسے ذاتی طور پر رضیہ کی طبیعت غزل کی نسبت نظم سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ غزل کی ریزہ خیالی کی نسبت ان کی ذہنی ہیئت تسلسل، تنظیم اور مربوط ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے رضیہ نے نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔

اُردو شاعری میں وہ پروین شاکر کی شاعری کو نسائی شاعری کا سنگِ میل قرار دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اکثر مرد حضرات سے سنا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری نے جینڈر بیریئرز (Gender Barriers) یعنی تذکیر و تانیث کی حد بندی توڑ دی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ پروین نے حد بندیاں توڑی نہیں ہیں بلکہ انھیں اور مضبوط کیا ہے۔ اس نے صرف اور صرف ایک عورت بن کر عورت کے داخلی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ پروین کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ خیال بہت شدت سے

دامن گیر رہتا ہے کہ یہ ایک عورت کی شاعری ہے۔ ان کے خیال میں پروین کے بعد بھی بہت سی شاعرات نسائی احیائی ادب لکھ رہی ہیں۔ مگر جس طرح نثر میں عصمت چغتائی نے عورتوں کو بات کہنے کا حوصلہ دیا ہے، اسی طرح پروین نے نسائی جذبات و احساسات کو بیان کرنے کا قرینہ سکھایا ہے۔ رضیہ کے خیال میں وہ لغت جو عورت کے جذبات و احساسات کی ہر رنگ میں ترجمانی کرے، جہاں وہ کبھی عاشق اور کبھی معشوق، کبھی عورت اور کبھی مرد بن کر سوچے، وہ زبان ابھی ہم نے ایجاد نہیں کی۔ جب تک ہم نسائی تصور کو سمجھنے کے لئے اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو عورت کے انرورلڈ (Inner World) یعنی باطنی نفس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہمیں عورتوں کی تحریروں کو کھلے دل و ذہن سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔

ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کا دیباچہ عدیم ہاشمی نے لکھا تھا۔ انھوں نے پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''رضیہ ایک اوریجنل (Original) اور جینوئن (Genuine) شاعرہ ہے۔ اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے Barriers اگر کراس نہیں کر چکی تو انھیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو (سوائے افتخار نسیم کے) رضیہ اسماعیل سے باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام و مرتبہ پر فائز ہو سکتی ہے۔''

(ماخوذ از ''سخنور پنجم'' ۲۰۰۴ء ...... تذکرہ شعراء و شاعرات ...... از سلطانہ مہر)

خواندنی اور جاذبِ نظر کہانیاں

خواجہ محمد زکریا
پروفیسر امریطس (اردو)
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نظم ونثر میں کہانیوں کے زیرِنظر مجموعے ''کہانی بول پڑتی ہے'' سے پہلے بھی بہت کچھ تصنیف کر چکی ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی خصوصیات کے باعث خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے ان کہانیوں کو 'پوپ سٹوریز' کا نام دیا ہے اور پیش لفظ میں اس اصطلاح کے مطہوم پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ پوپ سٹوریز درحقیقت پوپ میوزک کے زیر اثر وجود میں آنے والی اصطلاح ہے۔ دونوں میں قدرِ مشترک صرف مقبولیت ہے۔ مصنفہ امریکی پوپ سٹوری رائٹر کنگ وینکلس (King Wencles) سے متاثر ہوئی ہیں مگر یہ کہانیاں علامتی ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحبہ کی کہانیاں واقعات کو براہِ راست اور اکھرے انداز میں بیان کرتی ہیں جن کے کردار خصوصاً نسوانی کردار ایک خاص کشش کے حامل ہیں۔ یہ پڑھی لکھی، ذہین، متجسس، دلکش اور متنوع صلاحیتوں کی حامل لڑکیاں ہیں جو اکثر شادی کے بعد انگلینڈ میں سکونت پذیر ہو گئی ہیں مگر ابھی اپنی روایات، عقائد اور اندازِ بود و ماند میں بہت حد تک پاکستانی ہیں۔ وہ اپنے نئے ملک میں نسلی تفاوت اور ماحول کی اجنبیت سے دوچار ہیں مگر ان میں سے بعض رفتہ رفتہ اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جبکہ کچھ ایسی بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں اور مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مقیم متوسط طبقے کے پاکستانی تارکینِ وطن کے کئی مسائل مزاجی

تضادات ان کہانیوں میں منعکس ہوئے ہیں اور ہمیں غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں سے اکثر کے عنوانات انگریزی میں ہیں اور اسلوب میں بھی جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے لیکن یہ سب اس لیے بُرا معلوم نہیں ہوتا کہ جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کے لیے یہ بہت حد تک ضروری ہے تاہم ڈاکٹر صاحبہ جہاں خالص اردو میں لکھتی ہیں وہاں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رواں اور زبانِ اردو کے مزاج کے مطابق نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتی ہیں۔

مصنفہ کے نزدیک 'پوپ کہانیاں' دلچسپی کے عنصر کی حامل ہونی چاہئیں اور یقیناً اس مجموعے کی ہر کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ سہولت کے ساتھ دس پندرہ منٹ میں آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ پاپولر لٹریچر کا بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ یہ قاری کو فلسفیانہ، مابعدالطبیعاتی اور گہرے نفسیاتی مسائل میں الجھانے کی بجائے وہی کچھ پیش کرتا ہے جو دلچسپی برقرار رکھے۔ اس قسم کے ادب کا قاری کبھی کبھی ''پاپولر'' کی حد کو عبور کرکے گھمبیر مسائل پیش کرنے والے ادب کی طرف پیش رفت کر جاتا ہے۔

بہر حال میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ان کہانیوں کو بہت دلچسپی توجہ طلب اور جاذب پایا ہے اور امید ہے کہ دیگر پڑھنے والے بھی انھیں خواندنی (Readable) اور جاذبِ نظر پائیں گے۔

خوشبو، گلاب، کانٹے

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی

خوشبو، گلاب، کانٹے ایک ایسی شعری کتاب ہے جسے ہر گھر میں موجود ہونا چاہیے کیونکہ اس میں گلابوں کی خوشبو بھی اور کانٹوں کی چبھن بھی ہے۔

مرد اگر تنظیم ہے تو عورت تخلیق ہے۔ خوشبو، گلاب، کانٹے میں رضیہ اسماعیل نے اسی تخلیق کی بات کی ہے اور اس کے ہر روپ کو اعتبار بخشا ہے۔

رضیہ کی شاعری میں اگر تازہ گلابوں کی خوشبو ہے تو مرجھائے ہوئے پھولوں کا نوحہ بھی ہے کانٹوں کی چبھن ہے تو درد کی کسک بھی ہے۔ رضیہ نے مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی نا آسودگی، بے انصافی، محرومی، مظلومیت اور عورت پر جبر کی داستان رقم کی ہے۔ جو اس کے داخلی اور خارجی تجربات کا نچوڑ شعری تخلیقات کی شکل میں سامنے آیا ہے جن میں گلابوں کو تم اپنے پاس' اس کی سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں۔ میں عورت ہوں، پیپل کی چھاؤں میں، ہوا کے سنگ سنگ احساس کی خوشبو اور خوشبو اڑتی پھرے شامل ہیں۔

رضیہ اسماعیل اس کامیاب تخلیقی کاوش پر بلا شبہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

(14 اپریل 2012ء خوشبو، گلاب، کانٹے، (کلیات) کی رسم اجراء ادب سرائے کے زیر اہتمام ڈاکٹر امتیاز مزمل نے منعقد کروائی۔ جس کی صدارت نامور دانشور، محقق اور ادیب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی نے کی۔ یہ ان کے صدارتی خطبے کا اقتباس ہے۔

خوشبو، گلاب، کانٹے

باصر سلطان کاظمی

میں نے رضیہ اسماعیل کو متعدد بار مشاعروں میں سنا ہے اور یہ سننا ہمیشہ اچھا لگا۔ اب ان کے پانچ شعری مجموعے ایک ساتھ ملے ہیں۔ بارہ برسوں پہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس شعری سفر سے گزرنا ایک دشوار لیکن خوشگوار تجربہ تھا۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ عورت کا معتبر ترین مقام ماں کی حیثیت میں ملتا ہے اس بات کو عورت کا درجہ بلند کرنے کے لیے کم اور اس کا استحصال کرنے کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے لیکن وہ خود بالعموم دوزخ میں رہتی ہے۔ کافی عرصہ ہوا، ایک معروف کھلاڑی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ عورت کو صرف اس بات سے پہچانتے ہیں کہ وہ ماں کیسی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ عبدالستار ایدھی کے بہت مداح ہیں۔ میں اس سے آگے کی گفتگو نہ پڑھ سکا کیونکہ میں یہ سوچنے لگا کہ موصوف شارلٹ برونٹے، لتا منگیشکر، بیگم ایدھی اور فاطمہ جناح کو کیسے پہچانیں گے۔ چلئے ان خواتین نے تو اپنے کارہائے نمایاں سے اپنی ایک پہچان بنالی لیکن وہ لاکھوں عورتیں جو مائیں نہ بن سکیں، ان کی تو کوئی پہچان ہی نہ ہوئی۔

مجھے بہت خوشی ہوئی جب میں نے رضیہ اسماعیل کے لکھے ہوئے ''خوشبو، گلاب، کانٹے میں شامل نثری نظموں کے پیش لفظ میں یہ سطریں پڑھیں: ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ عورت کو ہمیشہ مختلف رشتوں کے تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ خود اس کی ذات کا شعور اور ادراک نہیں ہوتا۔ کسی بھی رشتے کے فریم میں فٹ ہونے سے پہلے وہ ایک فرد ہے، ایک

انسان ہے۔ اپنے خاص جذبات و احساسات، نظریات، سوچ اور فکر رکھتی ہے...... میرا موقف یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی تکمیل کے لئے بنائے گئے ہیں، کسی قسم کی مسابقت یا ایک دوسرے کی ذات کی نفی کرنے کے لیے پیدا نہیں کئے گئے۔ رضیہ اسماعیل نے درست کہا کہ ان کی زیادہ تر نظمیں معاشرے میں خواتین کے سماجی مسائل پر ہیں۔ غزلیں، بقول عدیم ہاشمی، رومانی لہجے میں زندگی کے دکھ درد اور ہجر و وصال کے تمام مدارج سے گزر کر اور ان دکھوں اور راحتوں کو انتہائی شدت سے محسوس کر کے لکھی گئی ہیں۔ جہاں تک اس شاعری کے معیار کا تعلق ہے تو اس ضمن میں عدیم ہاشمی جیسے شاعر کی رائے ہی معتبر ٹھہرے گی۔ لکھتے ہیں کہ رضیہ اسماعیل کی غزل اور نثری نظم کا معیار اردو ادب کے معیار پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے۔ رضیہ نے غزل اور نظم ایک جیسی توانائی اور ایک جیسی تخلیقی قوت سے لکھی ہے۔ غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابل رشک حیثیت رکھتا ہے۔

ان شعری مجموعوں کے ساتھ مجھے نثر کی کتاب 'چاند میں چڑیلیں' بھی عنایت کی گئی۔ نثر عمدہ اور دلچسپ ہے۔ عنوان سے مجھے خیال آیا کہ بعض شعرا چڑیلوں میں چاند دیکھتے رہے ہیں۔ داغ کا ایک شعر ہے: ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا، پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا۔ اللہ کی پناہ! محبوب ہے یا ویمپائر۔ اسی طرح بعض اشعار میں محبوب کے ہاتھوں پر حنا کی بجائے عاشق کا خون ملتا ہے۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ رضیہ اسماعیل نے دیگر شعبوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ وہ خواتین کے لئے ہی نہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی ایک مثال ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی شاعری ایک جائزہ

فاروق ساغر
برمنگھم

محترمہ رضیہ اسماعیل صاحبہ سے ہماری پہلی ملاقات بڑے تاریخ ساز لمحوں میں بی بی سی ایشین نیٹ ورک کے ایک ادبی پروگرام کے دوران ہوئی تھی...... تاریخ ساز اس اعتبار سے نہیں کہ اس دن کوئی وزیر اعظم کسی عدالت کے کٹہرے میں پیش ہوا تھا یا کسی دھوبی کے کتے نے گھاٹ پر جانے سے انکار کر دیا تھا...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی...... چونکہ آج کل سینسیشنل میڈیا کا دور ہے اس لیے اسی طرح کے واقعات کو عموماً تاریخ ساز واقعات کہہ کر سنسنی پیدا کی جاتی ہے اور اسی سنسنی خیزی کے دوران ہمارے میڈیا والے لاکھوں کے صابن تیل اور جڑی بنیان کے اشتہار بیچ کر اپنی راہ لگتے ہیں کبھی یہ کام لاہور شہر میں شاہدرہ موڑ پر رکنے والی بسوں میں منجن بیچنے والے ہاکر کیا کرتے تھے آج کل یہی کام ہمارے بہت سے نیوز چینل والے بریکنگ نیوز کا جھانسا دے کر کئے چلے جاتے ہیں...... اور دمڑیاں سمیٹے چلے جا رہے ہیں...... خیر چھوڑیئے ان باتوں کو...... ہم ذکر کر رہے تھے تاریخ ساز لمحوں کا جب بی بی سی پر محترمہ رضیہ اسماعیل سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی...... واقعی وہ تاریخ ساز لمحے تھے......

جی ہاں! اکتیس دسمبر سن دو ہزار رات دس بجے سے پروگرام شروع ہو کر نصف شب کے بعد ایک بجے تک چلنا تھا۔ تاریخ انسانی ایک صدی سے گزر کر دوسری صدی میں داخل

ہو رہی تھی......اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ دنیا ایک نئے میلینیم سے ہم آغوش ہونے کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھی...... مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس تاریخی موقعہ پر ایک خصوصی نظم لکھی تھی، جس کا ایک آدھ شعر شاید کچھ یوں تھا کہ

حدیث وقت کے عنوان تو کس خمار میں ہے
نئی سحر کی کرن تیرے انتظار میں ہے

بہر حال محترمہ رضیہ اسماعیل صاحبہ سے پہلی ملاقات اس اعتبار سے یادگار تھی کہ انہوں نے نہ صرف بہت اچھے اشعار سنائے بلکہ اس تاریخ ساز موقعہ کی نسبت سے نہایت خوبصورت اور مدلل گفتگو بھی کی اور بنی نوع انسان کے لیے نئی صدی میں نیک تمناؤں اور بہتر مستقبل کی خواہشات کا اظہار کیا...... یہ ہمارا ان سے پہلا تعارف تھا جو کہ خاصا خوشگوار اور پر اثر تھا۔ اس کے بعد گاہے بہ گاہے ان سے کسی نہ کسی ادبی تقریب میں شرف ملاقات حاصل ہوتا رہا دو ایک بار ان کی رہائش گاہ پر بھی ادبی تقاریب میں شرکت کا موقع ملتا رہا......

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کس بھی لکھاری کے لیے اپنے ادبی سفر کو آگے بڑھانے کے لیے دو ہی اہم چیزیں ہوتی ہیں......اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کسی بھی لکھاری کے پاس دو ہی اہم کوالٹیز ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے ادبی سفر کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ ایک اس کی تخلیقی قوت اور دوسری قدرت اظہار...... اگر کسی لکھاری کے پاس یہ دو بنیادی جوہر موجود ہوں تو اسے وقت کی دیوار پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کرنے سے کوئی قوت بھی نہیں روک سکتی......اور میں سمجھتا ہوں کہ رضیہ اسماعیل اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ قدرت نے انہیں ان دونوں طرح کی خصوصیات سے نوازا ہے وہ اپنے خیالات کو مناسب الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتی ہیں اور خیال

کی نزاکتوں اور تراکیب کے بھید بھاؤ جانچنے کا بھی بہت اچھی طرح سے ادراک رکھتی ہیں۔ ان کی انہی خصوصیات نے ان کی شاعری کو ایک منفرد مقام عطا کیا ہے......ان کی حالیہ شعری کاوش، خوشبو، گلاب، کانٹے ان کے اسی ہنر پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کافی ہے......

محترمہ رضیہ اسماعیل صاحبہ نے اپنی کتاب کے تعارفی گوشے میں بعض بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں جن کا تذکرہ کرنا مجھے یہاں اچھا لگے گا۔

مثلاً یہ کہ ان کا آبائی گاؤں وزیر آباد کے قریب بھروکی چیمہ ہے جو کہ میرے آبائی شہر گوجرانوالہ سے غالباً کوئی پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہوگا اس اعتبار سے وہ ہماری گرائیں بنتی ہیں۔ کیونکہ ہم دیہاتی پس منظر رکھنے والے لوگ دس پندرہ میل کے فاصلے کو کوئی فاصلہ نہیں سمجھتے، بلکہ اتنا فاصلہ تو ہم لوگ چھپکلیاں اور مینڈک پکڑنے کے شوق میں ہی طے کر جاتے ہیں......جی تو میں عرض کر رہا تھا کہ ان کا گرائیں ہونے کی حیثیت سے اگر میری تحریر میں ان کے لیے کوئی جانبداری، اقربا پروری، یا نیپوٹزم کی کوئی جھلک آپ کو محسوس ہو تو اسے ایک انسانی جبلت سمجھ کر درگزر کیجیئے گا...... کیونکہ علاقہ پرستی اور اقربا پروری انسان کی سرشت میں شامل ہے چاہے وہ گوجرانوالہ کا فاروق ساغر ہو یا واشنگٹن ڈی سی کا باراک اوبامہ تھوڑی بہت ڈنڈی سارے مار جاتے ہیں...... جسے محاورے کی زبان میں اندھے کی ریوڑیاں بھی کہتے ہیں......

رضیہ اسماعیل کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بسا اوقات مجھے ان کے اندر ایک شاعرہ کے علاوہ ایک سوشل ورکر یا سماجی کارکن کی جھلک بھی بڑی واضح طور سے دکھائی دے جاتی ہے...... جو اپنے ہی جیسی خواتین کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف

برسرپیکار ہوتی اور علم جہاد بلند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ان کے احتجاج کا یہ آہنگ بعض مقامات پراحتجاج کی حدود سے نکل کر ایک بے بس عورت کے حلق سے نکلنے والی چیخ میں تبدیل ہو جاتا ہے ایک ایسی عورت کی چیخ جو ظلم اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتی ہے اور معاشرے کے ناخداؤں سے اپنا جائز حق بھی طلب کرتی ہے۔

میں نے اپنی طالبعلمی کے دور میں کہیں پڑھا تھا کہ شاعری کو نعرے بازی کی حدود میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ ذاتی طور پر میں نے اس اصول کی ہمیشہ پاسداری کرنے کی کوشش کی ہے......لیکن اس کے باوجود میں اس رویئے کا بھی حامی ہوں کہ جب ظلم اور ناانصافی ایک خاص حد سے تجاوز کر جائیں اور انصاف کی کوئی امید دکھائی نہ دیتی ہو تو ایک انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ چیخ کر بھی معاشرے کی بے حسی کو جھنجھوڑ سکتا ہے......رضیہ اسماعیل کی شاعری میں بعض جگہوں پر ابھرنے والا احتجاج اس بے بس اور مظلوم عورت کی نمائندگی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے ہمارے عہد کے دقیانوسی کلچر میں کبھی غیرت کے نام پر زندہ جلا دیا جاتا ہے اور کبھی مردانگی کے جھوٹے وقار کا بھرم رکھنے کے لیے تیزاب پھینک کر بے چہرہ کر دیا جاتا ہے......ایسی صورت میں اگر شاعری کا کوئی مصرعہ یا نظم کا کوئی بند احتجاجی چیخ کی شکل اختیار کر جائے تو میری رائے میں ایسی مظلوم چیخ کے ساتھ پوری سوسائٹی کو ہم آواز ہو کر اپنے ہونے کا احساس دلانہ بھی انسانیت کی خدمت کے مترادف سمجھ جانا چاہیے۔

محترمہ رضیہ اسماعیل نے اپنی اس کتاب کے تعارفی حصے میں لکھا ہے کہ وہ انیس سو تہتر میں برطانیہ آئی تھی......اس اعتبار سے انیس سو تہتر کا سال پاکستان اور برطانیہ دونوں ملکوں کے لیے ایک تاریخی اہمیت کا سال بنتا ہے کیونکہ اسی سال پاکستان کو تہتر کا آئین ملا اور

برطانیہ کو رضیہ اسماعیل......دونوں اہم واقعات تھے، اگرچہ ان کے جائے وقوعہ کے درمیان دس ہزار میل کا فاصلہ بھی تھا......لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ دونوں اہم واقعات تھے...... اگرچہ ہم پاکستانیوں نے تو تہتر کے آئین کے ساتھ کوئی اتنا اچھا سلوک نہیں کیا اور قدم قدم پر اس کی شکل وصورت بگاڑنے میں اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کیں......تاہم مجھے یقین ہے کہ اہل برطانیہ نے رضیہ اسماعیل کے ساتھ یقیناً اچھا سلوک ہی روا رکھا ہوگا......یا کم از کم اتنا برا سلوک نہیں کیا ہوگا جتنا ہم اپنے آئین اور اس آئین کے بنانے والوں کے ساتھ کرتے چلے آرہے ہیں......میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو لمبی عمر دے رضیہ اسماعیل کو بھی اور ہمارے آئین کو بھی......

اپنی کتاب کے اسی تعارفی حصے میں انہوں نے اپنی شادی سے پہلے والا اصلی تے وڈا نام میرا مطلب ہے اپنا اوریجنل نام بھی لکھا ہے جو رضیہ اسماعیل کی بجائے رضیہ سلطانہ ہوا کرتا تھا......ان کا اصلی نام پڑھ کر مجھے ہندوستان میں مغلوں کے ابتدائی دور کی ایک خاتون حکمران رضیہ سلطانہ یاد آگئی......جس کی حکمرانی کا تختہ الٹنے کے لیے اس دور کے مردوں نے کیا کیا جتن نہ کئے تھے......پھر بھی وہ بھاگوان اپنی حکومت کو چار پانچ برس تک مردوں کی بری نظروں سے بچانے میں کامیاب ہو ہی گئی......آج سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی یہاں برمنگھم کی رضیہ سلطانہ کو شعروادب کی دنیا میں اپنی سلطنت کو قائم رکھنے اور اسے مردوں کی نظر بد سے بچانے کے لیے تقریباً اتنے ہی پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں جتنے کہ ماضی میں حکمران رضیہ سلطانہ کو بیلنے پڑے تھے......سچ تو یہ ہے کہ مرد چاہے برمنگھم کے ہوں یا سرنگاپٹم کے ہر دور میں رضیہ سلطانہ کو اپنے قدم جمانے اور حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک جیسی ہی جدوجہد کرنی پڑتی ہے......

اپنے اسی تعارفی حصے میں ایک جگہ پر انہوں نے اپنے آپ کو اپنی ادبی تنظیم آگہی کا

تاحیات صدر لکھا ہے......ان کے تاحیات صدر رہنے والے دعوے سے نجانے کیوں مجھے
صدر ضیاءالحق مرحوم یاد آ گئے...... وہ آئے تو نوئے دن کے لیے تھے۔لیکن پھر وہ نوے دن
کا سلسلہ ان کی تاحیات صدارت تک پھیل گیا...... وہ تو ہماری قوم کی خوش قسمتی تھی کہ
ہمارے پاس ایک بڑا سا جہاز موجود تھا جس نے ضیاءالحق سے ہماری جان چھڑوا دی......
ورنہ وہ تاحیات صدر رہنے کی بجائے تاقیامت صدر بنے رہنے کا بھی فیصلہ کر چکے ہوئے
تھے...... بہرحال بات ہو رہی تھی محترمہ رضیہ اسماعیل کے ''آگہی'' کی تاحیات صدر بنے
رہنے کی...... ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں رہتی دنیا تک آگہی کی صدارت کے عہدے پر
قائم و دائم رکھے...... چلتے چلتے اگر وہ ہمارا ایک حقیر سا مشورہ قبول فرمالیں تو شاید ان کے
لیے بھی کارآمد ہو کہ اپنی زیر صدارت وہ عزیزم اسماعیل صاحب کو بھی اپنے ساتھ اسی تنظیم کا
وزیراعظم مقرر فرما دیں تو اس سے تنظیم کا کورم بھی پورا ہو جائے گا اور ویسے بھی برادرم
اسماعیل صاحب اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وزیراعظم محمد خان جونیجو کا سیکنڈ ورژن معلوم
ہوتے ہیں۔

انہوں نے اپنے تعارفی گوشے میں ایک اور جگہ پر اپنے دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ
قلم کی ناز برداریاں کرنے کو بھی اپنے مشاغل میں شامل کیا ہے...... عام طور سے ہمارے
مشرقی کلچر میں خواتین اپنے شوہروں کی ناز برداریاں کرنے کو ہی زندگی کا طرہ امتیاز سمجھتی
ہیں......لیکن ہماری ایسی خواتین جو اتفاق سے شاعری بھی کرتی ہوں ان کے شوہروں سے
مجھے ایک خاص طرح کی ہمدردی ہمیشہ سے رہی ہے......ایک تو بے چارے ان معصوم صفت
شوہروں کو اپنی بیویوں سے ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ ان کی شاعری بھی سننی پڑتی ہے......اس
پر اگر بیوی قلم کی ناز برداریوں میں جت جائے تو گویا دو وقت کی روٹی بھی ہاتھ سے گئی......

ایسے ستم زدہ شوہروں سے تو ایک ہی التجا کی جاسکتی ہے کہ انہیں جب بھی بھوک ستانے لگے
وہ فیض صاحب کی مشہور نظم ......آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے......جس نے اس
دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے...... گنگنا لیا کریں......اس سے ان کا دکھ بھی کم ہوگا اور بھوک کے
احساس میں بھی کمی واقعہ ہوگی......

محترمہ رضیہ اسماعیل نے اپنے حالیہ مجموعہ کلام،خوشبو، گلاب کانٹے، میں جو کہ ان کے
گزشتہ چار مجموعوں کو ملا کر یکجا کیا ہے اور اسے ایک کلیات کی شکل دے دی ہے۔اس سے
جہاں ایک طرف ان کا اب تک کا سارا تخلیقی کام ایک جگہ اکٹھا ہو گیا ہے،تو دوسری جانب
ان کے اب تک کے سارے تخلیقی سفر کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کرنا بھی نسبتاً آسان ہو گیا
ہے......ادب کے ادنی طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان کے ہاں مختلف اصناف سخن کی ایک
ایسی ست رنگی کہکشاں نظر آتی ہے جس میں نظم، غزل، ماہیہ، قطعات، دوہے حمد و نعت اور
مکالماتی غزل جیسے مشکل میدانوں میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی فنی اور تخلیقی
مہاروت کے ثبوت فراہم کیے ہیں......

کچھ عرصہ سے ہمارے بعض پیشہ ور نقادوں نے اردو شاعرات کی ادبی اور شعری
قامت کو جانچنے کا ایک عجیب سا پیمانہ ایجاد کر رکھا ہے......یعنی جس شاعرہ سے وہ خوش
ہوتے ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے پروین شاکر سے بڑی شاعرہ قرار دے کر
حساب چکتا کرتے ہیں اور اگر قہر بر درویش جاں کے مصداق معاملہ اس سے الٹ ہو تو اس
صورت میں بھی بیچاری پروین شاکر کی روح کو ہی اذیت دیتے ہوئے اسے پروین شاکر
سے چھوٹی شاعرہ کہہ کر قصہ تمام کر دیتے ہیں......

نجانے ایسے میں مجھے ان صاحب کا قصہ کیوں یاد آ جاتا ہے جو ایک سرکاری محکمے میں افسری کے امیدوار تھے...... جب ان سے انٹرویو کے دوران ان کی انگریزی کا لیول چیک کرنے کے لیے پوچھا گیا کہ اگر آپ نے کسی کو اپنے کمرے میں بلانا ہوتا کیا کہیں گے......

امیدوار نے فوراً جواب دیا...... میں کہوں گا کم ان...... کم ان......

اچھا اب یہ بتایئے کہ اگر کسی کو کمرے سے باہر بھیجنا ہو تو کیا کہیں گے...... امیدوار کا جواب تھا...... میں کمرے سے باہر جاؤں گا اور کہوں گا پلیز کم ان......

بدقسمتی سے پروین شاکر کے ساتھ بھی ہم نے یہی کم ان والا فارمولا روا رکھا ہوا ہے...... تعریف ہو یا بدتعریفی دونوں صورتوں میں مصلوب پروین شاکر کو ہی کیا جاتا ہے...... گویا پروین شاکر نہ ہوئی کوئی کپڑا ناپنے کا گز ہو گیا کہ جس سے ناپے بغیر نہ قمیض بن سکتی ہے اور نہ شلوار......

میری ایسے احباب سے دست بستہ گزارش ہے کہ اگر ہو سکے تو کبھی کبھی پروین شاکر کے علاوہ بھی کسی دوسری شاعرہ یا شاعرات مثلاً۔ ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شبنم شکیل، نوشی گیلانی اور سارا شگفتہ اور ثمینہ راجہ وغیرہ پر بھی نظرِ کرم فرما لیا کریں...... اس سے پروین شاکر کے کندھوں کا بوجھ بھی کم ہو گا اور اردو شاعری کے ایک عام قاری کو متنوع قسم کی شاعرانہ ورائیٹی کو سمجھنے اور جاننے کا موقع ملے گا......

بہرحال اصل بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رضیہ اسماعیل کی شاعرانہ قامت کا جائزہ لینے کے لیے مجھے نہ تو پروین شاکر کی یارڈ اسٹک استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی قرۃ العین کی فارسی شاعری سے مثالیں پیش کرنے کی حاجت......

سیدھی سادھی سی بات یہ ہے کہ رضیہ اسماعیل اپنی ذات میں خود ایک نہایت مستند اور معتبر شاعرہ کے طور پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہیں اور ان کے کام کو جانچنے کے لیے کسی

پیشہ ور نقاد کے تعریفی سرٹیفکیٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے، بقول حضرت امید فاضلی......

میں اپنے سچ پہ کسی کو گواہ کیوں لاؤں...... میری غزل میرا سب سے بڑا حوالہ ہے۔

بہرحال میں اس خوبصورت تقریب کے موقعہ پر محترمہ رضیہ اسماعیل صاحبہ کو ان کی اس خوبصورت کاوش پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کی کامیابیوں کا یہ سفر اسی خوبصورتی کے ساتھ رواں دواں رہے...... ادب میں میرا مقام صرف اتنا سا ہی ہے کہ میں ان کے لکھے ہوئے حرف کو ادب اور احترام کے ساتھ پڑھوں اور ان کی اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مشرق کی بیٹی

ڈاکٹر حسن رضوی

لاہور

فن کا دیا چاہے کہیں بھی روشن ہو، اس کے راستے میں سرحدیں حائل نہیں ہوتیں۔ ایک ایسا ہی دیا رضیہ اسماعیل کی صورت میں برطانیہ کے شہر برمنگھم میں روشن ہے جس کی لو میں اگر روایتی غزل نظر آتی ہے تو آزاد اور نثری نظموں کی چاشنی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو ماہیے کی روایت کو بھی بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے جب کہ پنجاب میں، جو ماہیے کا روایتی گھر ہے، یہ روایت آہستہ آہستہ ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں طنز و مزاح کا چسکا بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جو ملک سے باہر رہتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کی صورت میں انھوں نے ''چاند میں چڑیلیں'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔

وطن میں رہتے ہوئے زندگی کو محسوس کرنے اور برتنے کا سلیقہ اور انداز اور ہو سکتا ہے، جب کہ وطن سے دور اجنبی تہذیب میں اپنی روایات اور قدروں کے حوالے سے بات کرنے کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ وطن میں گلی، محلے اور ارد گرد کی چیزوں کا احساس کچھ اور ہے جب کہ وطن سے دور رہتے ہوئے اگر یہاں کی خوب صورتیاں یاد آتی ہیں تو منفی رویے بھی یادگار ہوتے ہیں۔ یہاں کے گندے جوہڑ، تنگ و تاریک گلیاں اور غلاظتیں بھی مثبت رویوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کے ماہیے پڑھتے ہوئے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب تک جتنی بھی پنجابی اور اُردو ماہیوں کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان سب میں عموماً ایک ہی رو میں، ایک ہی طرح کے ماہیے کہے گئے ہیں۔ مگر رضیہ اسماعیل نے ماہیے کی ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے اپنی کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ کتاب میں حمدیہ اور نعتیہ ماہیوں کے ساتھ ساتھ پنجاب رنگ، عورت کہانی، شہیدانِ کربلا، ولایتی ماہیوں اور پھر وطن کے حوالے سے نہایت متحرک قسم کے ماہیے انھوں نے الگ الگ حصوں میں پیش کیے ہیں۔ انھیں پڑھ کر شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وطن سے دُور رہ کر انھوں نے اپنی مٹی سے ناتا نہیں توڑا۔ اپنی روایات سے بندھے رہنے کو ہی اپنی پہچان بنایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ایک طویل عرصہ مغرب میں رہنے کے باوجود وہ مشرق کی ہی بیٹی ہیں۔

(یہ مضمون لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب میں ۲۰۰۱ء میں پڑھا گیا تھا)

ایک نظریاتی شاعرہ

فرحت عباس شاہ

لاہور

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بیش تر شاعروں اور خصوصاً غزل کے شاعروں کو شاعری میں نظریہ اور نظریہ سازی کا علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ ہے کیا بلا اور ان کے نزدیک صرف قافیہ پیمائی ہی بنیادی وصف ٹھہرتا ہے۔ جن معدودے چند شاعروں کو نظریاتی شاعری کا شوق ہوتا ہے ان کی اکثریت سوڈوازم اور نعرہ بازی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں خواتین کو سیاسی یا نظریاتی شاعری کا شوق آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ جذبات کے نام پر جنسی اور فحش شاعری کی طرف لے گیا۔ یوں ہمیں اُردو ادب میں نظریاتی شاعری کا فقدان ہی فقدان نظر آتا ہے۔

رضیہ اسماعیل دنیائے شعر میں یک دم نمودار ہوئی ہیں اور اُردو شاعری کے سنجیدہ قاری کو حیران کر گئی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی اور انسانی معاشرتی پیچیدگیوں کا اتنا عمیق اور باریک مشاہدہ نظر آتا ہے اور پھر ایسے شاعرانہ انداز میں نظر آتا ہے کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کے موضوعات میں عورت کی محرومیاں اور عورت کے ساتھ ہونے والی تہذیبی ناانصافیاں نمایاں موضوع کے طور پر ملتی ہیں۔ عورت کی بے کسی اور بے بسی کا درد دنیا بھر کی نسوانی تحاریک کی طرح مرد سے نفرت کے اظہار کا باعث بننے کی بجائے زمانے اور فطرت سے انصاف کا طالب ہوتا ہے اور اپنے اندر رشتوں کی تفریق پر نوحہ کناں ہو کر شاعرانہ فرائض کی بجا آوری کا موجب ٹھہرتا ہے۔ رضیہ اسماعیل بجا طور پر نظم بلکہ جدید نظم کی

شاعرہ ہیں اور اپنے اسلوب، موضوعات اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے بہت مختلف اور جدا نظر آتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی وہ روحانی اور متصوّفانہ موضوعات کی طرف بھی آئیں گی اور پھر ان کی شاعری کی آخری جہت (Final Dimension) کا مرحلہ اس کے بعد ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہماری شاعری کو بجا طور مالا مال (Enrich) کیا ہے۔

شاعرۂ خوش گفتار

عثمان صدیقی

لاہور

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

یہ شعر بجائے خود سخن ور کا تعارف ہے۔ اُس کے مزاج، اندازِ فکر، خود داری و خود اعتمادی کو پیش کرتا ہے۔فکر وفراست کی اساس کو ظاہر کرتا ہے۔کسی کا دست نگر ہونے کی بجائے حوصلہ مندی کا درس دیتا ہے، اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تلقین کرتا ہے اور زندگی میں سخت کوشی کی تعلیم دیتا ہے۔کیوں کہ

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی، رنگیں

اس شعر کی خالق رضیہ اسماعیل ہیں۔مصرعہ اولیٰ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی غزلوں، نظموں کی کتاب کا عنوان ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں سے تعلیم حاصل کرتی ہوئی برطانیہ پہنچیں اور اب سوشل ورک میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ پاکستانی خواتین کی متعدد ادبی اور ثقافتی انجمنوں کی رکن اور ''آ گہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔

اِس مختصر تعارف کے بعد میں ان کے مذکورہ شعر کی طرف آتا ہوں۔ یہاں گلاب واپس نہیں کیے جا رہے، ورنہ لفظ ''رکھ لو'' آتا۔ بات یہ ہے کہ سرے سے پیش کش ہی قبول نہیں۔پیہم کوشش اور سخت کوشی نے زندگی کی وادیٔ پُر خار میں چلنا آسان کر دیا ہے۔ یہ شعر بظاہر ایک خوب صورت شعر ہے مگر بڑی فکری ریاضت اور احوال و آثار پر نگاہ و تجزیہ کا نتیجہ

ہے۔ یہ پاکستان کے اربابِ حل و عقد کے لئے بھی راہ نما ہے۔ یہ شعر اتنے تہہ در تہہ معانی رکھتا ہے کہ بات بڑھتے بڑھتے اسی پر ختم ہو سکتی ہے۔ رضیہ اسماعیل نے اُردو کے شعری سرمایہ کو بہت کچھ دیا ہے۔غزلیں، نظمیں، نثری نظمیں، ماہیے، دوہے اور کیا کیا کچھ۔مگر میرا موضوع ان کی غزلیں ہیں۔''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' میں کل پچپیس غزلیں شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ رضیہ اسماعیل نے صرف اتنی ہی غزلیں کہی ہوں گی۔مگر یہ مثال ہے خود احتسابی اور انتخاب کی، ورنہ نو آموز تو دیوان پر دیوان چھپوا رہے ہیں۔

ان کی ہر غزل اپنی جگہ پر انتخاب ہے اور یہاں وہ معتبر شاعروں اور شاعرات کی ہمسر نظر آتی ہیں۔

غزلوں کا بنیادی جو ہر تغزل ہے اور مناسب الفاظ کا انتخاب، ان کا در و بست اور خیال افزونی۔رضیہ کی غزلوں میں یہ بنیادی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔اسی غزل کے دو تین شعر مثالاً درج ہیں۔

یہ کیسی درد کی سوغات دی ہے
بنا شعلوں کے جلنا آ گیا ہے

تجھے یہ سُن کے دُکھ ہو یا خوشی ہو
مجھے گر کر سنبھلنا آ گیا ہے

کیا خود سپردگی کا انداز ہے۔

محبت ہے کہ تو نفرت ہے، جو ہے
ترے سانچے میں ڈھلنا آ گیا ہے

رضیہ صاحبہ کی ساری غزل درد و الم، ہجر و فراق اور دل خون ہونے کی داستاں ہے۔ قدم قدم پر بے وفائی کا تذکرہ ہے مگر ایک اندازِ صبر و سکون ہے۔ کیوں کہ حوصلہ شرطِ عشق ہے۔لہٰذا ہر جگہ حوصلہ مندی ہے۔مثلاً:

بدلے میں وفاؤں کے تم اور تو کیا دیتے
میری ہی وفاؤں کا تھوڑا سا صلہ دیتے

آئے تھے جو تربت پر، اتنا تو کیا ہوتا
دو پھول چڑھا دیتے، اک دیپ جلا دیتے

دل خون ہونے کی کیفیت ملاحظہ ہو اور یہ جگہ جگہ ملتی ہے۔

دل توڑ دیا تم نے ، دل خون کیا ہوتا
اس خون کی رنگت سے تصویر بنا دیتے

گلشن کی کیفیت کو اس طرح پیش کرنا خصوصی توجہ کی دعوت دیتا ہے۔

ہر ایک پھول کلی کو بلا رہا ہے قریب
چمن میں آئے ہیں اب کے کمال کے موسم

زندگی دراصل انسان کی ملکیت نہیں کہ جیسے چاہے اسے برباد کر دے۔ یہ عالمِ انسانیت کی امانت ہے۔ کتنی اصلی فکر ہے۔ کیسا عظیم فلسفہ ہے اور کتنا عمیق مشاہدہ ہے۔

یہ زندگی کسی کی امانت ہے دوستو
گِن کے بتاؤ جتنے بھی لمحے گنوائے ہیں

چھوٹی بحروں میں رضیہ اسماعیل نے نہایت اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے اور بڑی خوب صورتی سے اپنی شخصیت کے امکانات کو ظاہر کیا ہے۔ بعض اشعار تو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں جسے ہم نشریت سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل سادہ الفاظ اور چھوٹی بحر میں پُر اثر شعر کہنا پُل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے بشرطیکہ شعر میں سادگی کے ساتھ ساتھ پُرکاری اور اثر انگیزی موجود ہو۔ سب سے ہٹ کر تبدیلی لانے کی خواہش کو یوں بیان کیا ہے:

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں مجھ میں
میں بارش ہوں، برسنا چاہتی ہوں

اندازِ بیاں کی ندرت ملاحظہ ہو۔ خیال کو کس خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں تشبیہ بڑی اعلیٰ ہے:

یہ بدلی اس طرح سے چھٹ رہی ہے
کہ جیسے رخ سے چلمن ہٹ رہی ہے

لکھا دیوار پر دیکھا تھا میں نے
زمانے سے محبت گھٹ رہی ہے

کیا شوخ اندازِ بیان ہے مگر ااضافے کے ساتھ حسنِ ذات کی پردہ داری کرتے ہوئے:

صنفِ نازک ہوں اس لئے شاید
سب نے ہی مجھ سے آشنائی کی

اور پھر:

ہر پل کو دیکھ کے ڈرتی ہوں
ہر وقت سے دھوکا کھایا ہے

رضیہ اسماعیل نے کچھ مکالماتی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی روایت گفتم، گفتا کے ساتھ فارسی شاعری میں قدیم ہے۔ علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں اس کے نمونے زیادہ ملتے ہیں مگر اُردو شاعری میں خال خال ہیں۔ عدیم ہاشمی نے اس روایت کو تازہ کیا اور رضیہ اسماعیل نے اس کے تتبع میں چند مکالماتی غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہا، عورت کو کیوں سمجھا نہیں ہے آج تک کوئی
جواب آیا، کہاں سمجھیں گے عورت تو پہیلی ہے

کہو، غمگین چہرے پر تمھیں کیسی لگی آنکھیں
کہا، ویراں سرائے میں دیئے جلتے ہوئے دیکھے

کہو، انسان کے غم میں کبھی غمگیں ہوئے تم بھی
کہا، آنسو فلک کی آنکھ سے گرتے ہوئے دیکھے

وقت کی قلت کے پیشِ نظر یہ ایک انتہائی تشنہ جائزہ ہے۔ رضیہ اسماعیل کی شاعری نقد ونظر کے لئے ایک پُر مغز مقالہ درکار رہے۔

(۲۰۰۱ء میں لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا)

برطانیہ میں اُردو کی اَن تھکی مزدور خاتون

ڈاکٹر صفات علوی
بریڈفورڈ، یو۔کے

اکثر مائیں اپنے بچوں کو ننھیال سے جڑے قصے سناتی ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں اپنی ماں سے ان کے ایک دُور افتادہ بھائی کا قصہ سنا تھا۔ جواَب پورا تو یاد نہیں لیکن کچھ اس طرح تھا کہ میرے ایک ماموں ''چندا'' تھے۔ ان کی کوئی پریمیکا تھی۔ لیکن قابیل نامی کسی زمین زاد نے اس پریمیکا کو مار ڈالا جس سے ماموں کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی اور وہ گھر چھوڑ اپنی پرانی ملازمہ کو ساتھ لے کر دور آسمان پر جا بسے۔ اب وہ ملازمہ بوڑھیا ہوگئی ہے اور چندا ماموں کے گھر میں بیٹھی چرخے پر سوت کاتتی ہے۔ ادھر چندا ماموں ہم زمین زادوں سے بدلہ لینے کے لئے خود تو تھالی میں کھاتے ہیں اور ہمیں صرف ٹھینگا دکھا کر تھوڑا سا دودھ پیالی میں دیتے ہیں۔ جب ان کو بھانجوں بھانجیوں پر بہت غصہ آتا ہے تو سکڑ کر انگلی کے ناخن کی طرح منحنی ہو جاتے ہیں اور جب یہ غصہ کم ہوتا ہے تو ''پورن ماشی'' بن کر ہم سب پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہیں۔

قصے کہانیاں تو تخیل کی پرواز ہیں۔ اور جیسے جیسے انسان اپنے سن بلوغ کی طرف بڑھتا ہے اس کا تخیل بھی پھلتا پھولتا ہے۔ سنا ہے جب سے آج کی ترقی یافتہ اقوام کے دہشت پسند گھس بیٹھیوں نے چندا ماما کے گھر پہنچ کر غریب بڑھیا کو مار ڈالا ہے اس کی روح چڑیل بنی چندا ماموں کے گھر میں بھٹک رہی ہے۔

معاف کیجئے کہنا کچھ اور تھا اور بات چل پڑی قصہ کہانی کی۔ ہاں تو بات یہ تھی کہ ایک

دو ہفتے قبل ٹیلی فون پر ایک فرمائش موصول ہوئی۔ ایک نقرئی نسوانی آواز میں فرمائش تھی کہ ان کے ادبی گوشے کے لئے میں چند سطور رقم کروں۔ اس قسم کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں دقت یہ پیش آتی ہے کی اگر سچ بات لکھ دی جائے تو ممدوح سے تعلقات خراب ہی نہیں بلکہ بالکل بریدہ ہو جاتے ہیں لیکن اس بار سچ کہنے پر ایسا کوئی ڈر نہیں۔

چند سال ہوئے میرے ایک بزرگ جناب محمود ہاشمی نے رضیہ اسمٰعیل کو مجھ سے ٹیلی فون پر متعارف کرایا تھا۔ اس وقت اس خاتون نے برطانیہ میں اردو کی خواتین قلمکاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی تھی۔ اس ڈائرکٹری کے لئے موصوفہ نے محمود ہاشمی صاحب سے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن محمود ہاشمی صاحب نے مضمون لکھنے کا قرعہ میرے نام نکالا۔ جس کی میں نے تکمیل کی۔ جب یہ ڈائرکٹری مکمل ہوگئی تو موصوفہ نے اس کی تقریبِ اجرا (آج کی زبان میں تقریبِ رونمائی) میں بلا کر مجھے عزت بخشی تھی۔ اور اس طرح ان سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار برمنگھم کے ایک دورے میں محترمہ طلعت سلیم صاحبہ اور محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی۔ تب پتا چلا کہ یہ طبعی شاعر ہیں۔ اچھا کلام کہتی ہیں۔ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں۔ ویسے تو برطانیہ میں اردو کے شاعر بہت ہیں اور ان کی وجہ سے برطانیہ میں مشاعروں کا بازار بھی گرم ہے اور بقول ان کے اس وجہ سے برصغیر ہند سے باہر اردو کی ایک بڑی ''درگاہ'' جزائر برطانیہ میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے مجاوروں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو ''ساڑھے کلچر'' کے چھکڑے پر سوار مقامی کونسلوں کے تعاون سے متشاعروں کو شاعر بنا کر اس تکیہ کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پر رضیہ ان سے مختلف ہیں۔ شاید پہلی بار کسی نے، خواہ وہ صرف خواتین قلم کاروں کی ہی ہو، اردو کے قلم کاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی اور جزائر برطانیہ کے طول و عرض میں رہنے والی خواتین و مرد قلم کاروں کے لئے ایک دوسرے سے رابطے کی صورت مہیا کی۔

128

پھر چند مہینے ہوئے برمنگھم سے کتابوں کا ایک پارسل بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ کھولا تو دیکھا کہ اس میں رضیہ اسمٰعیل کی کئی تصانیف ہیں۔ اور میرے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ اس خاتون کا شاعری کے علاوہ نثر لکھنے کے شریفانہ پہلو سے بھی تعلق ہے۔ وقت کی کمی (ویسے یہ عذر لنگ ہے) کی وجہ سے میں ان کی تمام تصانیف کا مطالعہ نہیں کر سکا لیکن ان کی تین کتابیں ''چاند میں چڑیلیں'' (نثر) ''میں عورت ہوں'' اور ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' (مؤخرالذکر دونوں شعری مجموعے اور ان میں اول الذکر میں ان کی نثری نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے) نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت ہے۔ ان کی نثر میں طنز کا پہلو نمایاں ہے، ایسا طنز جو زندگی کی حقیقتوں پر سے اس طرح پردہ اُٹھاتا ہے کہ قاری طمانچہ محسوس تو کرتا ہے لیکن بلبلاتا نہیں یہ دوسری بات ہے کہ مزاح کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما جائے۔ محمود ہاشمی صاحب نے بالکل سچ کہا ہے...... ''شاعروں اور مشاعروں کی بالادستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے''۔ محمود ہاشمی کی طرح اس راقم الحروف کو بھی امید ہے کہ رضیہ اسمٰعیل نثر نگاری کی طرف مزید توجہ دیں گی اور اس شریفانہ صنف ادب میں گراں قدر اضافہ کریں گی۔ تاہم طنز پر مزاح کی کھٹی میٹھی تہہ جمانے سے پہلے محترمہ رضیہ اسمٰعیل کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مزاح کی تہوں کے نیچے طنز کا تیز دھارا بالکل کھٹّل نہ ہو جائے۔ کیوں کہ جب کسی قوم میں اقلیت کے افراد ایک طویل مدت تک غلامی یا کثیر التعداد فرقے کے جور و ظلم سے گزرتے ہیں تو ان کی نفسیاتی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ ان پر کئے گئے کسی قسم کے استحصال کو استحصال نہیں سمجھتے اور وہ ہر ذلت کو برداشت کر جاتے ہیں۔ ان کے ضمیر کو جگانے اور ان میں فعل کی قوت کو متحرک کرنے کے لئے سیدھے سبھاؤ سے کہی بات موثر نہیں ہوتی تا آنکہ کہی بات سے ان کے منہ پر ایسا کھلا تھپڑ نہ پڑے جس سے وہ تلملا کو متحرک ہو جائیں۔ لیکن بہت زیادہ مزاح کی موجودگی اکثر اوقات قاری میں ہنسوڑ کی کیفیت پیدا کر کے طنز میں ڈوبا

پہلو بالکل بے اثر کر دیتا ہے۔

محترمہ رضیہ اسمٰعیل اس لحاظ سے قابل مبارک باد ہیں کہ انہیں ابلاغ کے سلسلے میں عصری تقاضوں کا علم ہے چنانچہ جہاں تک مجھے علم ہے برطانیہ میں یہ پہلی اردو ادیبہ ہیں جنہوں نے اردو ادب کے سلسلے میں ایک ویب سائٹ ''آ گہی'' کا اجرا کیا ہے۔

میری دعا ہے کہ محترمہ رضیہ اسمٰعیل اسی طرح برطانیہ کے اردو ادب کی ترقی میں معاون رہیں۔

ہمہ جہت شاعرہ

شاہد بخاری

لاہور

محترمہ رضیہ اسماعیل کی شاعرانہ حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ ہر چند کہ ان کا مستقر برمنگھم ہے مگر پاکستان سے ان کا رابطہ بدستور ہے ۔ ہر سال وہ لاہور آتی ہیں ۔ مشاعروں میں شریک ہوتی ہیں، ادبی تقریبات میں بلائی جاتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے کہ اپنی کتابوں کی افتتاحی تقریبات کے لئے بھی انھوں نے لاہور کا انتخاب کیا، اگرچہ برمنگھم میں وہ متعدد ادبی تنظیموں کی روحِ رواں اور ''آ گہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''، ''میں ایک عورت ہوں''، ''چاند میں چڑیلیں''، ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''اور ''پیپل کی چھاؤں میں''

ایک مختصر جائزے میں ان کی تخلیقات کا احاطہ کرنا اور ان کی ادبی و شعری خصوصیات پر خاطرخواہ نظر ڈالنا کارِ دارد ہے۔ دراصل اس کے لئے ایک مربوط مقالہ یا کتابچہ درکار ہے، جب کہ وقت کی محدودیت کا تقاضا کچھ اور ہے۔

ان کا مجموعہ ''میں عورت ہوں'' نثری نظموں کی شکل میں ہے جس میں کم و بیش پچیس نظمیں ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ علی الترتیب ساتھ ساتھ ہے۔ دائیں طرف اُردو نظمیں ہیں اور بائیں طرف انگریزی ترجمے۔ تمام نظموں میں کسی نہ کسی انداز سے عورت کی بے چارگی اور مظلومیت کو پیش کیا گیا ہے جو دردِ دل رکھنے والے قاری کو شدت سے متاثر کرتا ہے۔ پیش لفظ میں محترمہ رضیہ اسماعیل بجا طور پر رقم طراز ہیں:

‘‘اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود عورت کے دکھ ابھی تک عورت کے دکھ درد ہیں۔ صنفِ مخالف کے لئے ان دکھوں کا ادراک کرنا تو دور کی بات ہے، ابھی تک وہ اسی یقین اور بے یقینی کی سولی پر لٹک رہے ہیں کہ عورت کے حقیقت میں کوئی دُکھ ہیں بھی یا سب ڈھونگ ہے؟’’

یہی تمام نثری نظموں کا لب لباب ہے۔ مثلاً چند لائنیں نظم ‘‘نئی زمین’’ سے

نئی زمین

نکاح کے دو بول......
مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کا لائسنس!
نئے رشتوں کی زنجیر میں جکڑی عورت
فرائض کی گٹھڑی سر پر لادے
نئی زمین، نیا پودا
کسی نے سوچا......
اس پودے کے لئے نئی زمین کی آب وہوا
کتنی موافق ہے......!

یہ تو ہوئی نثری نظموں کے مواد کی بات۔ موضوعات کی پیش کش، فنی اعتبار سے ہر چند کہ نثری نظم ابھی بحث وتمحیص کی حد سے نہیں نکلی، رضیہ ہر نظم کے حوالے سے کامیاب شاعرہ نظر آتی ہیں۔

فکری سطح پر ان کی فکر سطحیت سے بالاتر ہے اور ان کا مشاہدہ وسیع اور برائے شعر گفتن کی روایت سے وہ بہت بلند ہیں۔

‘‘چاند میں چڑیلیں’’ ان کا نثری کارنامہ ہے۔ مضامین طنز ومزاح لیے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کا محرک بچپن میں ان کی نانی گرانڈیل مدر کے ہمہ جہت دل چسپ آمرانہ قسم کے نقوش ہیں۔ انتظار حسین نے بھی افسانہ نگاری نانی اماں سے سیکھی اور رضیہ صاحبہ کی

افسانہ نگاری کے سوتے آخر نانی اماں ہی سے ملتے ہیں۔ مضامین پر تبصرے کے لئے تو دفتر درکار ہے۔ تمام مضامین مزاح کی پُرکاری لیے ہوئے ہیں۔ مجموعے میں گو سترہ مضامین ہیں مگر جب تک تمام پڑھ نہ لیے جائیں، کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ طنز ومزاح نگاری میں رضیہ خاص مزاج رکھتی ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔ طنز ومزاح پر کوئی بھی جائزہ، مضمون، مقالہ ان کو شامل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ‘‘گرینڈ مدر’’، ‘‘ہائے یہ گوریاں’’، ‘‘محبت کی کارفرمائیاں’’، ‘‘رنگ برنگ ناریاں’’ اعلیٰ درجے کی مزاح نگاری اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اگر رضیہ اسماعیل اسی نثری کاوش پر ہی اکتفا کرلیتیں تو بھی ان کا ادبی مقام قابلِ رشک رہتا۔

تیسری کتاب ‘‘سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں’’ ایک بلیغ استعارے کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اکثر آزاد نظمیں ہیں، کئی نثری نظمیں بھی ہیں۔ انتساب بنیادی خصوصیت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ‘‘......ان آنکھوں کے نام......جو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی رکھتی ہیں۔’’ خود محترمہ رضیہ لکھتی ہیں۔

‘‘میری آنکھوں نے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا کھویا، کیا پایا، کسے اپنایا، کسے ٹھکرایا، کہاں بھٹکیں، کہاں ان کی سرزنش ہوئی، کس منظر کو یاد رکھا، کسے بھلا دیا، کس سے بات کی، کس سے منہ موڑا، کہاں اٹھیں، کہاں جھک گئیں، کہاں دل بن گئیں، کہاں ذہن میں ڈھل گئیں، کہاں ان پر پیار آیا، کہاں انھیں نوچ کر پھینکنے کو جی چاہا، ایک نہ ختم ہونے والا منظر نامہ ہے جو قلم کے راستے کاغذ کی روح میں اتر گیا ہے۔’’

ادب سرائے کی مؤسس محترمہ شہناز مزمل نے اپنے تبصرے ......‘‘چشمِ نم، چشمِ حیراں’’ میں درست لکھا ہے کہ رضیہ اسماعیل نے ‘‘سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں’’ میں مشاہدے کی آنکھ سے حاصل شدہ تمام تر موضوعات کو گرفت میں لاکر اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔’’ اور پھر رضیہ کا بزبانِ شعر اظہار:

کہو، غمگین چہرے پر تمھیں کیسی لگی آنکھیں

کہا، ویراں سرائے میں میں دیئے جلتے ہوئے دیکھے

ایک تعارفی تقریب میں کوئی طویل بات نہیں کہی جاسکتی۔مختصر یہ ہے کہ سب مٹی میں مل جاتے ہیں، اجڑے شجر، دریدہ بادباں، ہمزاد، کشکول، سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں، سورج کی موت، زباں خاموش رہتی ہے......پُر تاثیر اور فکر انگیز نظمیں ہیں۔

''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی آزاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔اور یہی ان کا حقیقی شاعرانہ تعارف ہے۔ان کی غزلیں خبر سے نہیں، نظر سے عبارت ہوتی ہیں جو جدید غزل کے اچھے پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔وہ اُردو غزل کی روایات واسالیب سے اچھی طرح واقف ہیں۔اس مجموعے میں ان کی یہ واقفیت خوب نظر آتی ہے۔غزلیں پڑھنے میں بہت پُر لطف معلوم ہوتی ہیں۔الفاظ وتراکیب کی خوب صورتی اور بیان کی تازگی جا بجا ملتی ہے۔اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

پھر بھول گئے ہم آندھی کو
پھر آس کا دیپ جلایا ہے

نہیں حاصل پشیمانی سے کچھ بھی
جو کھیتی بوئی تھی ، وہ کٹ رہی ہے

اپنوں نے وہ درد دیا ہے
لوگ بگانے یاد آتے ہیں

تو اپنی آنکھ میں تابِ بہار لا تو سہی
جہان بھر میں ہیں حسن و جمال کے موسم

قتل جس نے کیا ہے خوشبو کو
اب اسے سنگسار کرنا ہے

اس شعری مجموعہ میں ان کی نظموں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جس میں نثری اور آزاد، دونوں نظمیں ہیں۔اپنی اپنی جگہ پر ہر نظم اعلیٰ ہے اور فکری نہج دیتی ہے جو بہت امید افزا نظر آتی ہے:

دھنک رنگ

مجھے مٹانا ہو تو
پہلے میرے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹاؤ
میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے
کیوں کہ......
ان لکیروں کی طرح میں بھی اَن مِٹ ہوں
روح کا پرندہ جب جسم کا پنجرہ توڑ کر
آزاد ہو جائے تو جسم مٹتا ہے
مگر میں نئی زمینوں پر
ہمیشہ زندہ رہوں گی
کہکشاں بن کر
کسی اور آسمان کا چاند......
کسی دل میں حسین یاد......
کسی آنکھ کا آنسو......
کسی لب کی فریاد......
کسی فریم کی تصویر......
کسی پاؤں کی زنجیر......
کسی قبر کی جاگیر بن کر......

کیوں کہ......

میں دھنک رنگوں سے بنی

''عورت ہوں''

رضیہ کا کلام تجربے کی تازگی، مضمون کی معنویت اور اسلوب کے انوکھے پن کی بنا پر بے حد متاثر کرتا ہے۔

''پیپل کی چھاؤں'' حمدیہ، نعتیہ، منقبت، سیاسی، عوامی، طنزیہ، روایتی اور ولایتی ہر طرح کے سینکڑوں ماہیوں کا مجموعہ ہے جو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ایک ایک ماہیا ہر رنگ کا ملاحظہ ہو۔

تو باغ کا مالی ہے
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے
(حمدیہ)

فرمان وہ لے آیا
سینے میں رکھ کر
قرآن وہؐ لے آیا
(نعتیہ)

رحمت کی گھٹائیں ہیں
شہرِ مدینہ کی
پاکیزہ فضائیں ہیں
(نعتیہ)

سب اپنے پرائے تھے
کوفے والوں نے
کیا زخم لگائے تھے
(شہیدانِ کربلا)

قسمت کا دھنی غازی
ہار کے جاں اپنی
وہ جیت گیا بازی
(غازی علم الدین)

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں
(پنجاب رنگ)

بڑا ظلم کماتے ہو
عورت ماں بھی ہے
کیوں اُس کو رُلاتے ہو
(عورت کی کہانی)

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے
(عورت کی کہانی)

کاٹیں گے جو بوئیں گے
وقت گنوایا تو
تا عمر ہی روئیں گے
(روایتی)

کہیں پھول برستے ہیں
بچے غریبوں کے
روٹی کو ترستے ہیں
(وطنِ عزیز کی یاد میں)

پالیٹکس میں آئیں گے
خالی جیبیں ہیں
بڑا مال بنائیں گے
(وطنِ عزیز کی یاد میں)

یوکے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں
(ولایتی)

انگلینڈ کے کیا کہنے
میموں نے گرمی میں
کپڑے ہی نہیں پہنے
(ولایتی)

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے
(ولایتی)

سخن تمام، مگر رہ گیا بہت باقی

(لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب کے لئے لکھا گیا)

شگفتہ بیان ادیبہ

محمود ہاشمی
برمنگھم، برطانیہ

شاعروں اور مشاعروں کی بالا دستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اُپج ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جا سکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کیے جا سکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اِس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں

صفیہ صدیقی
لندن

اس مصرعے کی خالق رضیہ اسماعیل ایک باذوق اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں، نثر نگاری کا بھی شوق ہے۔ ان کی طنز و مزاح کے مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' جون ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ان کے بہت دلچسپ مضامین ہیں۔ شگفتہ عنوان ہی سے آپ کو مضمون کا اندازہ ہو جائے گا۔ مثلاً گرینڈ مدر، چھوٹی کی کرشمہ سازیاں، ہائے یہ گوریاں، ادبی جمود وغیرہ۔ گرینڈ مدر میں نانی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''اپنی اس قدر صحت مند نانی دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔ بچپن کی بہت سے خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔''

دوسرے مضمون میں جس کا عنوان ''آگئی'' ہے، لکھتی ہیں:

''آگئی دراصل اُردو زبان کے خوب صورت لفظ ''آگہی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اُردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں اسے ''آگہی'' کہتے ہیں مگر برطانیہ میں لوگ اسے ''آگئی'' کہتے ہیں۔ دراصل بگاڑ ہمارے کلچر کا اتنا اہم جزو بن چکا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اب خالی نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اگر ''آگہی'' کو بگاڑ کر ''آگئی'' بنا دیا گیا ہے تو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کے یہ مضامین بظاہر تو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں مگر ان کو پڑھ کر جہاں ہنسی آتی ہے وہاں انسان کو کچھ کھو جانے کا احساس بھی ہوتا ہے اور علامہ اقبال کا یہ شعر سماعت سے ٹکرانے لگتا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ان کے دل چسپ جملے اور طنز کے تیر و نشتر ہماری اپنی کمزوریوں اور بصیرت و بصارت دونوں کے فقدان کا شدید احساس دلاتے ہیں۔ ''ادبی جمود'' کے عنوان والے مضمون میں اس کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اپنی ذات اور انا کے حصار میں مقید لوگ کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لیتے ہیں۔ ''سنا ہے ہمارے دانش ور جب کبھی رسمی یا غیر رسمی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو اُردو ادب پر طاری جمود کے بارے میں بہت پریشان بلکہ پروفیسر پریشان بن جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں پروفیسر صاحب بھی زندگی میں اپنے منفرد نام سے اتنے پریشان نہ ہوئے ہوں گے بلکہ جس نے نام ہی پری شان رکھ لیا تو پریشانی کو ان سے کیا سروکار؟ ایسے میں پریشانی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے آنگن میں خیمے گاڑ دیتی ہے۔''

اور مذاق ہی مذاق میں وہ پتے کی بات کہہ جاتی ہیں، ایسی حقیقت جس کا آپ سنجیدگی سے اظہار نہیں کر سکتے۔ اسی ادبی جمود میں......

''اُردو ادب پر جاری جمود کو توڑنے کے لئے برطانیہ کے ایشیائی ریڈیو اسٹیشن بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ شعر و شاعری کے پروگراموں میں لوگ اساتذہ تک کے کلام کو اپنا کلام کہہ کر سنا جاتے ہیں۔ پروگرام کرنے والوں کو پتا تک نہیں چلتا کہ کس کا کلام تھا بلکہ وہ شاید اچھے بھلے شاعر کے نام سے واقف تک نہیں ہوتے تو کلام کا کیا خاک پتا چلے گا۔ ایسے میں ہم ایسے کورذوق پری شان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس فاش چوری کی اگر نشان دہی کی جائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ اچھا میرے خیال میں یہ شعر میرا

ہے۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!''

رضیہ اسماعیل نے مزاح میں در پردہ بڑی بڑی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کی تمام تحریریں بظاہر مزاحیہ ہیں لیکن بین السطور آپ کو اپنے معاشرے کے ان رویوں کا بیان ملتا ہے جو ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ادیب خواہ وہ ایک سنجیدہ مضمون کے ذریعے ہو یا طنز و مزاح سے کمیونٹی کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس طرح اصلاح ممکن نہ ہو تو بھی وہ ایک باشعور انسان کی طرح زندگی کے غلط رویوں کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے۔ جب ہم طنز و مزاح کے ذریعے معاشرے پر تنقید کرنے والے مزاح نگاروں کے متعلق سوچتے ہیں تو ابنِ انشاء ان میں بہت نمایاں اور عوام میں مقبول نظر آتے ہیں۔

انوکھا کام کرنے کا عزم رکھنے والی رضیہ اسماعیل کی شاعری روایتی ہونے کے باوجود شکوہ و شکایت والی شاعری نہیں ہے۔ ان کے اشعار ان کے عزم اور حوصلے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ عورت ہونے پر کمزوری کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ کہتی ہیں:

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں
ستم کو، جور کو، سب نفرتوں کو
محبت سے نمٹنا چاہتی ہوں

رضیہ نے عورت کے ہر پہلو کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے اور ان کے اشعار سے معاشرے کے رویے پر ان کا دکھ ظاہر ہوتا ہے۔ نہ صرف اپنے ملک میں عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بلکہ اس دنیا کی ہر عورت کے دکھ کو انھوں نے محسوس کیا اور ان کے خیالات ان کی شاعری کا موضوع بنے۔ ان کی نظم ''خوش قسمت'' میں عورتوں کی ذات سے متعلق وہ سارے نام دیتی ہیں جو معاشرہ عورتوں کو بخشتا ہے:

ہمارے کتنے ہی نام ہیں

مجبور عورتیں، محصور عورتیں

لاچار عورتیں، ریا کار عورتیں

گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں

کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں

بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں

لیکن خود اعتمادی کا یہ عالم کہ

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو

مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

ایک اور نظم ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' میں زباں بندی پر سارے شکوے شکایت کے بعد:

اگر میں دل کی بات نہیں کہہ سکتی

تو مجھے بولنا کیوں سکھایا گیا

میرے ذہن میں ایک خیال چٹکی لیتا ہے کہ درست، یہ شعر رضیہ اسماعیل کا شاعرانہ تصور ہے مگر یقیناً ہر عورت کی زندگی میں ایک سے زیادہ ایسا موقع آیا ہوگا جب اس کے دل میں بھی یہی سوال آیا ہوگا۔ کم از کم ایشیائی عورت کے لئے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے۔

ان کے شعری مجموعے ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کے تعارف میں عدیم ہاشمی صاحب تحریر کرتے ہیں:

''غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔''

نثر نگاری اور شاعری کے علاوہ رضیہ اسماعیل ایک سوشل ورکر بھی ہیں اور اپنی کمیونٹی کے لئے خصوصاً ایشیائی عورتوں کے لئے کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے ''آگہی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو ایک تحریک بن گئی ہے۔ ''آگہی'' کی اپنی ایک ویب سائٹ ہے جس پر

''یوتھ سیکشن'' اور ''اُردو سیکشن'' کے عنوان سے سیکشن قائم کیے گئے ہیں۔ یوتھ سیکشن کی ریورس ڈائریکٹری میں ایڈوائس اور سپورٹ، الکوحل اور ڈرگ ابیوز، برمنگھم سٹی کونسل، کیریئرز، معذوری، تعلیم، خواتین، نوجوانوں اور مفید رابطوں کے لئے پتے اور لنکس وغیرہ سب تفصیلات مہیا کی گئی ہیں۔ نوجوان خواتین کے لئے ''آگہی ہیلپ لائن'' کا آغاز بھی ہوا ہے۔ اُردو سیکشن میں برطانیہ کی خواتین رائٹرز کے نام، ان کی تصانیف کے نام اور شاعرات کے کلام کے مختصر نمونے بھی ویب سائٹ میں موجود ہیں۔ ''آگہی'' کے زیرِ اہتمام سماجی تقریبات اور پوئٹری ورک شاپ وغیرہ منعقد ہوتی رہتی ہیں جس سے برمنگھم میں رہائش پذیر ہماری تیسری نسل کے نوجوان یقیناً مستفید ہوتے ہوں گے۔

کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ اور یہی بات ایک کامیاب عورت کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مگر یہ بات مجھے لگتا ہے کہ کسی مغربی مرد یا عورت کی کہی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر کامیاب انسان کے پیچھے نہ صرف شوہر یا بیوی بلکہ بچے، ماں باپ اور سارا کنبہ ہوتا ہے۔ سب اس کے کام میں دل چسپی لیتے ہیں اور حتی الامکان مدد کرتے ہیں۔ اگر دور ہیں تو دعاؤں میں شامل رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رضیہ اسماعیل کی ان سب کامیابیوں میں ان کے خاندان کا بھی ہاتھ ہے اور خاندان کی مدد اور دعا حاصل ہونے سے خدا کا فضل بھی شاملِ حال ہوتا ہے۔ رضیہ اسماعیل ریسرچ بھی کر رہی تھیں اور ان کو ڈاکٹریٹ کی سند بھی مل چکی ہے۔ میری جانب سے بہت بہت مبارک باد......

آ گہی کی روحِ رواں

پاکیزہ بیگ

لندن

دو تین سال پہلے مجھے برمنگھم سے خواتین کی ایک انجمن ''آ گہی'' کی طرف سے مشاعرے پر مدعو کیا گیا۔ لائبریری کے خوب صورت تھیٹر ہال میں محفلِ مشاعرہ سجی تھی۔ ہال کو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مائک پر ایک مترنم آواز گونجی تو پتا چلا کہ یہ رضیہ اسماعیل ہیں ...... ''آ گہی'' کی روحِ رواں۔ خوب صورت خد و خال کی مالک، چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، دھیما لہجہ اور آواز کی ادائیگی جیسے کوئی موتی پرو رہا ہو۔ ایک ایک شعر پر داد وصول کرتی رہیں۔ یہی میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ مشاعرہ کامیاب رہا اور میں رضیہ اسماعیل کی مدّاح ہوگئی۔

اسی طرح کی کئی شامیں وہ منعقد کرتی رہیں اور یہی شامیں نئی نسل کے شعرا، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کے بھرپور تعارف کا ذریعہ بنی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے لہجے نے فکر آور اسلوبِ اظہار اور جدید حسیت کے وہ چراغ جلائے ہیں کہ ان کا پورا کلام اُس سے منور ہے۔ ان کی نظم اور غزل کا ایک ایک حرف گواہی دے رہا ہے کہ وہ تخلیقِ فن کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا ہے۔ ان کا کلام دلوں پر اثر کرتا ہے۔ وہ منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں اور ادبی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ شاعری میں وہ نئی نسل کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ انتہائی رنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ حزن و ملال اور رنج میں ڈوبی ہوئی شاعری نوجوانوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ وہ غمِ جاناں

اور غمِ دوراں سے گزر چکی ہیں۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر آنے کے باوجود وہ اپنی روایات، رسم و رواج اور بے وطنی کا کرب شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے ان کے دل میں پیار کی تپش ہے۔ اسے یخ بستہ ہوائیں سرد نہیں کرسکیں۔ عورتوں کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں کیوں کہ وہ خود ایک مشرقی عورت اور ماں ہیں۔

ان کی کتابوں کی رونمائی لندن میں بھی ہوئی۔ بہت پذیرائی ہوئی۔ ان کے کلام کو سراہا گیا۔ ان کی ایک کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' کے حوالے سے ایک صاحب نے کہا، ''رضیہ صاحبہ، چڑیلیں ڈھونڈنے کے لئے چاند میں جانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ......'' اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

وہ مشاعروں میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں کہ مشاعرہ پڑھنے سے کوئی بڑا شاعر نہیں بن سکتا بلکہ فنی صلاحیت اور تخلیق اسے معیار عطا کرتی ہے۔

ان کے اشعار میں آشوبِ آگہی کے شواہد ملتے ہیں۔ آج کل وہ ''آگہی'' کے لئے بہت کام کر رہی ہیں اور اُردو کی ویب سائٹ حال ہی میں ریلیز کی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی شاعری باطن کی ایک نرم و نازک اور بے چین صدا ہے۔ نظم اور غزل پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ میں ان کا یہ شعر اکثر گنگناتی ہوں۔

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

کاغذ سے اٹھتا شور.........

پروین شیر
کنیڈا

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی انجانی آواز میں اتنی اپنائیت ہوتی ہے وہ اتنی جانی پہچانی سی لگتی ہے جیسے مدت سے شناسائی ہو۔اس کے خلوص کی شبنم دل کی پنکھڑیوں کو تر بہ تر کر دیتی ہے۔کچھ سال پہلے جب میں لندن گئی تھی تو فون پر ایک ایسی ہی پر خلوص آواز نے متاثر کیا تھا۔یہ آواز تھی رضیہ اسماعیل کی۔ان کے اخلاق کی انتہا یہ تھی کہ برمنگھم سے لندن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر مجھ سے ملنے دنیائے شعروادب کے فنکشن میں آ گئیں جہاں میری کتاب کرچیاں کی رونمائی تھی۔اس پر خلوص اور عمدہ فنکارہ سے میری ملاقات اردو دنیا کے مشہور ادیب وشاعر حیدر قریشی صاحب کے ذریعہ ہوئی تھی جن کی میں بہت ممنون ہوں۔یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔اس وقت انہوں نے مجھے اپنا خوبصورت اور خوب سیرت مجموعہ........سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں.....عطا کیا تھا۔ان سے میری دوسری ملاقات ۲۰۰۸ میں ہوئی تھی۔میں ان دنوں لندن میں تھی اور رضیہ نے بے حد خلوص ومحبت کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر میرے لیے ایک حسین اور یادگار ادبی شام منائی تھی۔اس ملاقات نے اس پر خلوص شخصیت کی خوبیوں کی اور بھی تہیں کھولی تھیں۔مجھے وہ اس کوزہ گر کی مانند نظر آئیں جو کچی مٹی کی لوئی سے بغیر کسی چاک کے صرف اپنے ہاتھوں سے شاہ کار تخلیق کر دیتا ہے۔انہونی کو ہونی بنا دیتا ہے۔رضیہ کی یہ تخلیقات ان کی بیٹیاں ہیں جنھیں ناسازگار ماحول میں رہ کر بھی،وطن سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنی تہذیب وتمدن کا نمونہ

بنا دیا ہے۔

اچھا فنکار کوئی ضروری نہیں کہ اچھا انسان بھی ہو۔رضیہ اسماعیل ایک بہت اچھی تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت با اخلاق اور نیک دل خاتون ہیں۔ان کے دل کا پیمانہ مظلوم عورتوں کے اشکوں سے لبا لب ہے جو ان کے اشعار سے چھلک رہا ہے۔تخلیق شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔فن کے بطن سے زندگی کا سچ نمودار ہوتا ہے جو رضیہ کی شاعری میں جھلک رہا ہے۔جنسی تعصب کی ناانصافیوں نے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔عورت ہمیشہ تشدد سے بھرپور نظامات کی شکار ہے۔مرد اساس معاشرے کی زیادتی کے پتھروں سے زخمی ہے۔بے بسی اپنا سر طاقت کی سنگلاخ دیواروں پر پٹختی ہے جو اس کا راستہ روکے کھڑی ہیں لیکن دیوار طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے سر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ان محسوسات کی بھرپور کیفیت رضیہ کے ان اشعار میں موجود ہیں......

سوچ کے بادباں کھول دو
سر اٹھا کے بہت ناز سے جانے والی ہوا نے کہا
سن کے پیغام یہ
سوچ بھی سوچ میں پڑ گئی
میں تو صدیوں سے زندان خانوں میں ہوں
لب سلے ہیں مرے
ہاتھ جکڑے ہوئے
پاؤں میں بیڑیاں
نرم ونازک سراپا ہے اک آبلہ
سلسلہ ظلم کا ہے کہ رکتا نہیں
سوچ کے بادباں
اس ہوا

اس فضا میں

کھلیں بھی تو کیسے کھلیں

مجھ کو تو ہی بتا

عورتوں کے درد کا لہو ان اشعار کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے......

عورتوں کی قبروں پر ایستادہ

بڑے بڑے کتبوں کو دیکھ کر

سوچتی ہوں

اس قبر پر اتنی عنایت کیوں؟

کیا یہ کتبے

محبتوں کے مظہر ہیں یا

احساس جرم کے کفارے

جو موت کے بعد ادا کیے جا رہے ہیں؟

انہوں نے اپنا ایک اور مجموعہ ......پیپل کی چھاؤں میں ......مجھے عنایت کیا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد رضیہ کی ایک اور جہت جگمگائی۔ یہ ان کے ماہیوں کا مجموعہ تھا۔ حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ ماہیا نگاری میں بھی مکمل مہارت رکھتی ہیں۔ ان کا دردمند دل اور اس کے احساسات محض ذاتی نہیں بلکہ کائناتی ہیں۔ اس کا ایک اور ثبوت رضیہ کا محبت سے بھرپور وہ خط ہے جو میری والدہ کے انتقال پر انہوں نے مجھے لکھا تھا مجھے ایسا لگا تھا کے میرا درد ان کا بھی درد بن گیا تھا۔ سچے خلوص اور ہم دردی سے لبریز اس خط میں انہوں نے چند اشعار ماں کے لیے درج کیے تھے۔ ان کے یہ ماہیے صرف ان کے نہیں ہر دل کی داستان ہیں......

اس جگ کا نور ہے ماں

رب کے بعد یہاں

دوجے رب کا ظہور ہے ماں

ہر طرف بلائیں تھیں

بچ کر نکل گئے

سب ماں کی دعائیں تھیں

ہائے کتنی گرمی ہے

چھاؤں ممتا کی

پھولوں سی نرمی ہے

میرے خیال میں شاعری کی سب سے بڑی توانائی وہ ہے جو یوں بے چین کر دے کہ یہ تو میرے ہی دل کی آواز ہے.......یہ تو میری ہی واردات قلب ہے........یہ تو میرے ہی محسوسات اور تجربات ہیں.....یہ تو میرا ہی درد ہے! رضیہ کی کئی نظموں نے مجھے اسی طرح بے چین کیا ہے۔ خاص طور سے یہ اشعار........................

خوشی

بدصورت پاؤں والا

وہ پرندہ ہے

جو ناچتے ناچتے

اپنے پاؤں دیکھ کر

اداس ہو جاتا ہے

اور ناچنا چھوڑ کر

کونے میں جا بیٹھتا ہے

روح

خوابیدہ وجود کو
نہ جانے کہاں
اڑائے اڑائے پھرتی ہے
بدن نیند سے بیدار ہوتا ہے
روح قیدی بن جاتی ہے
رات روح کا رتجگا ہے
دن کی روشنی
روح کا میلہ
اجاڑ دیتی ہے

ہماری سوچوں میں
زندگی اور موت کا فاصلہ ہے
مہد سے لحد تک کی دوریاں ہیں
اندھیرے سے روشنی تک کی
جدائیاں ہیں
بہار کی پہلی کلی چٹخنے سے لے کر
خزاں میں آخری پتہ گرنے تک کا
ماتم ہے
دھرتی کی مٹیالی رنگت اور
آسمان کی نیلاہٹوں کا فرق ہے
آنسوؤں سے ہنسی تک کا سفر ہے

خواب سے تعبیر تک کا خوف ہے
بلندی اور پستی کا خلا ہے
یقین کے جنگل سے بے یقینی تک کے صحرا کی ریت ہے
ہوش و خرد سے
جنون و مستی تک کا بحر بیکراں ہے
شاید
ہمارے ستارے نہیں ملتے

رضیہ کے لیے کائنات ایک حیرت کدہ ہے۔ جب چشم باطن وا ہو جائے تو سچ کے کئی دریچے کھل جاتے ہیں۔ علم کے نور سے روح روشن ہو جاتی ہے۔ تاریکی کی فصیلیں ڈھے جاتی ہیں۔ آگہی کا شور کاغذ سے لپٹ جاتا ہے......

ایک حسّاس اور درد مند روح

قاضی عنایت الرحمٰن
برمنگھم، برطانیہ

ریڈیو سے ایک سحر خیز آواز اٹھا کرتی تھی۔ وہ وہ آواز ایک سمعی سا جادو لگتی تھی۔ مجھے اس سے کچھ شناسائی سی ہوگئی۔ اس آواز میں ایک پیغام ہوتا۔ کبھی زمانے کے نام، کبھی زمانے والوں کے نام۔ کبھی گلوں کے نام، کبھی گل چیں کے نام۔ کبھی ظالم کے نام، کبھی مظلوم کے نام۔ کبھی اسیرانِ خانہ داری کے نام اور کبھی جابر مردوں کے نام۔ وہ آواز کبھی غزل بن کر افق پر تھرتھراتی، کبھی نظم بن کر سامعین کے دلوں کو لُوٹتی۔ اس آواز میں ایک غیر معمولی جاذبیت تھی، ایک گہرا جذبہ تھا۔

ایک دن ایک مقامی مشاعرہ میں حصہ لینے گیا تو میری ملاقات اس آواز سے ہوئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اتنے عرصہ سے میری پسندیدہ آواز بنفسِ نفیس وہاں موجود تھی۔ وہ خوش پوش خاتون رضیہ اسماعیل اپنے گرد ایک خوب صورت ہالہ لیے ہوئے کتنی روشن لگ رہی تھی۔ ملاقات ہوئی، آغازِ شناسائی تو شاعری کے توسط سے ہوا لیکن رضیہ اسماعیل کی شخصیت کے دوسرے پہلو آہستہ آہستہ مجھ پر کھلے۔

وہ حسّاس طبع انسان، جس کے کردار سے گرم جوشی اور افکار سے محبت ٹپکتی ہے، وہ لوگوں کے لئے کیا نہیں کرتی۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ وہ ان تمام سرگرمیوں کے لئے وقت کیسے نکال لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل شاعرہ بھی ہیں اور ادیبہ بھی۔ نثر میں کمال کرتی ہیں۔ طنز و مزاح میں

یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ اُردو ماہیے کو انگلستان میں رضیہ اسماعیل نے بہت تقویت پہنچائی ہے۔ وہ برطانیہ میں پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون ہیں۔

رضیہ اسماعیل خدا کے فضل اور اپنی محنتِ شاقہ سے اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہوگئی ہیں۔ ان کے ادبی رجحان سے ہٹ کر ان میں روحانیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا فوق العموم مشاہدہ ہوتا ہے۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ ان کو دلِ پُر درد، چشمِ بینا اور طبعِ نازک دے کر ہر قسم کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔

آج کل کی انٹرنیٹ کی دنیا میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی ویب سائٹ (www.aaghee.co.uk) کو اتنی کارآمد معلومات سے لاد دیا ہے کہ لامحالہ اس کو دن میں ایک دو بار ہر کوئی استعمال کرتا ہے۔ شاعری میں کش مکش زندگی کے کئی فلسفے بیان کرتی ہیں۔ ایک یہ ہے:

اندھیرا وقتی طور پر
روشنی کو سمیٹ سکتا ہے
لیکن سدا کے لئے روشنی کو
اپنی بانہوں میں قید نہیں کرسکتا
روشنی کی بے قراریاں......
اندھیرے کا وجود چھلنی کردیں گی
دریدہ بدن اندھیرا......
پھر روشنی سے کیسے نظر ملائے گا!

اور پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ:

کوہ قاف میں جا کر
بونے......

دیکھنے کی مجھے بہت خواہش تھی

دنیا میں......

قدآور لوگوں کو قریب سے دیکھا

میری خواہش کی تکمیل ہوگئی!

مجھے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل سے شناسائی پر فخر ہے۔

رضیہ۔میری سہیلی

طلعت سلیم
برمنگھم، برطانیہ

رضیہ سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت، اپنائیت بھرا روّیہ، میٹھی باتیں، دل نشیں لہجہ، ٹھہرا ٹھہرا سا مزاج، شائستہ انداز، علمی و ادبی گفتگو ہو تو ڈوب جانے والی کیفیت، خواتین کا تذکرہ ہو تو

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ان کے دل کی دنیا سارے اسرار و رموز سے آشنا، ان پر گزرنے والی کیفیات سے واقف، بڑے ہی دردمندانہ احساس کے تحت، ان کے لئے کچھ کرنے، کرتے رہنے اور کر جانے کی تمنا میں کیا کیا کچھ سوچتی، کہتی، کرتی، کرواتی، لکھتی، اپنے ''آ گہی'' پروجیکٹ کے لئے لکھواتی، چھپواتی، لائق فائق اور محنتی خاتون ہیں۔ یہ ہیں میری سہیلی (جانے اب لوگ ''دوست'' کیوں کہنے لگے ہیں) رضیہ اسماعیل۔

منظّم گھر داری، بچیوں کی پرورش اور محکمۂ تعلیم میں ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے پی ایچ ڈی کر کے خود کو ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بنالیا ہے...... ہے نا کارنامہ!

بعض لوگ، بلکہ بہت سے لوگ بہت کچھ سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ کئی ایک کچھ کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور کرتے ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر رضیہ کچھ نہ کچھ کرتی بھی رہتی ہیں۔ سنا ہے صبح منہ اندھیرے لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتی ہیں اور شام، کاموں سے فراغت پاتے ہی پھر وہی کچھ۔ جبھی تو ٹیلی فون کریں تو ان کی آواز کی بجائے اکثر اسماعیل صاحب

کی آواز آنسرنگ مشین (Answering machine) سے سنائی دیتی ہے۔

رضیہ بڑی دوستانہ طبیعت کی مالک ہیں۔ اپنی اپنائیت سے ملنے والوں کو گرویدہ بنالیتی ہیں۔ سیدھی سچی بات کرتی ہیں، خود مخلص ہیں، دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتی ہیں۔ کہیں ادبی مخاصمت، منافقت، گروہ بندی کا مظاہرہ دیکھیں تو اندر ہی اندر کڑھتی ہیں اور ایسی محفل سے کنارہ کشی کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔

اُردو کے تیسرے بڑے مرکز برطانیہ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں سفید اور نیم سفید سروں کی قطاریں انھیں بھی اُردو کے مستقبل کی طرف سے متفکر کیے رکھتی ہیں۔ نئے چراغوں کی جستجو میں نوجوانوں کو لکھنے لکھانے کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں بہت کچھ کرتی چلی آرہی ہیں۔ نوجوان بچیوں کے لئے مقامی لائبریریوں میں ادبی ورک شاپس منعقد کرنے کا سلسلہ رضیہ ہی کی ذہنی اپج ہے۔

رضیہ نے باہر تو جو اُجالا پھیلایا سو پھیلایا، ان کے اندر کی دنیا بڑی روشن ہے۔ شعرو شاعری اور مضامین کے مجموعوں کے ساتھ ساتھ، قسم قسم کے درود شریف جمع کر کے بڑی محبت اور محنت کے ساتھ ان کا ترتیب دیا ہوا خوب صورت مجموعہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ دینی و دنیاوی دلچسپیوں کا کیسا حسین امتزاج ہے ان کی طبیعت میں۔

رضیہ اوپر سے بڑی سنجیدہ نظر آتی ہیں، بیحد متین سی۔ ان کی حسِ مزاح کا اندازہ تو ان کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ ہاں ''چاند میں چڑیلیں'' کے طنزیہ مضامین سے ان کی طبیعت کی فطری شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رضیہ میری سہیلی ہیں۔ یہ بات میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے۔ ایک بہت اچھی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی اچھی ادیبہ، شاعرہ، سماجی کارکن، ماہرِ تعلیم اور کیا کیا کچھ۔ مجھے فخر ہے کہ رضیہ میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ایک جائزہ

طلعت سلیم
برمنگھم

خوشبو بھرے گلابوں کی تمنا میں کانٹوں سے اپنے ہاتھ زخمی کرتی ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، رضیہ بٹ، رضیہ فصیح احمد، رضیہ سجاد ظہیر کے بعد اردو ادب کی چوتھی رضیہ ہیں جن کا ادبی دنیا، مشرق و مغرب کی ادبی دنیا میں بڑی محبت اور دھوم دھام سے ہوا اور ہو رہا ہے۔

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میں نے کبھی رضیہ سے پوچھا تو نہیں لیکن اکثر سوچتی ہوں، نقوش والے محمد طفیل کی بھانجی بھتیجی نہ سہی ان سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے اب دیکھئے نا گھر بار، شوہر بچے، لمبی چوڑی عزیز داریاں، کام پر جانا، ادبی سماجی تقریبات میں شرکت، پھر بطور خیال خاطر احباب، ہم ایسی ان گنت سہیلیوں سے میل ملاقات، ماشاءاللہ صبح منہ اندھیرے اہل خانہ محو خواب اور آپ چوروں کی مانند دبے پاؤں نیچے آ بیٹھی ہیں اور پھر چل مرے خامہ بسم اللہ...... چند آخری آخری جملے مکمل کرنے کی حسرت ساری ذمہ داریاں نپٹارات کی خاموشی میں پھر ایک نشست کے خیال سے ہاتھ میں قلم تھامے پوری کرتی رہتی ہیں۔

ہے نا عین محمد طفیل ہی کا سا نقشہ حیات...... اس پر کبھی کبھی میرے دل میں ان سے عزیز داری کا خیال آتا ہو تو تعجب کیسا؟

یا پھر رضیہ نے اپنے اوراد و وظائف کے بل پر کوئی جن قابو کر رکھا ہے۔ اب اس کا اقرار تھوڑی کریں گی۔ قصہ کوتاہ، حیرت سی حیرت ہے......

خیر کچھ بھی کرتی ہوں ہمیں آم کھانے سے غرض ہے پیڑ گننے کے تردد میں کیوں

پڑیں؟

ہم ان کی خوبصورت غزلوں، نظموں، رنگا رنگ نثری نظموں ماہیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، رضیہ شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں اللہ نے بڑی حساس طبیعت اور درد دل کی دولت عطا کر رکھی ہے۔ اپنی ہم نفسوں کے دکھ درد پر کڑھتی ہیں ان کی دبی دبی چیخوں، خاموش فریادوں ان کی آہوں سسکیوں کو دل کی دھڑکن میں بسا کر انہیں الفاظ کا روپ دیتی ہیں۔ عورتوں کے آلام ومصائب ان پر عائد کئی بے جا پابندیاں قدغنیں، سماجی معاشرتی بندھن، مردوں کی اجارہ داری، بے حسی خودغرضی نفس پرستی ان کا دل دکھاتی ہے تو ان سب خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی آرزو میں اپنے زخمی احساسات، سلگتے جذبات کو اشعار میں ڈالتی ہیں۔ جو ان کی روح کی گہرائیوں میں جنم لیتے اور خون جگر کی آمیزش سے گلابی گلابی سے ہوکر بڑے پرکشش اور پراثر بن جاتے ہیں۔

رضیہ نے عورتوں کے لئے ایک خوشنما، خوشکن، سرسبز وشاداب پھولوں بھری دنیا تخلیق کرنے کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے جو ان کی شاعری کی تہہ میں موجزن نظر آتا ہے۔

اب یہ تو ہمیں علم نہیں کہ مردوں کے ظلم وستم کی داستانیں صفحہ قرطاس پر بکھری دیکھ کر ہمارے قبیلہ مرداں سے تعلق رکھنے والے اسماعیل بھائی کیا پتہ اندر ہی اندر تلملاتے ہوں، ہوسکتا ہے بیٹی کے پردے میں بہو کو سنانے والی ساس کی مانند، رضیہ کا روئے سخن اپنی طرف تصور کر کے غصے سے بل کھاتے ہوں......

مگر نہیں، ہم جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ اٹھتے بیٹھتے خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے وہ شریک حیات بخشی جو سارے جہاں کی غم کی ماری عورتوں کا درد اپنے جگر میں سمو کر انہیں ایک ہنستی مسکراتی زندگی کی جانب رواں دراں کرنے کی جستجو میں غزلوں پر غزلیں نظموں پہ نظمیں اور بقول ٹی ایس ایلیٹ شاعری کی معراج یعنی نثری نظمیں لکھی چلی جاتی ہیں جبھی تو ہمارے بھائی چہرے پر اپنے نام کی مناسبت سے متفخرانہ سی مسکراہٹ سجائے پھرتے ہیں جو آج بھی رضیہ کی سیدھی سچی مگر پرکار شاعری پر کہی جانے والی باتیں سن سن کر ان سے چھپائے نہیں چھپ رہی۔

کانٹوں پہ چلتی رضیہ اسماعیل

طارق شاہد
اسلام آباد

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

اس شعر کے پس منظر کو دیکھنا ہے تو رضیہ اسماعیل کی کتاب ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کو پڑھنا پڑے گا۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کے المیوں کی داستان بیان کی ہے اور ان کے دُکھ سے گزر کر یہ شعر کہہ رہی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کا تعلق پنجاب سے ہے اور برطانیہ میں مقیم ہیں۔ بطور شاعرہ وہ صرف شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ برمنگھم میں ادبی سماجی تنظیموں کے لئے دونوں شعبوں میں بھی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ دیگر تنظیموں کے علاوہ خواتین کی ادبی ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی صدر ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کے شعبہ سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں اور نثر میں طنز ومزاح لکھ رہی ہیں۔ برطانیہ میں سول سروس میں شمولیت کی، پھر ٹیچر ٹریننگ کے بعد سوشل ورک میں ایم اے کیا اور محکمہ تعلیم میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے تعلیمی پس منظر میں ان کی شاعری کو دیکھا جائے تو ایک خاص زاویہ سامنے آتا ہے اور وہ ہے شعور اور ادراک کا رویہ۔ رضیہ اسماعیل کی کتاب میں پینتیس نثری نظمیں، اٹھائیس غزلیں اور آٹھ آزاد نظمیں شامل ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو نثری نظموں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے جس میں ذائقہ بدلنے کے لئے غزلیں اور آزاد نظمیں

شامل ہیں جو ان کی فن پر دسترس کا ثبوت ہیں۔نثری نظم کا حوالہ اُردو ادب میں اتنا مقبول نہیں ہوایا پھر اس صنف کو بہتر طور پر سمجھا ہی نہیں گیا۔

ایک مرتبہ کشور ناہید سے نثری نظم کے بارے میں سوال کیا گیا، ''کیا شاعری کی یہ صنف بہت آسان ہے، اسے ہر کوئی لکھ سکتا ہے؟'' عمومی طور پر یہ ہی سمجھا جاتا ہے کہ نثری نظم لکھنا بہت آسان کام ہے، بس خیال ذہن میں آیا اور پھر اس کی مناسبت سے الفاظ کا چناؤ کیا اور ان کو خاص ٹکڑوں کی صورت میں لکھ لیا، یہ نثری نظم بن گئی۔کشور ناہید نے اس کی وضاحت کچھ یوں کی کہ ''نثری نظم لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ایک اچھی اور مؤثر نثری نظم اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی ہے جب تک لکھنے والا شاعری کے رموز سے واقف اور اس کی سوچ میں گہرائی نہ ہو۔ جہاں دونوں باتیں ہوں، وہیں اچھی اور پختہ نثری نظم تخلیق ہوتی ہے۔''

رضیہ اسماعیل کی کتاب میں غزلیں اور نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں، اور جب شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں تو بات سوچ کی رہ گئی۔سوچ ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے۔ ہر واقعہ، ہر کردار اور زندگی کی اونچ نیچ کو وہ اپنے انداز میں دیکھتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے۔تخلیق کار کے ان تمام باتوں کو دیکھنے کا انداز قدرے مختلف ہوتا ہے۔ وہ واقعہ کے پس منظر اور اس کے اثرات کا بغور مشاہدہ کرتا ہے، یا پھر وہ اپنے تجربات کو رقم کرتا ہے اور نثری نظم اسے اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرنے کی آزادی دیتی ہے۔

جہاں تک نثری نظم کی اصطلاح کا تعلق ہے، تو ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے، ''اسے تو قبول کرنا ہی پڑے گا کیوں کہ یہ اصطلاح اب تقریباً تین چوتھائی صدی کے قریب پرانی ہونے کو آ رہی ہے اور اس پر خاصا کام بھی ہو چکا ہے۔اور ویسے بھی Prose Poetry کا ''نثری نظم'' کے علاوہ کوئی اور ترجمہ ہو بھی نہیں سکتا۔'' ابن فرید نے جس وقت یہ مضمون تحریر کیا ہوگا تو اس وقت یقیناً تین چوتھائی صدی ہی ہوئی ہوگی مگر اب

تو اس بات کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس صنف میں نئے نئے نام سامنے آئے ہیں۔

رضیہ اسماعیل کی نثری نظمیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں عورت کے گرد گھوم رہی ہیں، جس میں عورت کی مظلومیت، بدلتے رشتے اور رشتوں کے بدلتے رویے خاص طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کو موضوع بنا کر جو تصویر کشی کی ہے وہ برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی ہمارے معاشرے کی عورت کی تصویر ہے۔ بادلیر اور میلارمے کا کہنا ہے کہ ''انسان کے تین رشتے ہیں اور وہ ہیں تنہائی، جنس اور مایوسی۔ یہ ازلی ابدی رشتے ہیں۔'' اس بات کی روشنی میں بھی اگر ان کی نظموں کو دیکھا جائے تو وہ انہی تین رویوں کے گرد گھومتی نظر آئیں گی۔ رضیہ اسماعیل کی نظموں میں مایوسی بھی ہے جو معاشرے نے عورت کو دی ہے۔ اس تناظر میں ان کی ایک نظم ''دردِ دل'' کے آخری مصرعے ہیں۔

کوئی جھونکا ہی ہوا کا
اسے لرزا دے گا
جس کی بنیاد ہی بے چینی ہو
بے یقینی کی ہر اک خشت لگی ہو جس میں
ایسی بنیاد پہ کیا کوئی عمارت ٹھہرے

اس طرح کے رویے ان کی کئی نظموں میں نظر آتے ہیں، مگر جہاں تک عورت ہونے کا سوال ہے، وہ اس کے ہر رشتے پر، جو کہیں ماں ہے، کہیں بہن، کہیں بیٹی اور کبھی بیوی کے روپ میں ہوتی ہے، نازاں ہیں۔ یہی موضوع ان کی نظموں میں موجود ہے جو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

راشد، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مجید امجد کی شاعری میں بھی یہی تینوں رویے ''مایوسی، جنس اور تنہائی'' اور بین الاقوامی فلسفوں اور تحریکوں کے اثرات جدید اُردو شاعری کا فکری

نظام بناتے ہوئے ابتدائی صورت میں نظر آتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ جنس اور گھٹن نئی شاعری کی زیریں رو بن کر سامنے آتی ہے۔ راشد کی شاعری میں سیاست اور میرا جی کی شاعری کی جنس نمایاں ہے۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جنس کے نمایاں حوالے ملتے ہیں۔ گو کہ رضیہ اسماعیل کی شاعری میں جنس کا عنصر کم ہے مگر کہیں کہیں اس کی جھلک عورت کے رشتے اور رویے کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ ان کی آزاد نظم ''سیج'' اسی انداز کا ایک پہلو ہے۔

پیار کی سیج پر
دو بدن
کتنے ارماں سجا کر ملے
وہ یہ سمجھا کہ عورت کو سر کر لیا
کتنا نادان ہے
کتنا انجان ہے

عورت سے تعلق، ان کی مجبوری اور رشتوں کے خاص بندھن کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی بے باکی سے لکھا ہے۔ وہ اس معاشرے میں پسی ہوئی عورت پر ہونے والے ظلم اور ایک سے تعلق قائم ہونے، جو مرد اور عورت کے حوالے سے سامنے آتے ہیں، دو رویوں اور معاشرے کی منافقت کو ''عورت کا گناہ'' میں نظم کرتی ہیں۔

عورت کا گناہ

میرے گناہ کی عمر
کیوں اتنی طویل ہے!
میرے شریکِ گناہ نے
پیار کے نام پر......
میری عصمت کی چادر تار تار کی

کبھی نہ آنے والے کل کی امید پر
ایک گھر کے سپنے دکھا کر
امیدوں کے گلشن کو خاکستر کیا
وہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا
مگر میرا گناہ......میرے پیٹ میں
آلتی پالتی مار کر کیوں بیٹھ گیا ہے؟
میری کوکھ میں سڑاند کیوں؟
میں ماں تو بننا چاہتی تھی
مگر......
اب میرا ماں بننا باعثِ عبرت ہے
میں ننگِ خاندان، حوّا کی بیٹی
سنگسار کیے جانے کے لائق
مگر......
اس گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں؟
اسے کیوں نہیں؟
صرف اس لئے کہ
میرا گناہ ظاہر ہے
اور اس کا پوشیدہ......!
اس کا گناہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا
اور میرا گناہ......
دن کے اُجالے میں ظاہر ہو گیا!

اُردو ادب میں نثری نظم کو اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا جیسے بہت سی ''درآمد شدہ'' جدید

اصناف نے اپنے لئے جگہ بنائی ہے۔نثری نظم یہاں کے ماحول کے لئے اجنبی ہے اور اپنی جگہ بنانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کر رہی ہے لیکن انگریزی ادب میں یہ تجربہ نیا نہیں۔ وہاں یہ یقیناً ایک پختہ صنف ہے۔اس کے بارے میں ایلیٹ نے بھی لکھا ہے کہ ''شاعری کی معراج نثری نظم ہے۔'' یہ الگ بات کہ اردو ادب میں ایسا بڑا نام نثری نظم کے حوالے سے سامنے نہیں آ سکا جس کا حوالہ صرف نثری نظم ہی ہو۔ کیوں کہ اس صنف کے یہاں آتے ہی اس کی مخالفت نے اسے اس طرح پنپنے نہیں دیا جس طرح دیگر اصناف یہاں آنے کے بعد پروان چڑھی ہیں۔

ایک انگریز نقاد نے نثری نظم کا دوسری اصناف سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نثری نظم شاعرانہ نثر سے یوں مختلف ہے کہ یہ مختصر، مربوط اور مرتب ہوتی ہے مگر آزاد نظم سے یوں مختلف ہے کہ مصرعے ٹوٹتے ہیں اور نثر پارے سے یوں مختلف ہے کہ اس میں آہنگ زیادہ واضح ہوتا ہے اور تصویر آفرینی اور قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔'' اس خیال کے مطابق نثری نظم ایسی ہوتی ہے جس میں نظم کی ساری خوبیاں موجود ہوں، سوائے اس کے کہ اس کے مصرعوں کو توڑ کر تحریر کیا گیا ہو۔ جہاں تک رضیہ اسماعیل کی نظموں کے خیالات کا تعلق ہے، وہ انتہائی فصیح و بلیغ ہیں اور نظموں میں سوچ کی گہرائی ہے۔

وائٹ ہیڈ کا کہنا ہے کہ ''ہر تجربہ اپنی ساخت لے آتا ہے۔'' اگر اس بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا ہے تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تجربہ ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے۔ پرانی اصناف شاعری اس لئے مقبول ہیں کہ وہ اپنے دَور کے شعور کا حصہ تھیں اور اب وہ ہمارے ذہنوں میں رچ بس گئی ہیں۔انسان نے جب آزادی سے سوچنا شروع کیا تو ایسی اصناف سامنے آئیں جو پابندِ سلاسل نہ تھیں۔اور اس طرح نثری نظم بھی وجود میں آئی۔نثری نظم نے فرانس میں جنم لیا تھا اور اس صنف نے آگے چل کر آزاد نظم کی صورت اختیار کی۔ اس طرح تاریخی طور پر نثری نظم زیادہ قدیم ہے۔فرانس میں بعض شعراء کی نثری نظمیں بہت مقبول ہوتی تھیں۔اسی طرح اردو ادب میں آزادی سے پہلے آصف علی نے جیل میں نثری

نظمیں لکھیں اور پھر اُردو ادب کے بہت سے شعراء نے یہ تجربہ کیا جن میں افتخار جالب، مبارک احمد، کشور ناہید، عبدالرشید، سعادت سعید، فہیم جوزی، کامران جیلانی، ماورا عنایت اور دیگر شعراء شامل ہیں۔رضیہ اسماعیل نے بھی سوچ کو قرطاس پر لانے کے لئے نثری نظم کو ذریعہ اظہار بناتے ہوئے معاشرے میں عورت کے مقام، عورت کے عورت ہونے، اس کے ماں بننے پر فخر کا احساس، مظلوم ہونے کا کرب، بہن اور بیٹی کے رشتے کا ادراک اور معاشرے کے برتاؤ کو خیال وفکر کے خاص زاویے اور معاشرتی حوالوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔انھوں نے زیادہ تر نظمیں اس موضوع کے تحت لکھی ہیں۔ان کی ایک نظم ''بے گور لاش'' کے چند مصرعے مظلوم عورت کے کرب کی بھرپور عکاسی ہیں۔

بین کرتی ہوا مجھے وہ عورت لگتی ہے
جس سے گھر ہستی کا سُکھ چھین کر
دُکھوں کے کفن میں لپیٹ کر
بغیر دفنائے ہی......
قبر کے پاس چھوڑ دیا گیا ہو
کیوں کہ......
قبر میں اتارنے والے ہاتھ
حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے
اس کے ہاتھوں سے جدا کر دیئے تھے......!

اسی طرح انھوں ے عورت کے ہر دکھ کو موضوع بنایا۔ایک نظم ''بانجھ'' میں انھوں نے عورت کی مظلومیت اور معاشرے کی بے حسی کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

کتنی بانجھ عورتیں
بچہ نہ ہونے کے جرم میں
گھروں کی چاردیواری سے......

باہر دھکیل دی جاتی ہیں
بچے تو مرد کا نصیب ہیں
مگر یہ بات مردوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آتی
شاید سمجھ میں آتی ہوگی
مگر......
جان کر بھی اَنجان بن جاتے ہیں!

عورت کے حوالے سے لکھی گئی بہت سی نظموں کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں جن میں انھوں نے عورت کے عورت ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے اور انہی نظموں میں انھوں نے عورت کے بیوی، ماں اور بیٹی کے رشتوں کی تبدیلی اور ہر روپ میں عورت کی ایثار کو موضوع بنایا ہے۔ رضیہ اسماعیل اگر اظہار کردہ موضوعات کو اسی انداز سے رقم کرتی رہیں تو یقیناً عورت کے کردار اور رشتوں سے ان نظموں سے بہتر کرافٹ کی نظمیں سامنے آسکیں گی اور وہ اس حوالے سے اپنی الگ پہچان بنا سکیں گی۔

صاحبِ طرز ادیبہ اور خیال افروز شاعرہ

سلطان محمود
برمنگھم

اس وقت میری میز پر دو کتابیں میرے شوق وجنونِ مطالعہ کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ ایک کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' نثری اور دوسری کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں محترمہ رضیہ اسماعیل کی ہیں جو یورپ بالخصوص برطانیہ میں علم وادب کے فروغ کے لئے ایک قابلِ قدر نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ دونوں ان کی قلمی بالیدگی اور شائستہ فکری کے فن پارے ہیں۔ دونوں کتابوں کا جمالیاتی حسن وندرت (بیرونی یعنی سر ورق) ان کے صفحات پر بکھرے ہوئے منفرد محاسن کی گواہی دے رہے ہیں۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا ایک مشکل امر تھا کہ میں پہلے نثر کی کتاب پڑھوں یا شاعری کی۔ کیوں کہ دونوں تصانیف اپنی کشش اور دلکشی کے تناظر میں ایک دوسری پر سبقت کی کوششوں میں منہمک ہوا چاہتی تھیں۔ چناں چہ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفوں پر دونوں کتابوں کا مطالعہ ایک ساتھ کر دیا۔ اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کسی نے مجھ پر یہ ذمہ داری ارزاں نہیں کی تھی کہ میری فکر ونظر میں رضیہ اسماعیل ایک شاعرہ اچھی ہیں یا ایک نثر نگار۔ یہ واقعی اس امر کا تعین کرنا کم از کم مجھ جیسے ایک عام اخباری رپورٹر کے لئے ناممکن ہے کہ موصوفہ مقابلتاً اچھی شاعرہ ہیں یا اچھی نثر نگار۔ میں نے ان کی متذکرہ دونوں کتابوں کو زبان وبیان اور احساسات اور جذبات کی ہمہ ہمی کے حوالے سے بے حد دلآویز اور جادو اثر پایا ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعرہ کے طور پر میں ان کی شاعرانہ عظمت کا تو قائل تھا ہی، کہ میں

نے انھیں کئی مشاعروں میں بڑے انہاک سے سنا تھا لیکن اب ان کی نثر نگاری سے آشنائی نے میرے دل میں ان کے مقام و مرتبہ کی کئی قندیلیں روشن کر دی ہیں ۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ میں نے ان کی دونوں کتابوں کو اپنا بہترین ہمدم پایا ہے ۔ اور مجھے ان کے فنِ تحریر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے ۔ ان کی نثری کاوش ''چاند میں چڑیلیں'' کے حوالے سے میں اس کے پیش لفظ میں ان کے اس اعتراف سے کہ انھیں طنز و مزاح کا دعویٰ نہیں ہے ، بہت متاثر ہوا ۔

اپنی طویل صحافتی زندگی میں آج تک میری نظروں سے ایسی کتاب کبھی نہیں گزری ہے جس میں دیباچہ نویس نے دیانت داری سے کم لیتے ہوئے متعلقہ کتاب کی خامیوں کی دہائی دی ہو ۔ بعض سکہ بند قسم کے دیباچہ نویس حضرات تو ایسی کتابوں پر بس داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی ۔ دوسری طرف اگر کسی ایسی چیز کو اچھا نہ کہا جائے تو یہ بھی بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے ۔ میں کوئی نقاد ہوں اور نہ ہی ادیب اور شاعر ۔ میری رائے سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں ۔ تاہم میری رائے میں رضیہ اسماعیل کا قلمی حدود اربعہ ہمارے ادبی ارتقاء کا ایک مستند شاہکار ہے ۔ اور خاص طور پر ان کے رنگ رنگ کے ماہیے ، جن میں طنز و مزاح سے لے کر حمدیہ اور نعتیہ ماہیے شامل ہیں ، ان سے میں بہت متاثر ہوا ہوں ۔

کئی سال پہلے میں نے حکومتِ پاکستان کے ادارہ مرکزی اردو ربورڈ کے لئے برطانیہ میں اردو صحافت کے موضوع پر ایک تاریخی پس منظر کی حامل کتاب لکھی تھی ۔ میری اس حقیر کاوش کے ناشر ، اللہ مغفرت کرے ، اشفاق احمد خان تھے ۔ نہ جانے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اربابِ بست و کشاد کو اس میں کون سی خوبی نظر آئی کہ انھوں نے صحافت کے طلباء کے لئے اسے بطور ''کتابِ حوالہ'' منظور کر لیا ۔ اس کتاب میں اس دور کے حالات اور رجحانات کی روشنی میں میں نے پیش گوئی کی تھی کہ برطانیہ میں اُردو زبان کے سب دیئے آئندہ پندرہ سالوں تک بجھ جائیں گے ۔ جب میں نے یہ دعویٰ کیا تھا تو میرے وہم و گمان

میں بھی نہ تھا کہ رضیہ اسماعیل جیسی صاحبِ طرز ادیبہ اور خیال افروز شاعرہ بھی برطانیہ پہنچ کر اپنی شمعِ اُردو کو روشن کر کے میری اس رائے پر خطِ تنسیخ کھینچ کر رکھ دیں گی ۔ مجھے خوشی ہے کہ میری وہ پیش گوئی حرفِ غلط ثابت ہوئی اور برطانیہ میں اُردو زبان کی مقبولیت اور عوامی چاہت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۔ اور اس کا یہ کریڈٹ لامحالہ رضیہ اسماعیل اور ان جیسی دیگر قلم کار خواتین کو جاتا ہے ۔

(یو-کے بیورو چیف
روزنامہ ''نوائے وقت'' پاکستان
روزنامہ ''دی نیشن'' پاکستان)

عورت کہانی

شاہدہ احمد
لندن

مدتوں یا زمانوں کی بات نہیں۔ یہ گزرتے ہوئے ہزارویں سال کی چوکھٹ سے جڑی اٹھارویں اور انیسویں صدی کا المیہ ہے، جہاں مشرق کی بات تو مشرق ہی جانے، مغرب کی عورت بھی احساس اور ذہن سے عاری صرف ایک جسم سمجھی جاتی تھی۔ ایسا جسم جس کا مصرف مرد کے فطری تقاضوں کی تسکین، اس کی نسل کی بڑھوتی، اس کی ناز برداری یا اس کے گھر کا باورچی خانہ سنبھالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ایک مخصوص سماجی اور معاشرتی حاکمانہ نظام میں عورت کے تجربے اور ویژن کو چار دیواری میں محدود رکھ کر نہ صرف اس کا جسمانی بلکہ ذہنی استحصال بھی کیا جاتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ہی طور پر یہ بھی طے کرلیا گیا کہ اول تو وہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتی، اور بالفرض اگر رکھتی بھی ہے تو مرد کی سطح پر نہیں۔ اس کی ذہانت مردوں کے مقابلے میں خود بخود دوسرے درجے کی گھٹیا اور کم معیاری تسلیم کرلی گئی۔

اپنے اس خود ساختہ فیصلے کو درست ثابت کرنے کے لئے اس نے عورت کو علم وادب اور فنونِ لطیفہ کے ہر میدان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے کولہو کے بیل کی طرح اپنے احکامات کے گرد گھومنے پر مجبور کیے رکھا۔ شعری تخلیق، نقد ونظر، افسانہ، ناول ڈراما، مصوری، مجسمہ سازی، طب، فلسفہ، سیاست یا معاشیات ہر وہ شعبۂ زندگی، جس کے ذریعے عورت کی زندگی میں تازہ ہوا کا کوئی روزن کھلنے کا امکان تھا، اس پر اسکے دروازے بند

رہے۔ اس کا نہ صرف ذہن بلکہ احساس تک پہروں میں گھونٹ کر رکھا گیا۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے کیا سوچتی ہے، اس کا اظہار بالکل اسی طرح معیوب سمجھا جاتا رہا جیسا کہ تیسری دنیا خصوصاً برصغیر پاک وہند کی ایک بڑی تعداد آج بھی سمجھتی ہے۔

صدیوں تک عورت کے فن پارے منہ بند تجوریوں کی طرح زبان بندی کے قفل میں رکھے رہے۔ وہ اندر ہی اندر شعر تراشتی، کہانیاں لکھتی، تصویریں بناتی رہی مگر آنچل میں بندھی گرہ کھولنے کی اجازت نہ ملنے کے انتظار میں نہ جانے کیا کچھ اس کے اندر ہی تلف ہو گیا۔ اور اجازت اس لئے نہ مل سکی کہ اس کے اندر چھپے خزانے نظروں میں آ کر اس کی فکر کو اعتبار نہ دے دیں۔

مغربی ادب میں مردوں کی اس اجارہ داری کا دائرہ توڑ کر اندر قدم رکھنے والی جن خواتین نے ہراول دستے کا کام انجام دیا، ان میں ایملی ڈکسن، جین آسٹن، گلیمن اور ورجینا وولف وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان میں سے کچھ کا کام زندگی میں اور کچھ کا مرنے کے بعد تسلیم کیا گیا۔

جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لئے صنفِ شعر دنیا بھر میں سب سے زیادہ مؤثر ذریعۂ اظہار سمجھا جاتا ہے۔ سمندر کو قطرے میں سمو دینے کا کمال رکھنے والی یہ صنفِ سخن پوری دنیا میں یکساں مقبول ہے۔ اس ضمن میں اُردو شعر وادب کے حوالے سے اُردو شاعری کی روایت میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے عورتوں کا جو حصہ یعنی (کنٹری بیوشن) ہے، اس نے شاعری کو نئے لہجوں، نئے آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اور کائناتی جذبات واحساسات کے انعکاس کے لئے غزل، پابند نظم اور آزاد نظم کے علاوہ نثری نظم کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ گو کہ نثری نظم کی روایت چند ناموں سے شروع ہو کر چند ناموں تک ہی محدود دکھائی دیتی ہے لیکن عورت کے تعلق سے کشور ناہید نے نثری نظم کو جو اثاثہ دیا ہے، وہ دیر تک اور دُور تک باقی رہنے والا ہے۔

رضیہ اسماعیل کی زیرِ نظر کتاب ''میں عورت ہوں' I am a woman'' میں عورت

کے حوالے سے جو نظمیں شامل ہیں وہ ہمارے سماجی ڈھانچے میں اس کی ذات کے ارتقائی پس منظر کی عکّاس ہیں۔ ان کی نظموں میں اس کی سوچ، اس کے دکھ، پل پل جینے مرنے کی اذیت، تکالیف و مسائل اور آرزوؤں، تمناؤں کے درد کی مار کھائے کاسنی پھولوں کی بہار ہے۔

رضیہ کی نظموں کی عورت کشور ناہید کی نظموں کی عورت سے مختلف نہیں۔ دونوں ہی کے یہاں بنتِ حوا کے ساتھ صدیوں سے چلے آتے ناروا سلوک پر احتجاج اور شناخت کا مطالبہ ہے۔ اپنی پہچان، اپنی عزت اور توقیر کی مانگ ہے لیکن کشور ناہید کی نظمیں ایک سانسیں روک دینے والا منظر نامہ ہیں جن میں روح کے تار جھنجوڑ دینے کی شدت ہے جب کہ رضیہ اسماعیل دھیمے لہجے کے پیراہن میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں عورت کی داخلی کیفیات کے علاوہ اندر سر اٹھانے والے سوالوں کی گونج بھی ہے۔ ماں، بیٹی، بیوی اور بہن کے رشتوں سے ہٹ کر بحیثیت ایک فرد، ایک انسان وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ اس کی اپنی ذات کہاں ہے؟ ''میرا حوالہ'' ہر عورت کے اندر شور مچانے والے انہی سوالوں کا جواب ہے۔

مردوں کے معاشرتی نظام میں وہ خود ہر تعزیر، ہر پکڑ سے آزاد ہیں لیکن عورت کے تمام گناہ وثواب کے بازپُرس کے حق دار ہیں۔ یہاں تک کہ وہ غلطی جس میں دونوں برابر کے شریک ہوں، اس کی خطا کی سزا بھی اکیلی عورت کے نام لکھی جاتی ہے۔ رضیہ نے اپنی نظم ''عورت کا گناہ'' اس بے انصاف روش کی تصویر ہے۔

میرے گناہ کی عمر
کیوں اتنی طویل ہے!
میرے شریکِ گناہ نے
پیار کے نام پر......
میری عصمت کی چادر تار تار کی

کبھی نہ آنے والے کل کی امید پر
ایک گھر کے سپنے دکھا کر
امیدوں کے گلشن کو خاکستر کیا
وہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا
مگر میرا گناہ...... میرے پیٹ میں
آلتی پالتی مار کر کیوں بیٹھ گیا ہے
میری کوکھ میں سڑاند کیوں
میں ماں تو بننا چاہتی تھی
مگر......
اب میرا ماں بننا باعثِ عبرت ہے
میں ننگِ خاندان، حوّا کی بیٹی
سنگسار کیے جانے کے لائق
مگر......
اس گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں
اسے کیوں نہیں
صرف اس لئے کہ
میرا گناہ ظاہر ہے
اور اس کا پوشیدہ......!
اس کا گناہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا
اور میرا گناہ......
دن کے اُجالے میں ظاہر ہو گیا!

رضیہ اسماعیل کی نظموں میں روز جی کر مرنے سپنے بُن کر ادھیڑنے، خواب چُن کر

بکھیرنے والی اور انتظار کے کرب سے گزرنے والی صرف مظلوم، کمزور اور ناتواں عورت ہی نہیں بلکہ اس میں اپنی قوت کا احساس موجود ہے۔ ''مدر ٹریسا'' جان لیوا انتظار کے ساتھ ساتھ عورت کی قوت کے اظہار کا مظہر ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے سفر میں علم و فضل نے اسے ناانصافی، ظلم اور جبر کی ان شکلوں سے واقف کر دیا ہے جنھیں نام دے کر نشان دہی پر وہ پہلے قادر نہیں تھی۔ یہی وہ خوف تھا جس سے ڈر کر مردوں نے اس پر لفظوں کی سمت جانے والے رستے میں کانٹے بو رکھے تھے۔

رضیہ کی نظموں میں عورت کے کرب، احتجاج اور پیاس کے علاوہ اس کا اپنے وجود کی سمت احساسِ آگہی بھی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ احساسِ آگہی ہی عورت کی حق رسی کا سب سے اہم موڑ ہے۔

مارچ ۲۰۰۰ء

حرمتِ قلم کی امین

فرخ زہرا گیلانی

لاہور

رضیہ اسماعیل کی شاعری انسانی زندگی کے اُس نصف کے متعلق ہے جسے علامہ اقبال نے ''تصویرِ کائنات'' کا رنگ کہا ہے۔ انھوں نے معاشرے میں عورت کے سماجی آشوب کا نہایت دردمندانہ نقشہ کھینچا ہے۔ عورت کو عورت ہونے کا وقار بخشا ہے۔ عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے احساس و تجربات اور مشاہدات کی مختلف سطحوں کو نہایت خوب صورتی سے چھوا ہے۔ عورت کے احساسِ محرومی اور بے بسی کا حقیقی تجربہ اور مشاہدہ ان کی کتابوں ''میں عورت ہوں'' اور ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

خواتین کی آزادیٔ فکر و عمل کو جاوداں بنانے، ظلم و استبداد اور حق و انصاف کے درمیان تقابل اور تضادات کے ذریعے انھوں نے سنجیدہ معاشرتی حقائق کی گرہ کشائی کی ہے۔ ان کے تصورات، ان کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جو ہم سب کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہیں۔ وہ پوچھتی ہیں کہ:

سوچ کے بادباں
اس ہوا، اس فضا میں کھلیں بھی تو کیسے کھلیں
مجھ کو تو ہی بتا، مجھ کو تو ہی بتا

ان کے نزدیک الفاظ صحرا نوردی تو کرتے ہیں مگر یہ انھیں آوارگی کی اجازت نہیں دیتیں۔ شاید ان کے نزدیک حرف مقصدیت کے بغیر زندگی کا پیامبر نہیں ہوسکتا۔ وہ جانتی

ہیں کہ رعنائی گلشن، شاخ تراشی اور دریا کی روانی کناروں کی دسترس میں ہوتی ہے۔لکھتی ہیں کہ:

لکھو، اتنا لکھو
یہ زندگی تحریر بن جائے
کسی کاغذ کے ٹکڑے پر
کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے

شاعری ہمیشہ دو رویوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔کبھی مشاہدات اس کو اپنے حصار میں لیتے ہیں تو کبھی خواہشات اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ان کے ہاں دونوں ہی رنگ موجود ہیں۔کبھی پتھر سے سطحِ آب پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں تو کبھی دائرے بنتے اور مٹتے ہیں تو کہیں محبتوں اور عقیدتوں کے گلابوں کی مہک ہے۔مثلاً

اشکوں سے وضو کر کے
ماہیے لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کر کے

زنجیر ہے پاؤں میں
دنیا دیکھ چکی
چل واپس گاؤں میں

ان کے اشعار میں احتجاج کی کیفیت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری ہمارے معاشرتی رویوں کے خلاف ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی ہے۔انھوں نے سوچوں کے سفیروں کو روایتوں کا محتاج کرنے کی بجائے طغیانیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیا ہے۔صاحبِ دستار کی سازش ، بے سروں کی مجبوریاں ، برگِ گل کا جمال ،گلشن کا ملال، زرد چہروں پر سسکتی مسکانیں، وقت کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ظالم کمانیں، ہونٹوں پر جاگتی پیاس ،آنکھوں

میں دم توڑتی ہوئی آس سب ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔مثلاً:

میں ظلم کو ظلم ہی کہوں گی ، میں رات کو رات ہی کہوں گی
میں ریت کو لہر کیسے کہہ دوں ، ندی کو کیسے سراب لکھوں

رضیہ اسماعیل ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ماہرِ تعلیم ،ادیبہ ،شاعرہ ،مزاح نگار سماجی کارکن ،حقوقِ نسواں کی علم بردار ،حرمتِ قلم کی امین، دید سے دیدہ ور تک وہ کسی سے منافقت نہیں کرتیں۔ان کے پاس طنز کا نشتر بھی ہے۔ظرافت کا وٹامن بھی ہے۔مزاح کا اینستھیزیا بھی۔جرأتِ اظہار، حریتِ فکر کو روبہ عمل لاتے ہوئے وہ کہہ رہی ہیں کہ زندگی کی اجتماعی جد و جہد میں عورت کا کردار تسلیم کیا جائے۔اس طرح معاشرہ وسعتِ نظر اور فکر و خیال کی ایسی ہمہ گیر صفت سے آشنا ہوگا جو قومی اور ملی فکر و وحدت کے لئے ناگزیر ہے۔اس لئے ہم سب کو رضیہ اسماعیل کی آواز سے آواز ملا کر کہنا ہوگا کہ آؤ ہم مل کے زمانے کو بتا دیں کہ وہ عورت جسے تم نے تصویر کہا ،محض تصویر نہیں ،منبعِ تنویر بھی ہے۔وہ فقط خواب نہیں ، خواب کی تعبیر بھی ہے۔صرف توقیر نہیں ،باعثِ توقیر بھی ہے۔

درویشنی

عصمت بانو
برمنگھم، برطانیہ

راجی، راج اور رجّو، یہ سب رضیہ کے بچپن کے پیار کے نام ہیں مگر ہمارے بابا اسے پیار سے ''راج دُلاری'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ وہ بابا کی بہت ہی لاڈلی اور منہ چڑھی بیٹی تھی اور کسی کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، اپنی ہی مستی میں سرشار۔ بڑی سنجیدگی اور متانت سے نہایت انہماک کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ نہ وہ خود کسی کے راستے میں آتی اور نہ ہی کسی دوسرے کی بے جا مداخلت پسند کرتی تھی۔ صاف گوئی، لگی لپٹی رکھے بغیر ہی بات کہہ دیتی۔ اگرچہ بڑی ہو کر اس کی صاف گوئی، سادگی اور سچائی نے اسے نقصان بھی پہنچایا۔ خودغرضی، منافقت اور ریاکاری سے بنی ہوئی اس دنیا میں مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی ہے کہ ابھی یہ دنیا اس جیسے سچے اور بے ریا لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یا پھر اسے بہت پہلے پیدا ہونا چاہیے تھا۔

ہم تین بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی مگر متانت اور بردباری میں وہ سب سے بڑی نظر آتی۔ رضیہ کے بعد پانچ بھائی پیدا ہوئے جس سے رضیہ کی نازبرداریاں اور بھی بڑھ گئیں کہ یہ بھائیوں کا بقول بابا ''بازو پکڑ کر لاتی ہے''۔ گویا بچپن سے ہی اسے ایک منفرد حیثیت حاصل تھی۔ اور بعد میں بھی زندگی کے ہر میدان میں اس نے اپنی یہ انفرادیت برقرار رکھی۔ بابا اسے ہمیشہ بیٹا کہہ کر بلاتے تھے اور اس نے بھی صحیح معنوں میں بابا کا بیٹا بن

کر ہی دکھایا۔ رضیہ نے بچپن میں زیادہ تر لڑکوں والے کھیل ہی کھیلے۔ عام لڑکیوں جیسے شوق اس نے کبھی نہیں پالے۔ نہ مہندی، نہ چوڑیاں، نہ اپنے کپڑوں کے لئے ضد، نہ ہنڈکلیا، نہ گڑیوں کے شادی بیاہ، نہ کسی کی سُن گُن، نہ ادھر کی باتیں ادھر، نہ بے جا شیخیاں، نہ شوخیاں، نہ شرارتیں۔ بڑی دیر تک تو اس کا مزاج ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ لڑکی کس مٹی کی بنی ہے اور کیا چیز ہے؟ کھیتوں کھلیانوں میں گھومنا، درختوں پر چڑھنا، جانوروں سے پیار کرنا، کتابیں پڑھنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔ نہایت ذہین تھی۔ سب سبق ازبر، اساتذہ کی آنکھ کا تارا۔ ہر امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا مگر سادگی اور بے نیازی کا یہ عالم کہ کبھی اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ منافقت، ریاکاری اور سطحی باتوں سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ کسرِ نفسی بہت ہے۔ ایک عجیب سی درویشی اور مجذوبانہ پن ہے اس کے اندر۔ اسے اپنی تنہائی بہت عزیز ہے۔ ذہین اور بلند کردار اور سچے لوگوں کی دل سے قدر کرتی ہے۔ دل اور ہاتھ دونوں سے سخی ہے۔ دامے، درمے، سخنے ہر ضرورت مند کی مالی اور اخلاقی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی عزت کی قائل ہے۔ ہر شخص کی عزت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے اس کی عزت کریں۔ اس کے بے تکلف دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر ایک سے ''آپ'' سے ہی مخاطب ہوتی ہے۔ صرف بے تکلف دوستوں اور بہنوں کے ساتھ ''تم'' کا صیغہ استعمال کرتی ہے۔ نہایت حسّاس اور نرم دل ہے۔ لوگوں کے منفی رویوں پر بہت جلد رنجیدہ ہو جاتی ہے اس لئے لوگوں سے کم سے کم ملتی ہے تاکہ بعد میں کبیدہ خاطر نہ ہو۔ جہاں کہیں منافقت کی بو پاتی ہے تو کسی سے کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے راستہ ہی بدل لیتی ہے۔ میری یہ اصولوں والی بہن، ایک اچھی منتظمہ، بہترین خاتونِ خانہ، نہایت پیار کرنے والی ماں، پُرخلوص شریکِ زندگی، جان چھڑکنے والی بہن اور قابلِ فخر بیٹی ہے۔ اپنے لفظوں کی حرمت کی امین، وقت کی پابند۔ جس کے ساتھ کمٹمنٹ کرتی ہے، اسے دل و جان سے نبھاتی ہے۔ حسّاس اس قدر کہ بچپن میں اس نے بلی پال رکھی تھی جو اچانک داغِ مفارقت دے گئی تو اسنے کئی روز تک اس کا سوگ منایا۔ باقاعدہ بلی کی قبر کھود

کر اسے دفن کیا اور اس کے بعد آج تک کوئی پالتو جانور نہیں رکھا۔ شاید رضیہ کے دل میں بچپن میں بننے والی ننھی سے قبر نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

بابا جب ولایت آئے تو یہ کوئی دس گیارہ برس کی رہی ہوگی۔ جدائی کے اس غم کو رضیہ نے روح میں اتارلیا۔ جوانی میں بہت ڈسٹرب اور مضطرب رہی اور شاید آج بھی کھوئی ہوئی پاکیزہ محبت کی تلاش میں رہتی ہے۔ بابا سے چھوٹی سی عمر میں جدائی نے رضیہ کی ننھی سی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا جس کا اندازہ کسی کو ٹھیک سے اُس وقت نہ ہوسکا اور شاید خود رضیہ بھی صحیح طرح اپنے آپ کو نہ اُس وقت جان سکی۔ بس اپنے اندر ہی کنڈلی سی مار کر بیٹھ گئی۔ اس لئے رضیہ کو سمجھنا، اس کے قریب جانا اتنا آسان نہ تھا۔ بس اندر ہی اندر غموں کی پرورش کرتی رہی۔ شاید یہیں کہیں اس کے اندر کی غم زدہ لڑکی نے ہاتھ میں قلم پکڑ کر ہوا پر لکیریں کھینچنا شروع کر دی تھیں۔ مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ میری یہ گم سم سی رہنے والی بہن ایک دن اپنے خونِ دل سے کاغذ کا سینہ لہولہان کر کے رکھ دے گی۔ لکھنا رضیہ کی مجبوری ہے، اس کا کتھارسس ہے، اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہ کرے تو شاید اس کے اندر کی گھٹن اسے ایک قدم نہ چلنے دے۔ کیوں کہ رضیہ ایک ساکت و جامد نہیں بلکہ ایک متحرک شخصیت کا نام ہے۔

میں نہ کوئی شاعرہ ہوں، نہ ادیبہ اور نہ نقاد۔ مگر ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ رضیہ کی تحریریں اس کے جذبے، احساس، تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں پل کر جوان ہوتی ہیں۔ اُس نے زندگی کو برتا ہے۔ سنی سنائی کہانیاں قلم زد نہیں کیں۔ غموں کی آگ نے اسے جلایا نہیں بلکہ مزید سنوارا اور نکھارا ہے۔ مگر افسوس صرف اس بات کا ہے کہ رضیہ نے بہت دیر سے لکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنی صلاحیت سے بہت کم لکھا ہے۔ اگر اسے موافق حالات ملے ہوتے تو اس کی پرواز کسی اور آسمان تلے ہوتی۔ رضیہ بنیادی طور پر اپنے ہی لئے لکھتی ہے۔ نہ چھپنے چھپوانے کا اہتما کرتی ہے اور نہ پی آر اور اور پروموشن کے لئے فکر مند ہوتی ہے۔ بس خاموشی سے اپنا کام کیے جاتی ہے۔ گویا ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''۔ بس اپنے مالکِ حقیقی سے خاص رابطہ رکھتی ہے۔

انسانی خدمت کو سب سے بڑی عبادت گردانتی ہے۔ اپنے خالق و مالک سے قائم پاکیزہ تعلق کو وہ کسی بھی قیمت پر آلودہ نہیں کرتی۔ روشن آنکھوں والی رضیہ کے اندر کی دنیا اس سے کہیں روشن ہے۔ یہ سب خدائے بزرگ و برتر کا انعام ہے۔ اس کا خاص کرم ہے میری بہن پر۔ جس کے لئے وہ خالقِ حقیقی کی بے حد شکر گزار ہے۔

رضیہ کو پلیٹ میں سجی سجائی زندگی نہیں ملی۔ اس کے لئے اس نے بہت محنت کی ہے۔ کتنی تاریک راتوں اور کتنی بے نور صبحوں سے آشنا ہوکر روشنیوں میں آئی ہے۔ اس کے سب محاذ زندہ ہیں۔ گویا اس نے زندگی نہیں گزاری چومکھی لڑائی لڑی ہے اور اب تک لڑ رہی ہے۔ اور یقیناً آخری فتح بھی حق اور سچائی ہی کی ہوگی۔ رضیہ ایک گوہرِ نایاب ہے اور مجھے رضیہ کی بہن ہونے پر فخر ہے۔ رضیہ کی ناقدری کرنے والے لوگوں نے رضیہ کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک نایاب انسان کی دوستی اور محبت سے محروم رہ گئے ہیں۔ رضیہ ایک شعر اکثر دہراتی رہتی ہے:

ہم فلک کے آدمی تھے، ساکنانِ قریۂ ماہتاب تھے
ہم ترے ہاتھوں میں کیسے آگئے، ہم تو بڑے نایاب تھے

حصہ دوم

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے تحریر کردہ مضامین، تبصرے اور جائزے

حیدر قریشی کی ’’شخصیت اور ادبی جہات‘‘ پر پی ایچ۔ڈی کا مقالہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

جرمنی میں مقیم ممتاز دانشور، شاعر، ادیب، صحافی، نقاد اور اُردو ماہیا پر بنیادی نوعیت کے تحقیقی کام کے بانی جناب حیدر قریشی کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کام پر شعبۂ اُردو فارسی گلبرگہ یونیورسٹی سے عبدالرب استاد کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔

ان کے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کے عنوان ’’حیدر قریشی اور ادبی جہات‘‘ تھا۔ حیدر قریشی کے ایک طویل عرصہ پر محیط علمی و ادبی کام پر ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تیاری کے نگران ڈاکٹر حمید سہروردی پروفیسر و سابق صدر شعبہ اردو فارسی گلبرگہ یونیورسٹی تھے۔

اس مقالے کی اختتامی تقریب میں سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے پروفیسر نورالدین، گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی کے سربراہ ایم اے حمید، شعبۂ ہندی کی سربراہ محترمہ پری صاحبہ، شعبہ مراٹھی کی سربراہ محترمہ وجیا تلنگ، کنٹرولر امتحانات پروفیسر ملہے، پروفیسر وینکٹش کے۔ایس، پروفیسر شیواجی واگھمورے، ڈاکٹر افتخار الدین، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر کوثر فاطمہ، ڈاکٹر سید چندا حسینی، اکبر فیروز خان کے علاوہ ریسرچ اسکالرز سید عارف مرشد، شمیم ریحانہ، زرینہ چودھری، نویدہ سلطانہ، حامد رضا اور دیگر افراد جون کے آخر میں ہونے والے زبانی امتحان (وائیو) کی تقریب میں شامل تھے۔

پانچ ابواب پر مشتمل اس مقالے میں حیدر قریشی کی شخصیت و سوانح، جہتِ شعر، غزل، نظم، ماہیا، جہت نثر، افسانہ، خاکہ، انشاپردازی، یادداشت، سفرنامہ، تحقیق و تنقید اور

جہات صحافت میں جدید ادب (میگزین) کی ادارت، کالم نگاری اور حیدر قریشی کی مشاہیر نظمیں شامل ہیں۔

327 صفحات پر مشتمل مقالے میں حیدر قریشی کی زندگی کا تصویری سفر بھی شامل ہے۔

یادر ہے کہ مغربی دنیا میں مقیم اردو کے کسی ادیب پر یہ پی ایچ ڈی کا پہلا مقالہ ہے۔ اس سے قبل کئی ادبی شخصیات پر ایم اے اور ایم فل کی سطح پر کام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے حیدر قریشی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اردو ماہیے میں حیدر قریشی کی نمایاں شناخت کے ساتھ دیگر اصناف میں ان کے ادبی کام کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ عبدالرب استاد کا کہنا ہے کہ ان کی ہر ادبی جہت ایک الگ پی ایچ ڈی کا تقاضا کرتی ہے۔ تقریب کے جملہ شرکاء نے ڈاکٹر عبدالرب استاد کو اس اہم تحقیقی کام کی تکمیل پر دلی مبارک باد دی۔

''ردائے کمال''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

چند برس قبل جناب قاضی عنایت الرحمٰن کا پہلا شعری مجموعہ ''ستارے پھوٹتے ہیں'' نہایت تزک و احتشام سے برطانیہ کے ادبی افق پر نمودار ہوا تو اس تقریب سعید کی نظامت کے فرائض انہوں نے خاص طور پر میرے سپرد کیے جو میرے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ اس یادگار تقریب میں قرب و جوار سے دوست احباب نہایت خلوص و محبت سے شریک ہوئے۔ محبتوں کی بے پناہ بارش میں قاضی صاحب کی آنکھیں بھیگ بھیگ سی گئیں۔

دل میں بسو کہ اس کو صنم خانہ کہہ سکیں
ویران بت کدے کی کوئی آبرو نہیں

یہ ان کے پہلے شعری مجموعہ کا آخری شعر تھا۔ اتنے برسوں میں میں ان کے اس شعر کی لذت اور سحر سے ابھی آزاد نہ ہو پائی تھی کہ انہوں نے ایک اور کمال کر دیا یعنی ''ردائے کمال'' اوڑھی اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے گویا کہہ رہے ہوں کہ ''ہم سا ہو تو سامنے آئے''۔

قاضی صاحب کی شخصیت پر ذاتی اور ظاہری حوالوں سے روشنی ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ان کی شاعری خود اس کا حوالہ ہے۔ قاضی صاحب وہی ہیں جو اپنی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ یعنی محبت و خلوص کا پیکر، عجز و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی، حساس اور دردمند دل جو ہر کسی کی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے، شفیق و مہربان، مرنجاں مرنج، دوستوں پہ جان لٹانے والے، علم و آگہی کے خزانے دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہیں اور خرابی

صحت کے باوجود ان کے دروازے ہر ایک کے لیے ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں۔
سادگی، مروت، حسن سلوک کا پیکر، بڑی سے بڑی بات پر بھی معصومیت سے مسکرا دینا ان کا خاص وصف ہے۔ قاضی صاحب، جہاں ایک عمدہ انسان ہیں وہیں ایک اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ ان کے دونوں شعری مجموعے ان کی ذات کی تصویر و تفسیر ہیں۔

کہتے ہیں کہ منصور ابن حلاج نے مصلوب ہونے سے چند لمحے قبل اپنے ماننے والوں کے اصرار پر انہیں نصیحت یا وصیت کی کہ ''اپنے آپ کا مطالعہ کرو''۔

ردائے کمال بھی قاضی صاحب کی اپنی ذات کے مطالعے کی ایک بھرپور، دلکش اور کامیاب کاوش ہے۔

مثلاً حرمتِ رسولؐ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ۔

اک قلم خاص جو مل جائے میں نعت لکھوں
روشنی اس میں اتر آئے تو میں نعت لکھوں

*****

قبلۂ کونین ہیں میرے حضورؐ
سب دلوں کا چین ہیں میرے حضورؐ

ان کی سادگی کی مثال اس شعر میں دیکھیں: ۔

آئے ہو تو زباں سے کچھ بولو
میں شناسا نہیں اداؤں کا

یا پھر

دل مجھے دان کردیا ہوتا
مجھ پر احسان کردیا ہوتا

ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کا ایک نمونہ دیکھئے: ۔

ہو گیا ان سے غصے میں مرا قتل تو کیا
دوست اپنے ہی تھے ہم خوں بہا کیا کرتے

یا پھر۔

لوگوں کو ملا پیار تری بزم سے قاضیؔ
ہم کو تو ملا ان سے فقط درد کا پیغام

عاجزی وانکساری اور احساس ذمہ داری ملاحظہ کریں: ۔

خدا کرے کہ سخن کار ہے بزم قاضیؔ
خدا کرے کہ سلامت رہے قلم قاضیؔ

قاضی صاحب نے نظم اور غزل دونوں بھرپور توانائی کے ساتھ لکھی ہیں ردائے کمال میں نعتوں، منقبت اور غزلیات کے ساتھ ساتھ نہایت پر اثر نظمیں بھی ہیں جن میں گردوپیش کے حالات پر یہ نوحہ کناں ہوتے ہیں تو میرے آنسو، زلزلہ، سونامی، مظلوم، آج تو......، سراب، رات کے دکھ اور نظر آتا ہے ہر چہرے پر ماضی کے علاوہ وطن کی زبوں حالی پر ان کا دل پارہ پارہ ہوتا ہے تو میرے وطن جیسی نظمیں لکھتے ہیں۔ مثلاً: ۔

یہ رنگ رنگ چنا ہے کہ خوں غریبوں کا
تری زمین ہوئی پھر سے ارغواں کیسے
جو بیچتے ہیں تیری آن غیر کے ہاتھوں
مجھے دیئے تیرے لوگوں نے حکمراں کیسے

اس کے باوجود وطن کی محبت کا دریا موجزن ہوتا ہے تو پکار اٹھتے ہیں۔ ۔

گردشوں کا وطن
مشکلوں کا وطن
زلزلوں کا وطن
بے گھروں کا وطن

یونہی میرا وطن

یونہی میرا وطن

اپنی ذات کے بھنور میں جب ڈوبتے اور ابھرتے ہیں تو ایک ناصح کا ادب دھار لیتے ہیں۔ ؎

سوچتے سوچتے سوچتا رہ گیا
سوچ اتنی بڑھی اک خدا رہ گیا
سوچتے سوچتے ہی تو سو نہ سکے
سوچ ہی سے بہت کچھ بچا رہ گیا

پھر یوں اس کیفیت میں زندگی کی بہت بڑی سچائی اور پاکیزگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

زندگی ہم جسے سمجھتے تھے
ہے فقط کامیاب سجدے میں

قاضی صاحب کو ان کی دوسری شعری کاوش پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد کہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''۔

فکروفن کا تقدس 'اشکِ گل'

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم

دیوان عادل بعنوان 'اشکِ گُل' جس طرح خلوص و اپنائیت کے پتوں میں لپٹا ہوا بذریعہ ڈاک موصول ہوا میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دنیائے شعر و ادب کو دیکھتے اور سنتے ہوئے برطانیہ میں تقریباً چالیس برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہوگیا ہے مگر کسی شعری مجموعے کی روانگی میں ایسا انتظام و انصرام شاید ہی ملاحظہ کیا ہو۔ اور اس پر انکسار کا یہ عالم کہ 'جواب کے لیے واپسی ڈاک خرچ' پیش نہ کر سکنے پر معذرت۔ سبحان اللہ۔ جیسے جیسے اوراق پلٹی گئی علم و آگہی کے در وا ہوتے چلے گئے اور پھر صاحب دیوان کا یہ شعر تو آنکھوں کو نمناک کر گیا۔ ؎

روح کی تابندگی کو زندہ رکھ
جسم کی تاریکیوں میں رکھ دیا

پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی صاحب سے لے کر جناب مظفر حنفی، جناب اکبر حیدر آبادی، جناب خالد یوسف مرحوم، جناب عقیل دانش، جناب ساحر شیوی، محترمہ سیما جبار، پروفیسر ڈاکٹر عمیر احمد قریشی، جناب ایوب کامران رعد اور کونسلر ذکیہ زبیری صاحبہ کے تاثرات و تجزیات پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ 'اشک گل' محض 'دیوان عادل' نہیں بلکہ 'دبستان عادل' کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہ کوئی عام شعری مجموعہ نہیں، بلکہ فکروفن کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو قاری کو بحرِ سخن میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔

بقول صاحب دیوان ؎

شاعری سوچ کا سمندر ہے
کوئی موج آخری نہیں ہوتی
شمع کو بھی جلانا پڑتا ہے
خود بخود روشنی نہیں ہوتی

'اشکِ گُل' ایک مکمل شعری تہذیب ہے جس میں اگر مدحت ومنقبت ہے تو غزل کے بے شمار رنگ اور روپ ہیں جو زینہ بزینہ قاری کو کبھی ہیئت کے تجربات کی نیرنگی تو کبھی فکر وفن کی انوکھی چاشنی عطا کرتے ہیں۔ مبسوط 'اشاریۂ بحور واوزان' ضائع بدائع کا بیان، فکر انگیز اور شگفتہ غزلیں اسے ایک منفرد تخلیقی کاوش کا درجہ عطا کرتے ہیں، جہاں الفاظ ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں تو افکار قلب و ذہن کی بلائیں لے رہے ہیں۔ ان اشعار میں تخیل کی رفعتیں ملاحظہ کریں ؎

ہم کو سدا ہی رشک رہا کوہ طور پر
جلووں کو جو سمیٹ کے خود راکھ ہوگیا
ہمیں محبوس کرکے چار سو میں
کہا پھر لا مکاں کو یاد رکھنا
سمندر ہوں میں قطرہ تو نہیں ہوں
کراں سے کیا کراں کو یاد رکھنا
ہمارے درمیاں لاکھوں جہاں ہیں
اگر سمجھیں تو یوں ہم بے کراں ہیں
یہی عادلؔ خبر کی انتہا ہے
خبر کچھ بھی نہیں ہے انتہا کی

ایسے میں نیا بدایونی کا شعر یاد آرہا ہے کہ ؎

فکر اور فن کے تقدس کی علامت ہے غزل
ادب اے دوست! یہ کوچہ مری تہذیب کا ہے

دیوان عادل جہاں قاری کو ایک ہمہ گیر شعری تہذیب سے آشنا کرتا ہے وہیں صاحب دیوان کی شخصیت کے کئی تابناک پہلو آشکارا ہوتے ہیں۔ کہیں ترقی پسند عالم دین تو کہیں شعلہ بیان خطیب، کبھی مفکر اسلام تو کبھی ایک محقق، کہیں زبان وادب کے استاد تو کہیں براڈ کاسٹر، ماہر فن خطاط تو کہیں رنگوں سے رنگولی بنانے والے مصور اور ایک صاحب طرز شاعر وادیب، مگر پھر بھی کہہ رہے ہیں ؎

ہوں اپنی ذات سے اکتا گیا میں
میں باہر خود سے جانا چاہتا ہوں

یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

اک سمندر رہا ہے چاروں اور
تیرتے ایک بھنور میں گزری ہے
دیکھ یہ درد و الم، کرب و ستم، کلفت و غم
شورِ ماتم میں طرب کے بھی تو نغمات نہ مانگ
ملے ہیں دوست عادلؔ مجھ کو فقر وفکر و درد وغم
یہ ساتھی ہوش خوشیوں میں کبھی کھونے نہیں دیتے
دل و فکر و زباں باہم جو محور رقص بسمل ہوں
تو پھر جا کے غزل پر سوز و پر تاثیر بنتی ہے
درد و الم، شکایت و حرماں کے باوجود
مایوسیوں میں ڈوبی ہوئی یہ فغاں نہیں

یعنی بقول کسی اور شاعر کے ؎

یاس، حسرت، رنج و غم، درد و الم، سوز وگداز
دل میں میرے آیئے، آٹھوں کا میلا دیکھئے

'اشک گُل' کی مہک جیسے جیسے قاری کے دل ونظر کو معطر کرتی جاتی ہے ویسے ویسے صاحب دیوان کے بے پناہ تخلیقی جوہر اور منفرد اسلوب کو دیکھ کر ایک ہشت پہلو ہیرے کا تصور ابھرتا ہے۔ ہیرے کا تو ہر عکس ایک ہی جیسا ہوتا ہے مگر فیاض عادلؔ فاروقی کی متحرک شخصیت کے ہر پہلو اور ہر زاویے کے چمکنے کا انداز الگ الگ ہے۔اس کے باوجود عجز و انکسار کا عالم ملاحظہ کریں۔

اک میں ہے میری اور مرا کچھ بھی تو نہیں
سب کچھ ہی تو کسی کا مجھے ہے دیا ہوا

انگریزی زبان کا مقولہ ہے کہ 'بچپن اسی طرح آدمی دکھاتا ہے جس طرح صبح دن دکھاتی ہے'

Chidhood shows the man, as the morning shows the day

زمانہ طالب علمی میں مشنری سکول کی اسمبلی میں دعا کے حوالے سے ننھے محمد فیاض کی طرف سے اعلان توحیداور پھر سیدنا فاروق اعظمؓ کی عزت وحرمت کے لیےان کے جذبات اور پھر فاروقی نسبت اختیار کر لینے کی سعی نے بہت متاثر کیا۔ دعا عبادت کا مغز ہے بلکہ دعا خود عبادت ہے۔ بہترین خزانوں کے مالک، میرے عظمتوں والے خالق ورازق کو یہی پسند ہے کہ دست سوال صرف اسی کے سامنے دراز کیا جائے، اسی سے مانگا جائے۔ اور مانگنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے سامنے عاجزی سے دامن پھیلا جائے وگرنہ گریہ سے محروم آنکھ، عجز وانکسار سے محروم گویائی اور اپنے عزم عمل سے اپنی عبودیت کی پاسداری کے بغیر دعا اس کے ہاں شرف باریابی حاصل نہیں کرسکتی کیونکہ بقول فیاض عادلؔ فاروقی۔

عمل میں ڈھالیں جو وقت سحری دعائے شب کو
انہیں کا پھر کوئی خواب تعبیر یاب ہوگا

عطا اس کی ہے اس سے مانگنا بھی
عطا ہے گر دعا اس نے عطا کی
وہ دے گا ہی، کوئی مانگے نہ مانگے
جزا دے گا مزید اس پر دعا کی

بقول خواجہ محمد عارف۔

جمال عاجزی کیا ہے؟ دعا ہے
کمال بندگی یا ہے؟ دعا ہے
سوائے افلاک جو اٹھتی ہے میری
نگاہ ملتجی کیا ہے؟ دعا ہے
تہ دل سے سر عرش معلیٰ
لپکتی دوڑتی کیا ہے؟ دعا ہے
زباں خاموش ہے پھیلا ہے دامن
یہ چشم شبنمی کیا ہے؟ دعا ہے

میں سمجھتی ہوں کہ 'اشک گُل' بھی ایک دعا ہے، نالہ شبی ہے، آہ سحر گاہی ہے، بلبل کی تڑپ ہے، پرسوز دل کی تپش ہے، کوئل کی کوک ہے، بانسری کی تان ہے، پپیہے کی پی پی ہے، نرگس بیمار کی چشم تر ہے، 'الف' سے التجا و پکار اور 'میم' سے محبت وعشق ہے، 'اللہ ھو' کا ورد ہے جس سے حور وملک، جن وبشر، چرند وپرند، شجر وحجر، مہر وانجم اور ذرہ وقطرہ رطب اللسان رہتے ہیں۔ صاحب 'اشک گُل' اسی لیے کہتے ہیں کہ۔

ہوتی ہے اشک گل سے تو صبح چمن شروع
گزری ہے شب کو کیا، یہ نہیں پوچھتا کوئی
غم جاناں، غم ایماں، غم انساں، غم دوراں
مجھے راتوں کو اتنے سارے غم سونے نہیں دیتے

بہت روئے ہو عادلؔ سو بھی جاؤ
اثر ہوتا تو ہے آہِ سحر میں
زخم ہیں عادلؔ کے
شعر نہ ان کو جان

علامہ اقبالؔ نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

شوق میری لے میں ہے، شوق میری لے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

دیوان عادلؔ 'اشک گل' پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ آنکھیں بھیگ بھیگ سی گئیں۔ کیونکہ جو پاکیزہ نسبت صاحب 'اشک گل' نے اپنائی ہے اس پر رشک آتا ہے۔ کیا دیانت دارانہ اعتراف ہے کہ۔

نسب میرا سہی ادنیٰ، مگر نسبت تو ہے اعلیٰ
عمر فاروقؓ کا عاشق ہوں میں فاروق عادل ہوں

خوش قسمتی سے ہم بھی فاروق عاشقاں میں شامل ہیں۔ حضوری کے بغیر آنکھ نم نہیں ہوتی۔ دھیمی دھیمی جذبوں کی آنچ کے بغیر دل نہیں پگھلتے۔ 'اشک گل' بھی نوائے سینہ سوز سے ٹپکا ہوا ایک پاکیزہ آنسو ہے جو شوق و سرمستی کے بغیر کسی آنکھ سے نہیں چھلکتا۔ صاحب دیوان عادلؔ کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

فلک سے نور نہ لو گے تو ہوگی تاریکی
جلا کے دیکھ لو سارے دل و نظر کے چراغ
کبھی حمد کبریا ہے، کبھی نعت مصطفیٰؐ ہے
مری راہ پر ضیا ہے، مرا مستقر صفا ہے
رہ مصطفیٰ سے ہٹ کر کسی اور رہ کے رہرو
ترا راستہ جدا ہے، مرا راستہ جدا ہے

میں بہت خلوص سے محمد فیاض عادلؔ فاروقی کو ان کے پہلے شعری مجموعے 'اشک گل' دیوان عادلؔ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اقلیم شعر و سخن آنے والے وقتوں میں ان کی حق و صداقت کی علمبردار مزید شاعری سے فیضیاب ہوگی۔ اب اجازت چاہوں گی اپنے ان اشعار کے ساتھ کہ۔

وقت کی گود میں اک سویا ہوا لمحہ ہوں
جاگ اٹھوں تو بڑا حشر بپا ہوتا ہے
اگر میں آنکھ ہوں تو دیکھنے سے کون روکے گا
اگر میں لفظ ہو تو بولنے پر کون ٹوکے گا
مرے افکار کی طاقت زمانے کو ڈرا دے گی
میں سچ ہوں جھوٹ کے باٹوں سے مجھ کو کون تولے گا

دعا گو

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، برمنگھم

29 ربیع اول 1436 بمطابق 20 جنوری 2015 (تاریخ پیدائش عادل 20 جنوری 1948 کے ٹھیک 67 سال بعد) موبائل فون 0750 7646659

''محبتوں کے یہ استعارے''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

فرحت نواز کا پہلا شعری مجموعہ ''استعارہ مری ذات کا'' اپنی تمام تر شعری نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ اور میں سوچ رہی ہوں کہ خواب دیکھنے والی آنکھ نے اپنی بات کہنے میں اتنی دیر کیوں کی؟ آنکھ کی گود تو کبھی خوابوں سے ویران نہیں ہوتی۔ خواب ٹوٹ سکتے ہیں، بکھر سکتے ہیں، ان کی تعبیریں بدل سکتی ہیں، مگر خواب کبھی نہیں مرتے، ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، ریزہ ریزہ خواب، کرچی کرچی خواب، بکھرتے خواب، ادھورے خواب کسی بھی نام سے پکاریں خواب تو خواب ہی رہتے ہیں۔ پھر فرحت تو خواب گر ہے اس لیے تو کہہ رہی ہیں۔

جوڑ رہی ہوں کرچی کرچی ٹوٹے خواب
پلکوں سے چن چن کر سارے بکھرے خواب
آنکھوں میں جب خواب بھی کوئی نہ اترے
فرحتؔ بن لیتی ہوں میں لفظوں کے خواب

لگتا ہے کہ فرحت نے ایک طویل عرصہ یادوں کے تپتے ہوئے صحرا میں آبلہ پائی کی ہے مگر یہ یادیں آکاس بیل کی طرح جسم و جاں سے لپٹی ہی رہتی ہے یادیں بے وفائی نہیں کرتیں۔ ان کے زخم ہر موسم میں پھول بن کر خوشبوؤں کا ہالہ کیے رکھتے ہیں، اور فرحت نے ان یادوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کی بجائے ان کے لمس اپنے اندر سموئے ہیں۔ وہ ان خوشبوؤں اور رنگتوں سے خوب واقف ہے۔ اس لیے کہ نہایت اعتماد سے کہہ رہی ہے

مجھ کو معلوم ہے استعارہ میری ذات کا۔ کون سا رنگ ہے تم نے جو رنگ اوڑھا ہے۔ ان میں تو وہ رنگ ہے ہی نہیں!!! گو کہ فرحت نے ''ملکِ ادب سے ایک طویل عرصہ خود ساختہ جلاوطنی کا اعتراف کیا ہے مگر اس عرصے میں اس نے شعری طاقتوں کے بہت سے اور رنگ اور روپ اپنے اندر اتارے ہیں۔ جنہوں نے اپنے عرفانِ ذات کے جانکاہ مراحل سے گزارا۔ مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس شعری مجموعے کا پہلا شعر: ۔

میری محبت کی کشتیاں تو میری رہیں گی
تم اپنی چاہت کے موسموں کا خیال رکھنا

اور آخری نظم ''ایک مشکل فیصلہ'' تک آتے آتے انہوں نے برسوں کا فیصلہ چند لفظوں میں طے کر لیا ہے اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو: ۔

مگر اِک مرحلہ درپیش ہے پھر بھی
تمہارا لمس جو اس جان و دل پہ
آج بھی ایگزسٹ کرتا ہے
اسے کیسے کروں ڈسپوز آف!

بات بس آخری فیصلہ کرنے میں؟ کہیں ذرا سی اٹکی ہوئی ہے۔ مگر میرا ماننا ہے کہ فرحت جی کہ لمس کبھی نہیں مرتے۔ انہیں زندہ ہی رہنے دو۔ صدیوں سے چاند میں بیٹھی چرخہ کاتنے والی بڑھیا کے چرخے کی گھوں گھوں کی طرح صحن، ذات میں چلتے ہوئے چرخے کی گھوں گھوں سے اندر کی دنیا آباد ہی رہتی ہے تبھی تو فرحت کہہ رہی ہیں ۔

ہوا درختوں سے سوکھے پتے گرا رہی ہے
مہکتے زخموں کی تازگی کا خیال رکھنا

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''عورت محبت کی وہ کہانی ہے کہ جب اختتام کو پہنچتی ہے تو ایک نیا آغاز پاتی ہے۔ یہ شعری مجموعہ اسی آغاز اور اختتام اور پھر آغاز کی کہانی سنا رہا ہے۔
فرحت اس شعری مجموعہ میں محبتوں کے کئی اختتام اور کئی آغاز کرتی نظر آ رہی ہیں۔

ان کی نظم ''رستہ تکتی آنکھیں'' ملاحظہ کریں۔

دل آنگن میں پیڑ گھنا امیدوں کا تھا
سکھ موسم نے آنے میں کیوں دیر لگا دی

یا پھر یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

آسمانوں پہ ہے ملن شاید
اپنی سچی رہی لگن شاید

******

لفظ خوشبوئیں دینے لگتے ہیں
خط لکھوں جب آ سے محبت سے

******

نئے اک سانحے سے میں گزرنا چاہتی ہوں
تمہیں کھونے کے دکھ سے اب مکرنا چاہتی ہوں

******

اسی موضوع پر چند ماہیے ملاحظہ ہوں

موتی میں چمک آئی
نام لیا تیرا
لہجے میں کھنک آئی

******

کب دل پر چاتی ہے
اب تصویر تری
چپ رہ کے ستاتی ہے

******

بیٹھوں جوا کیلے میں
تنکا بن جاؤں
یادوں کے ریلے میں

******

فرحت سے میرا پہلا تعارف چند برس قبل ان کی دو خوبصورت نظموں سے ہوا جو جرمنی میں مقیم ممتاز دانشور، شاعر، ادیب، محقق حیدر قریشی کی وساطت سے موصول ہوئیں۔ یہ نظمیں فرحت نے ویمن ڈے کے لیے لکھی تھیں۔ خواتین کا عالمی دن ہر سال 8 مارچ کو دنیا بھر میں نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ ہماری ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آ گہی'' بھی اس دن کو نہایت جوش وخروش سے مناتی ہے۔ ان کی نظمیں بہت فکر انگیز تھیں جس میں عورت کے داخلی جذبات کی خوبصورت ترجمانی کی گئی تھی

پہلی نظم

میری تو قسمت چمکی ہے
گال گلاب اور آنکھیں نیلم
ہونٹ یاقوت اور دل سونا ہے
جسم ہے گویا سچا موتی
تم تو ہوا انمول خزانہ
اس انمول خزانے پر وہ
پہلی رات سے لے کر اب تک
پھن پھیلائے بیٹھا ہے

******

دوسری نظم

وہ جس کے لیے زندگی وقف کی

سانس جو میں نے لی
جس کی رضا سے لی

....

....

میں نے سب کچھ کیا
پر نہ راضی ہوا وہ مجازی خدا!!!

******

خوشبو کی شاعرہ۔ پروین شاکر کی مانند فرحت نے بھی نہایت سلجھے ہوئے اور دھیمے لہجے میں پھولوں، موسموں، رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں، خوابوں اور سرابوں کی بات کرتے ہوئے نسائی جذبوں کو خوبصورت زبان دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آنکھ کھلی تو تنہا بیٹھ کے رویا ہو گا
میری خوشبو اوڑھ کے کب تک سویا ہو گا

******

خوشبو کی طرح پھیلی جفا کو سمیٹ لے
یا اپنی اس انا کی ہوا کو سمیٹ لے

******

گلاب رت میں بھی اتنی اداسیاں فرحتؔ
ترے لیے تو ارم آسمان سے اترے

******

خوش فہمی کے سارے جگنو
بجھنے لگے ہیں دل کے اندر

پھولوں نے جانے کیا لکھا
تتلی کے گھبرائے تن پر

******

فرحت نے نہایت مہارت، سچائی، سادگی اور دیانت داری سے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے مگر پھر بھی کہہ رہی ہیں

تم کو اپنی ذات کے اندر
کے موسم کا حال کیا لکھوں
کیونکہ میں تو کئی رتوں سے
اپنی ذات سے باہر بیٹھی
راہ تمہاری دیکھ رہی ہوں

اپنی ذات سے باہر بیٹھنا بہت بڑی اور خوبصورت بات ہے مگر اب فرحت کو مشورہ ہے کہ اپنی بات کہہ کر عرفانِ ذات کے جس مرحلے سے آپ گزری ہیں اب ذرا اندر کے موسموں کی بھی خبر لیں یقیناً وہ بھی بدل چکے ہوں گے اور آپ سے گفتگو کرنے کے لیے بیتاب ہوں گے۔ اپنی بات کہتی رہے۔ ہم سب سنتے رہیں گے۔ کامیاب تخلیقی کاوش پر دلی مبارکباد ہے۔ ان اشعار کے ساتھ: ؎

محبتوں کے یہ استعارے
وفا کے روشن چراغ سارے
چمکتی صبحیں، وصال شامیں
ہیں دسترس میں سبھی نظارے

اللہ رب العزت آپ کو شاد و آباد رکھے (آمین) دعا گو

''جستجوئے جمال''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

حسن وصداقت اور سچائی کی تلاش ہمیشہ سے ادب کے بنیادی موضوع رہے ہیں۔ حسن مطلق کی کرنوں کا نفوذ اور تلاش وجستجو جمالیاتی ذوق اور تخلیق کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے۔ جستجوئے جمال میں انسان نے کبھی لفظوں سے پیکر تراشے ہیں تو کبھی پتھروں سے۔ کبھی رنگوں کو زبان دی ہے تو کبھی رقص وموسیقی کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔

جناب آدم چغتائی کے زیرِ نظر کتاب ''جستجوئے جمال'' کو پڑھتے ہوئے یہ خیال بہت شدت سے اجاگر ہوتا ہے کہ حسن و جمال کی جستجو اور اس کائنات میں چارسو پھیلے ہوئے رنگ ونور کے ہر زاویے سے تلاش ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔

میرے خیال میں اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا یہ کائناتِ ''کن فیکون''۔ بذات خود جمالیات کا وہ طاقتور آئینہ ہے جس میں ہر صاحب فکر ونظر ظاہری حسن کو سراہنے کے ساتھ ساتھ۔ کئی گنا پوشیدہ حسن و جمال کو سب کے روبرو لانے کی سعیِ پیہم میں لگا رہتا ہے۔

اس کائنات کا مالک حقیقی یعنی ''اللہ تبارک وتعالیٰ جمیل ہے، اور جمال کو پسند کرتا ہے'' میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس شعری مجموعے کی تخلیق میں یہ بات ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی ہوگی کیونکہ جمالیات ان کی شاعری کا ایک واضح مقصد ہے۔

''جستجوئے جمال'' آدم چغتائی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے مگر ان کے اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے میں نہایت کوشش کے باوجود بھی ان کے پہلے شعری مجموعے ''نوائے آدم'' کو

اس سے الگ نہیں کر پائی۔ یہ دونوں شعری مجموعے مجھے ایک ہی سلسلے کی دو نہایت مضبوط کڑیاں دکھائی دیئے۔ ''نوائے آدم'' تلاش وجستجو کا اولین قدم معلوم ہوتا ہے جب نافرمانیوں نے انسان کو اس زمین پر لا پٹخا۔ نہ جانے کیوں مجھے میدان عرفات میں ''جبلِ رحمت'' کی یاد آئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی اور اس کے بعد جب انہوں نے سجدے میں سے سر اٹھا کر چاروں جانب نظر دوڑائی ہوگی تو یہ دنیا بھی انہیں خالق اعلیٰ کے حسن و جمال کا پرتو نظر آتی ہوگی اور یقیناً تجسس کی لہریں تلاش وجستجو کے ساحلوں سے ٹکرا کر کہتی ہوں گی کہ ۔

اک لفظ تھا کُن جس نے اندھیروں کو ضیا دی
تخلیق کا وہ راز بتا کیوں نہیں دیتے

''نوائے آدم'' کا یہ شعر اگر نقش اول ہے تو جستجوئے جمال نقش ثانی ہے تلاش وجستجو کے پہلے قدم سے لے کر جستجوئے جمال میں انہوں نے جس جادۂ عرفان کا سفر اختیار کیا ہے۔ اس راستے میں کہیں عقیدت ومحبت اور احترام وعبادت کے دیار آتے ہیں تو دل ونگاہ فرشِ راہ ہو جاتے ہیں، کہیں حسن ورنگینی دامنِ دل کو کھینچتی ہے تو حسن وعشق کی سرمستیاں بڑھ جاتی ہیں۔ گویا مجاز سے حقیقت اور حقیقت سے مجاز کی طرف سفر کے دوران جمالیات کے خوبصورت پیکر نظروں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبوں کی سچائی اور بیان کی ندرت حسنِ شعری میں بے حد اضافہ کر دیتی ہے۔ ان کا یہ شعری مجموعہ اسم با مسمّیٰ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کہیں مظاہر فطرت کی عکاسی ہے تو کہیں داخلی اور خارجی کیفیات کی منظر کشی ہے۔ کہیں مذہب اور معاشرے کے حالات پر تبصرہ ہے تو کہیں گل وبلبل کا تذکرہ ہے۔ گویا حرمت قلم کے امین بن کر انہوں نے دید سے دیدہ ورتک کسی سے منافقت نہیں کی اور پوری جمالیاتی سچائی کے ساتھ۔ فکر ونظر کے ادراک وآگہی کو ''جستجوئے جمال'' کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ کام کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہے اور کسی ایسے ہی موقع کے لیے جگر مرآبادی نے کہا ہے کہ ۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

خود اپنے بارے میں آدم چغتائی لکھتے ہیں۔

''میری فطرت میں رنگِ تغزل رچا بسا ہے۔ میں چغتائی خانوادے سے تعلق رکھتا ہوں۔ آرٹ میرے خاندان کا پیشہ ہے۔ میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں۔ جو غزل کے گیسو اپنے مشاہدے اور فکر سے سنوارتا ہے۔ زندگی کے مشاہدے نے جلال و جمال کا روپ دھارا اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا ماحاصل ''جستجوئے جمال'' آپ کے لیے حاضر ہے۔

میری دانست میں ''جستجوئے جمال'' کوئی عام شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں عشق حقیقی کی لذتوں سے سرشار ہو کر حمد باری تعالیٰ کچھ یوں بیان کی گئی ہے ۔

ہے کرن کرن میں تیری ضیاء، تیرا عرش بقعۂ نور ہے
تہہ خاک سے سرِ آسماں تیری شانِ کُن کا ظہور ہے

حسنِ مجاز کی بابت کہتے ہیں ۔

گلاب چہرہ، غزالی آنکھیں، بدن میں خوشبو رچی بسی سی
گلوں کے دل میں وہ کیا بسے ہے، ہر اک کلی ہے کھلی کھلی سی

انسانی رویوں سے دل برداشتہ ہوتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں ۔

پھول کو دل سے لگانے تتلیاں بھی آگئیں
تو بھی آجائے اب لبوں پر سسکیاں بھی آگئیں

''نوائے آدم'' میں تخلیق کے جس راز کو جاننے کی خواہش کی ''جستجوئے جمال'' تک پہنچتے پہنچتے زندگی کی سب سے بڑی سچائی کو ان الفاظ میں آشکارا کرتے ہیں ۔

دارِ فانی ہے یہ دنیا، آخری منزل ہے موت
پھر بھی انسانی تجسس، فکر سامانی میں ہے

گویا جو سوال ''نوائے آدم'' میں پوچھا اس کا جواب شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کی مانند۔ ''جستجوئے جمال'' میں خود ہی دے...... میں انھیں نہایت کامیاب تخلیقی کاوش پر دل مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ ''اللہ کرے زورقلم اور زیادہ''۔

(یہ مضمون برمنگھم میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ''جستجوئے جمال'' کی رسم اجراً کی تقریب کے لیے لکھا گیا)''

’’شیرازہ‘‘اور’’ٹھوکا‘‘......دو نئی تخلیقات

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برمنگھم شہر میں عرصہ دراز سے مقیم جاوید اختر چودھری ایک نہایت منجھے ہوئے قلمکار ہیں۔ ان کا پہلا اور شاید آخری شعری مجموعہ ’’حصارِ ذات‘‘ کے نام سے 1999ء میں منظر عام پر آیا جس کے بعد انہوں نے تمام تر توجہ نثر پر مبذول کر رکھی ہے۔ میرے خیال میں وہ اس مقالے پر عمل کر رہے ہیں کہ ’’تعلیم یافتہ معاشروں میں نثر زیادہ لکھی جاتی ہے‘‘۔ اب تک ان کی سات نثری تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے ’’اک فرصیت گناہ‘‘ اور حرفِ دعا تھے۔ جو کہ بالترتیب 2000ء اور 2004ء میں شائع ہوئے جس کے بعد انہوں نے کس بھروسے پر آشنائی کی‘‘۔ ناولٹ لکھا اور 2006ء میں ان کی ’’خودنوشت‘‘ ’’سوہاوہ‘‘ ’’میری بستی میرے لوگ‘‘ شائع ہوئی۔

حال ہی میں ان کی دو نثری کتب ’’شیرازہ‘‘ اور ٹھوکا‘‘ کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ دونوں کتب اکبری آرٹ پرنٹرز نے بڑے اہتمام سے کراچی سے شائع کی ہیں جبکہ دیدہ زیب سرورق برطانیہ میں مقیم نہایت ہونہار آرٹسٹ آویز احمد نے تیار کیے ہیں۔

ان کی اگلی نثری تخلیق ’’ہم صورت گر کچھ خوابوں کے‘‘ ان کی اہلیہ سلطانہ مہر کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین اور آراء کا مجموعہ ہے کہ طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔

’’شیرازہ‘‘ جاوید اختر کے لکھے ہوئے مضامین، مختلف علمی۔ ادبی اور سماجی شخصیات کے انٹرویوز اور نہایت دلچسپ اور فکر انگیز خطوط کا مجموعہ ہے اس طرح سے یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں شامل مضامین میں احمد ندیم قاسمی۔ امجد مرزا امجد۔

تابش خانزادہ۔ ڈاکٹر خالد سہیل۔ ساحر شیوی۔ سلطانہ مہر۔ ش۔ صغیر ادیب۔ سیدہ شہناز بانو، ڈاکٹر صفات علوی۔ پروفیسر عبدالواحد قریشی۔ سید عطا جالندھری۔ قیصر تمکین۔ پروفیسر طاہرہ اقبال۔ خواجہ آصف۔ اقبال بھٹی۔ فاروق نسیم۔ پروفیسر مظفر حنفی۔ مقصود الٰہی شیخ۔ فرخندہ رضوی۔ فیصل نواز چودھری اور وسیم بٹ وسیم کی تخلیقات اور فکر و فن پر نہایت پُر مغز گفتگو کی گئی ہے۔

آخری حصہ وقتاً فوقتاً لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ جن میں بخش لائل پوری (در جواب آں غزل) افتخار نسیم (تم تو خود سانحہ در سانحہ ہو) پروفیسر شوکت واسطی (مجموعہ اضداد) پروفیسر مشکور حسین یاد (خودستائش انٹرویو) صحافی عبدالقادر حسن (فوج شاعری کرتی ہے) اور ’’اردو اخبار اسلام آباد‘‘ کے ایڈیٹر قیصر حمید کو لکھے گئے نہایت کاٹ دار خطوط جو مصنف کی فکری گہرائی اور عمیق مشاہدے پر دلالت کرتے ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی دوسری تخلیق ’’ٹھوکا‘‘ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا نام ان کے ایک افسانے ’’ٹھوکا‘‘ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ جو دراصل ہمارے معاشرتی کھوکھلے پن کی کہانی ہے جسے مصنف نے نہایت کامیابی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند لکھتے ہیں کہ جاوید ان افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں مرکزی کردار کی سالمیت اور پلاٹ کے بہاؤ میں منطقی تسلسل اور توازن کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دیکھ بھال زندگی سے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے افسانے مثلاً ٹھوکا، ایک عمر کی اجرت، وہ حشر بلاخیز، لیٹر کے بازار میں اور باشرط گذشتہ دس برسوں کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔‘‘

کتاب کے پیش لفظ جاوید اختر چودھری، ڈاکٹر صفات علوی اور سلطانہ مہر کے تحریر کردہ ہیں۔ کتاب میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں سے کچھ برطانیہ اور ہندو پاک کے

معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہوکر اہل نقد ونظر سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں کہ ”تمام افسانے اپنے موضوعات کے لحاظ سے حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور گرد وپیش میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے مخصوص رواں، سلجھے ہوئے اور صاف اور منفرد اسلوب بیان سے ان افسانوں کے فنی حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔“

اس کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف کے فکر وفن کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں۔ مصنف کی اس نثری تخلیق پر آرا دینے والوں میں پروفیسر آفاق احمد۔ ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان۔ رضا علی عابدی۔ شاہدہ حسن۔ ڈاکٹر شمس جیلانی۔ خالد خواجہ۔ پروفیسر رشید مصباح۔ صفیہ صدیقی۔ انور خواجہ۔ کرامت اللہ غوری۔ محمود شام۔ مجتبیٰ حسن۔ مقصود الٰہی شیخ۔ پروفیسر نذیر تبسم اور ڈاکٹر معین قریشی جیسے معتبر اہل قلم کے نام شامل ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی مصنف کے فکر وفن کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں کہ ”جاوید اختر چودھری کا ذہنی وژن انسانی اقدار کے راستوں سے ہوکر گزرتا ہے۔ وہ زندگی کی گہما گہمی پر یقین رکھتے ہیں اس لیے قیصر تمکین ان کے افسانوں کو ”زندگی بردوش“ افسانے کہتے ہیں جو بالکل سچ ہے۔ زندگی سے تلخ وشیریں رشتہ کہیں ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ اور جاوید اختر چودھری کا تخلیقی سفر رکنا نہیں چاہیے۔ کہ ان میں صرف اچھی نہیں بلکہ بڑی کہانیوں کے کہنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔“

”چراغ بدست نجمہ عثمان“

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

مجھے نجمہ عثمان کی ”پیڑ سے بچھڑی شاخ“ کے بارے میں کچھ کہنے کا حکم ملا ہے اور یہ حکم میرے لیے اعزاز کا درجہ رکھتا ہے کہ میں نجمہ جیسی صاحب علم، صاحب ذوق، ماہر تعلیم اور شاخِ حنا اور کڑے موسموں کی دوپہر جیسے شعری مجموعوں کی خالق کی نثری کاوش پر بات کر رہی ہوں۔

گو کہ ”پیڑ سے بچھڑی شاخ“ نجمہ کی نثری کاوش ہے مگر نجمہ کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے میں شاعرہ اور نثر نگار نجمہ کو الگ نہیں کر پائی۔ کیونکہ نجمہ کے شعروں میں کہانیاں اور کہانیوں میں شعروں کی سی کیفیت موجود ہے۔

میرے نزدیک ”پیڑ سے بچھڑی شاخ“ محض ایک کتاب کا سرِ ورق ہی نہیں ہے۔ یہ 17 افسانوں اور 256 صفحات پر پھیلے ہوئے، گھٹتے بڑھتے دائروں، حرکات وسکنات اور نقاط کا کھیل نہیں ہے بلکہ ”پیڑ سے بچھڑی شاخ“ جیسا ٹائٹل بذات خود ایک مکمل کہانی ہے جو پیڑ اور شاخ کے تعلق سے کئی دنیاؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو سچائی کی ان گنت کڑوی، کسیلی داستانوں سے بھری ہوئی ہے اور پھر ہر داستان میں ایک اور داستان۔ داد کی حکائتیں ہیں تو دوریوں کی شکائتیں ہیں۔ ملال کے سائے ہیں تو وصال کی روشنی ہے۔ ملنے کی خوشی تو بچھڑنے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ قربتوں کی آسودگیاں ہیں تو دوریوں کے عذاب ہیں۔ لمحوں کا قرب ہے تو صدیوں کے فاصلے ہیں۔ رسائی کی خوشی تو نارسائی کا ماتم۔ گویا یہ ایک اتہاس ہے۔ ایک تاریخ ہے۔ ایک

تہذیب ہے۔ایک خودنوشت ہے۔جو آنکھوں میں آنسو لیے۔کرب و بلا کی اذیتیں سہتے
ہوئے۔شامِ غریباں کے اس منظر نامے میں کہہ رہی ہو۔

تھکن اُتار کر رکھ دی ہوا کے رستے میں
اُڑا دی گرد میں منزل سفر سمٹ لیا
خیال و خواب کی دنیا کو پاش پاش کیا
وجود اپنا بکھیرا تو گھر سمیٹ لیا

''پیڑ سے بچھڑی شاخ'' ایک ایسی تکون ہے۔جس میں لکھنے والی عورت ہے۔کہانی
عورت کی ہے۔اور کتاب کا انتساب بھی عورت ہی کے نام ہے۔گویا یہ صرف نجمہ کی ہی
نہیں میری۔آپ کی۔ہم سب کی کہانی ہے کیونکہ ہم کسی نہ کسی حوالے سے عورت سے
جڑے ہوتے ہیں۔یہ ہجرتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان ہے۔کہیں میکہ چھوٹنے کا غم
تو کہیں اپنی مٹی سے ہجرت کی مجبوریاں۔اور پھر اپنے آشیانے سے ان پرندوں کا ہجرت کا
دُکھ جنہیں کہیں خود اپنے ہاتھوں سے اڑنا سکھایا تھا۔گویا یہ زندگی نہ ہوئی ایک لامتناہی
ہجرت ہوگئی۔اس کتاب کا آغاز بھی تنہائی ہے۔اس کا انجام بھی تنہائی یہ ہوا ہے اور یہ اس
کتاب کا پریچہ ہے۔یہی اس کا تعارف ہے۔اس تنہائی کا اعتراف مصنفہ نے کتاب کے
پیش لفظ میں ان الفاظ میں کیا ہے۔''میرا بچپن جتنا لاابالی اور حسین تھا۔اُس سے کہیں زیادہ
تنہا تھا۔میں تین بھائیوں کی اکلوتی اور بڑی بہن ہونے کے ناطے نہ تو ان کی آپا ہی بن پائی
اور نہ ہی لاڈلی بہن۔''

آگے چل کر لکھتی ہیں کہ میں نے اپنی گڑیوں سے دوستی کر لی۔ان سے گھنٹوں باتیں
کرتی۔مجھے انسانوں سے زیادہ گڑیاں اچھی لگیں۔ان کے دکھ درد اور خوشیاں اپنی سی لگیں۔
ان گڑیوں نے میرے اندر کے جیتے جاگتے کہانی کار کو ڈھونڈ نکالا۔گڑیوں کا کھیل ختم ہوا تو
زندگی اپنی تمام تر کڑوی کسیلی، نوکیلی، رسیلی نت نئی حقیقتوں کے ساتھ ایک نہ سمجھنے والی پہیلی بن
کر یوں سامنے آئی کہ میں اس میں الجھ کر رہ گئی۔بے جان گڑیوں کے قصے تو میں جوڑ توڑ

کے کسی خوشگوار انجام تک لا کر ختم کر دیتی تھی مگر زندگی کی کہانیاں، اتنی گنجلک ہیں کہ
ڈھونڈنے سے بھی ان کا سرا ہاتھ نہیں ملتا۔پھر ہر ایک موڑ پر ایک چونکا دینے والا انکشاف۔
ایک بے رحم سچائی، کہیں ضمیر صدا دیتا ہے تو کہیں سچ منہ چھپا لیتا ہے اور جھوٹ کا بول بالا ہوتا
ہے۔

نجمہ کا یہ اعتراف گویا انسانی زندگی اور انسانی رشتوں کے بارے میں ایک مشن
سٹیٹمنٹ ہے۔ان کی سبھی تحریریں، سبھی افسانے، سبھی زاویہ نگاہ، اسی آگہی، اسی وجدان کی
ایکسٹینشن (Extention) ہیں۔

دراصل ہمارا المیہ یہ ہے کہ انسانوں کی بجائے ہم مادی چیزوں سے پیار کرنے لگے
ہیں مگر انسان محبت کرنے کے لیے اور چیزیں استعمال کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ہماری
اس دنیا میں یہ انتشار، یہ سراسیمگی، یہ کنفیوژن، انسانوں کی ناقدری اور گھروں کی ٹوٹ
پھوٹ صرف اسی وجہ سے ہے کہ ہم انسانوں کو استعمال کرتے ہیں اور چیزوں سے پیار
کرتے ہیں مگر جب تک ہم ہر چیز کو جو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھیں گے تو نفرتیں اور
دوریاں بڑھتی رہیں گی اور نفرتوں سے صرف دل ٹوٹتے ہیں اور جب ایک دل ٹوٹے تو ایک
گھر ٹوٹ جاتا ہے۔گھروں کے ٹوٹنے سے خاندان ٹوٹتے ہیں۔خاندان ٹوٹیں تو محلے اجڑ
جاتے ہیں۔محلے اجڑیں تو شہر اجڑ جاتے ہیں اور شہر ٹوٹیں تو ملک ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹنے
بکھرنے کا یہ سلسلہ کہیں ختم ہونے میں نہیں آتا۔

ہم نجمہ کے افسانوں کو کوئی بھی عنوان دے دیں، کسی بھی نام سے پکاریں۔ان کے
کردار وہی ہیں جو شب و روز ہمارے گرد و پیش میں موجود ہوتے ہیں۔صرف چہرے
بدلتے ہیں۔نام بدلتے ہیں مگر سرشت نہیں بدلتی۔انسانی فطرت، انسانی رویے اپنی جگہ
موجود رہتے ہیں۔چاہے وہ ''کلاسی فی کیشن'' کے عامر اور فرح کی طبیعتوں کا تضاد ہو۔
''سیتا کا بن باس'' کی تنہائی زدہ رابعہ ہو یا ''رشتوں کی دہلیز'' پہ خود آزادی کی کیفیت۔یا پھر
''مانگی ہوئی عورت'' کی نمو باجی جسے ہر کوئی اپنی غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے یا پھر

برطانیہ میں پیدا ہونے والی ہماری نوجوان نسل کا عمران جو اپنے والدین کی طرح دوسور جوں کا مسافر بننے سے انکار کر دیتا ہے۔اور اسی مٹی سے (Sense of Belonging) پیدا کرنے کا متقاضی ہے۔ جہاں اس نے جنم لیا، جس ہوا میں اس نے اپنی پہلی سانس لی یا پھرنل بائی ماؤتھ (Nil by Mouth) کی شگفتہ اور ظریفانہ Interpretation جو یہ ثابت کرتی ہے نجمہ کے افسانے صرف حالات کا ماتم نہیں ہیں۔ آنسو اور سسکیاں ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں طنز کا نشتر بھی موجود ہے۔ظرافت کا وٹامن بھی ہے اور مزاح کا انیستھیسیا بھی ہے۔ گویا نجمہ حرمت قلم کی امین بن کر دید سے دیدہ ور تک کسی سے منافقت نہیں کرتیں کیونکہ ایک تخلیق کار کو جس مطالعے، مشاہدے، اسلوب اور اندازِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ نجمہ کے ہاں موجود ہے۔

دراصل نجمہ کی کہانیاں سمندر میں اٹھنے والی ان لہروں کی مانند ہیں جنہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ ان کے رستے میں کتنے پڑاؤ آئیں گے۔ کون جانے سمندری لہروں کی طرح کس کی کہانی۔ کہاں، کس سے جا ملے اور کہانی کے آغاز میں جیسا لگتا تھا اس کا انجام کچھ اور ہو جائے۔ اس کا انت سبھی کو حیران کر ڈالے۔ نجمہ کی کہانیاں بھی چلتے چلتے کئی موڑ مڑ جاتی ہیں۔ اور ہر موڑ پر ایک نیا منظر نامہ۔ ایک نیا حشر۔ ایک نئی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔ جو فکر و آگہی کے کئی در کھولتا چلا جاتا ہے۔ نامہربان ہواؤں کی سازشیں جو ایک نرم و نازک شاخ کو پیڑ سے جدا کر چکی ہیں مگر اس ٹوٹی ہوئی شاخ کا حوصلہ دیکھو جو ان ہواؤں کی سازشوں کو ناکام بناتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ ''میں رشتوں کے اس جنگل میں تنہا ضرور ہوں ......جذبوں کی توڑ پھوڑ سے بکھر ضرور گئی ہوں مگر ٹوٹی نہیں۔''

کہتے ہیں کہ جس معاشرے میں عورت کی تخلیقی گواہی کو رد کرنے کی روایت جڑ پکڑ لے وہ معاشرہ تہذیبی، ثقافتی اور سماجی سطح پر بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے اور ایک عورت بانجھ پن سے کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خود ایک تخلیق کار ہے۔ اس کے نسائی شعور کو جب جب دبایا جاتا ہے تو نجمہ جیسی نثر نگار جو ایک جمالیاتی ذوق رکھنے والی شاعرہ بھی ہے کہہ اٹھتی ہے

کہ ۔

میں ایک عمر سے ہوں اس طرح چراغ بدست
کہ انگلیاں بھی جلالی ہیں روشنی کے لیے

مگر جب روشنی ملتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ۔

روشنی میں ہوا کی ہے تاثیر
لوگ بجھنے لگے اجالوں میں

(یہ مضمون نجمہ عثمان کے افسانوں کے مجموعے ''پیڑ سے بچھڑی شاخ'' کی برمنگھم (برطانیہ) میں جہان اردو کے زیر اہتمام رسم اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا۔)

قیصر تمکین......اردو افسانے کی درخشاں علامت

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

قیصر تمکین بلاشبہ صفِ اوّل کے قلم کار تھے۔ برطانیہ کے علاوہ ہندوپاک سے شائع ہونے والے معتبر ادبی رسائل وجرائد ان کی تحریروں کے منتظر رہتے اوران کی تحریروں کو شائع کرنا اپنے لیے کسی اعزاز سے کم خیال نہیں کرتے تھے۔ قیصر تمکین نے لکھنؤ کے ایک علمی اور ادبی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ وسیع المطالعہ شخص تھے۔ برطانیہ میں تقریباً چالیس برس قیام کے دوران کافی عرصہ انگریزی ادب اور صحافت سے بھی وابستہ رہے مگران سب چیزوں کو کبھی وجہ شہرت نہ گردانا بلکہ عام زندگی میں نہایت کسرِ نفسی سے کام لیتے تھے مگر اپنی گفتگو اور تحریروں میں ان کی ذہانت، مطالعہ اور علم وآگہی کے جوہر کھلتے رہتے تھے۔ دھان پان سی شخصیت، متانت اور سنجیدگی کا پہلو لیے ہوئے، لباس کا صاف ستھرا ذوق، طبیعت میں قدرے شگفتگی جو ان کی حس مزاح پر دلالت کرتی تھی۔ ان سے ملنے جلنے والے جلد ہی ان کی شخصیت کی ان خوبیوں سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ قیصر تمکین سے میری ملاقات تو صرف چند مرتبہ ہی ہوئی مگر ان کی تحریریں پڑھتے پڑھتے میں اصل قیصر تمکین سے بہت حد تک آگاہ ہو چکی تھی۔

پھر ان کی بیگم صبیحہ علوی سے مسلسل رابطہ رہتا اور کسی نہ کسی انداز میں قیصر صاحب کا ذکر ہماری گفتگو میں در آتا۔ ایک مرتبہ برمنگھم میں ان کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوا اور ان کی لائبریری جو کہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھی دیکھنے کا موقعہ ملا بلاشبہ ان کی لائبریری ان جیسے صاحب علم و دانش اور ژرف نگاہی رکھنے والی شخصیت کی غماز تھی۔

قیصر تمکین کی رحلت کے بعد بھی ان کی بیگم صبیحہ علوی سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ صبیحہ خود بھی ایک اچھی کہانی کار اور خوش گفتار خاتون ہیں جب بھی فون کرتی ہیں پوچھتی ہیں آپ کے گلاب کا کیا حال ہے؟ وہ مجھے گلابوں والی میرے پہلے شعری مجموعہ کلام ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کی مناسبت سے کہتی ہیں اور میرے میاں اسماعیل اعظم کو گلاب!

برمنگھم میں تین شخصیات ایسی تھیں کہ جن کے ساتھ میری شدید خواہش تھی کہ ایک اچھے ادبی پروگرام کا اہتمام کیا جائے تا کہ ان کی ادبی خدمات کو ان کی زندگی میں ہی خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔ جن میں محمود ہاشمی، سلطانہ مہر اور قیصر تمکین شامل تھے۔

سلطانہ مہر کے ساتھ ایک خوبصورت شام منانے اور ان کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موقعہ ''آگہی'' کے پلیٹ فارم سے چند سال پیشتر میسر آ گیا تھا۔

محمود ہاشمی مرحوم سے عرصہ دراز تک عقیدت واحترام کا رشتہ رہا۔ ان سے کئی مرتبہ اس خواہش کا اظہار کیا مگر وہ ٹالتے ہی رہے کہ ناسازئ طبع کے باعث وہ بہت زیادہ دیر تک بیٹھنے سے معذور تھے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ آخری ایام میں کافی عرصہ سے انہوں نے کسی قسم کی تقریب میں شرکت کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ میرے بہت اصرار پر ایک مرتبہ ہماری ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کے زیر اہتمام شاہدہ احمد کے ڈرامہ ''دستک'' کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے۔

یہ ڈرامہ ایشیائی لڑکیوں میں جسمانی معذوری کے موضوع پر تھا۔ چونکہ شاہدہ احمد بھی خود اس المیے کا شکار تھیں اس لیے ڈرامہ ایک حقیقت کا روپ اختیار کر گیا جسے دیکھنے والے تھیٹر سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکلے۔

ہاشمی صاحب کہنے لگے کہ ''ڈرامہ اس قدر دلچسپ اور ایسے حساس موضوع پر تھا کہ میں نے بیٹھ کر سارا ڈرامہ دیکھا، اور دل میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں آج ڈرامہ دیکھتے ہوئے مر بھی جاؤں تو شہید کہلاؤں گا۔''

محمود ہاشمی مرحوم کے ساتھ ان کی زندگی میں تو کوئی پروگرام نہ ہو سکا مگر بعد از مرگ پچھلے سال ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا جس میں سبھی دوست احباب نے شرکت کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

قیصر تمکین کے ساتھ ایک ادبی شام منانے کا پروگرام کبھی پورا نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ بوجوہ برمنگھم سے لیڈز چلے گئے جہاں ان کی طبیعت بے حد ناساز ہوگئی تھی اس لیے کسی قسم کی تقریب میں ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس دیرینہ خواہش کے پیشِ نظر جب میں نے پرواز کی مجلس مشاورت میں شمولیت اختیار کی تو قیصر تمکین صاحب کا گوشہ شائع کرنے کی خواہش کا اظہار محترم ساحر شیوی اور ان کی بیگم صبیحہ علوی سے بھی کیا جسے انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا اور آج یہ گوشہ آپ سب کے سامنے ہے جس کی بے حد خوشی ہے کیونکہ یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنے پیش روؤں کو یاد رکھیں اور اپنے اپنے حصے کا قرض ادا کریں۔

مجھے ان کی بہت سی تصانیف جن میں یروشلم۔ یروشلم۔ نارسیدہ، ایک لفظ ایک حکایت، خدا خدا۔ صنم صنم، ایک کہانی گنگا جمنی پست نوشت، شعر و نظر، اے دانش حاضر، تنقید کی موت، صدی کے موڑ پر اور افسانوں کے مجموعے سوا تیکا میں سے صرف چند تخلیقات کو پڑھنے کا موقع ملا مگر ان سب میں ایک اعلیٰ پائے کا کہانی کار سطر سطر میں موجود تھا۔ وہ بلاشبہ کہانی کہنے کے وصف سے آشنا تھے۔ ان کی تحریریں ہم ایسے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ اردو ادب اور زبان کے معاملے میں ایک ''درس گاہ'' کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان کی کہانی شروع سے ہی قاری کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتی تھی۔ پھر کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اور کردار نگاری، جزئیات یعنی لفظوں میں تصویر کشی کرنا، مکالمہ اور آخر میں چونکا دینے والا انکشاف، ایک اچھے افسانے کے سبھی فنی لوازمات ان کی کہانی میں موجود ہوتے تھے۔

میں سمجھتی ہوں کہ قیصر تمکین صاحب کی کہانیاں ان کی شخصیت کی عکاس تھیں کیونکہ کہانی کی سطر سطر میں ایک صاحب مطالعہ حساس شخص، ان کا تجربہ، ان کا وجدان اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی ایک منطق، متانت، سنجیدگی اور ان سب کے درمیان تحریر میں

شگفتگی موجود ہوتی تھی۔ عام زندگی میں بھی وہ اسی انداز سے گفتگو کرتے اور اپنا مطمع نظر بڑے محتاط انداز میں نپے تلے لفظوں میں بیان کرتے تھے۔

بہت ممکن ہے کہ ایک عام قاری کو ان کی تحریروں کو سمجھنے اور سراہنے میں مشکل پیش آتی ہو مگر ایک قلم کار کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور تجرباتی سطح پر ہی اپنی تخلیقات کو پیش کرے کیونکہ زبان اور ادب کا ایک فریضہ قاری کے ادبی ذوق کی تربیت کرنا ہوتا ہے تا کہ ادیب نظریہ ضرورت کے تحت اپنی تحریروں کو اپنی ذہنی، علمی اور ادبی سطح سے کم تر درجے پر پیش نہ کرے، کیونکہ یہ بات ادب عالیہ کی تخلیق میں مانع ہو سکتا ہے۔

میں اس بات کو اس مثال سے واضح کروں گی کہ اردو ادب کی بلند پایہ ادیبہ قرۃ العین حیدر کو بھی ایک مشکل پسند قلمکار کہا گیا ہے مگر اس سے نہ تو ان کا علمی و ادبی مرتبہ کم ہوا اور نہ ہی انہوں نے اپنی تحریروں کے معیار کو گرنے دیا اور آج انہیں بلاشبہ صف اول کے قلمکاروں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وقت کیساتھ ساتھ تحریر کا جوہر سنجیدہ قاری پر کھلتا چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ادبی نقاد قلم کار کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

میرے خیال میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جنہیں لکھنے کی توفیق ملی انہوں نے لکھا۔ اب ان کی تحریروں کو سمجھنا سمجھانا پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ساتھ آئندہ نسلوں کا کام ہے۔ وہ تو اپنے حصے کا کام کر گئے۔

میں نے ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے غور کیا کہ انہوں نے کسی سے دیباچہ وغیرہ لکھوانے کا اہتمام نہیں کیا تھا اور یہی چیزیں ''اداس نسلیں'' کے مصنف اور آدم جی ایوارڈ یافتہ ادیب عبداللہ حسین کی تصانیف پڑھتے ہوئے نوٹ کی۔ ان کی صرف ایک تصنیف ''نشیب'' میں پیش لفظ کے طور پر انہوں نے کچھ لکھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

''روس کی ایک مشہور رقاصہ نے ایک دفعہ کوئی ناچ پیش کیا تو کسی نے اس سے پوچھا ''کیا آپ اس ناچ کا مطلب ہمیں بتا سکتی ہیں؟'' اس پر رقاصہ نے جواب دیا ''اگر میں بتا سکتی تو ناچنے کی تکلیف کیوں کرتی؟''

کسی نے کہا ہے کہ کہانیاں لکھنا دنیا کا ایک اہم کام ہے اس لیے کہ ان میں وہ باتیں تو ہوتی ہی ہیں جو بیان کی جاسکتی ہیں۔اس کے علاوہ وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں۔

اس کتاب کے ناشر نے اصرار کیا کہ میں مجموعے کے شروع میں ''چند لفظ'' لکھ دوں کیونکہ ''اس سے ادیب اور قاری میں رابطہ رہتا ہے''۔''سوال یہ ہے کہ کیا کہانیاں لکھنے سے رابطہ قائم نہیں ہوتا؟''

''میرے خیال میں میرے کچھ کہنے یا نہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل کسی کے بھی کچھ کہنے نہ کہنے سے فرق نہیں پڑتا۔اس لیے کہ اگر یہ کہانیاں اچھی ہیں تو دس بیس سال کے بعد بھی، جب کہنے کہلانے والے رخصت ہوجائیں گے، یہ پڑھی جاتی رہیں گی اور اگر اچھی نہیں تو کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔ یہ دیکھتے دیکھتے نظر سے غائب ہوجائیں گی اور کوئی ان کا نام نہ لے گا۔ان باتوں سے کسی اور کاروبار میں ہوسکتا ہے فرق پڑتا ہو، ادب کے معاملے میں نہیں پڑتا۔اگر اسی بات کی سمجھ قارئین کو آجائے تو میں سمجھوں گا کافی رابطہ ہوگیا۔''

میرے خیال میں قیصر تمکین جیسے ذہین قلمکار بھی کچھ انہی خیالات کے تحت دیباچہ لکھنے لکھانے سے گریزاں تھے۔بقول اقبال ؎

میری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معانی کی

قیصر تمکین کی تحریروں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق ہورہی ہے اور امید ہے کہ آنے والے وقت میں ان کی تحریریں حسن معانی کی نئی دنیائیں آشکارا کریں گی اور اردو ادب کا ہر سنجیدہ قاری انہیں ہمیشہ یاد رکھے گا۔

جب بھی برطانیہ میں اور اس سے باہر اردو ادب و افسانے کی تاریخ مرتب ہوگی تو قیصر تمکین کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا یقیناً نظر آئے گا کیونکہ وہ اردو افسانے کی ایک درخشاں علامت بن چکے ہیں۔

درد کی نیلی رگیں......ایک عورت کی نظر میں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

''درد کی نیلی رگیں''......فرزانہ خان تخلص نیناں کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو کچھ عرصہ پہلے انہوں نے نہایت خلوص و احترام سے میری نذر کیا۔ سرورق دیکھتے ہی میں چونک سی گئی۔ ملٹی کلرز کے اس دور میں بلیک اینڈ وائٹ زمین پر نیلے حروف کی شکل میں اپنی جانب متوجہ کرتی ہوئی......''درد کی نیلی رگیں''......ایک لمحے ہی میں مجھ سے بہت کچھ کہہ گئیں۔

لگتا تھا کہ درد کی بات بہت دور تک جانکلی ہے۔ چوٹ اتنی گہری ہے کہ فرزانہ خاں نے زخموں کو آنسوؤں کے پانی سے دھوکر، ان زخمی یادوں پر قلم سے مرہم لگا کر، کاغذ کی پٹیوں میں لپیٹ کر ایک دیوان کی شکل دی ہے جس میں نہ صرف شاعرہ کی ذات وحیات کا بھرپور مشاہدہ ہے بلکہ قارئین اپنے درد کے سلسلوں کو بھی اس سے جوڑ سکتے ہیں۔

میری سترہ سالہ بیٹی انگریزی میں شاعری کرتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ قلمکار ''شہید'' ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دکھوں کو دوسروں کے ساتھ بانٹتے ہوئے ایک عظیم قربانی دیتے ہیں۔اپنا آپ دوسروں پر ظاہر کرنا، اپنے دکھ، اپنے درد، اپنی تکالیف، اپنی اذیتوں اور کرچی کرچی لمحوں کو دوسروں کے سپرد کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے فرزانہ کی شاعری کو اسی روپ میں دیکھا جہاں وہ ہنستے ہنستے سوئے دار چلی جارہی ہے، اس لیے میں فرزانہ کی کتاب ''عورت اور درد'' کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کروں گی کیونکہ ان کی شاعری کے رموز واوقاف، اوزان وبحور اور تشبیہات واستعارات پر نہایت ممتاز شعراء جن میں جناب

شوکت واسطی، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور محسن احسان شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ان کی رائے محفوظ ہے۔ جس میں انہوں نے بڑی صراحت سے آنچل، گھونگھٹ، موتی، مونگے، گوٹا پیک، چوڑیاں، بندے، جھمکے، چھلّے، مسّی، افشاں، مہندی، سرمہ، کاجل، اُبٹن، غازہ، مینڈھی، موباف، کاکل، گیسو اور سیاہ زلف دراز کے حوالے سے فرزانہ خان کی شاعری کو نسائیت سے بھرپور شاعری قرار دیا ہے۔

مگر فرزانہ کی کتاب کے پہلے شعر سے لے کر۔ ؎

شوخ نظر کی چٹکی نے نقصان کیا
ہاتھوں سے چائے کے برتن چھوٹے تھے

ان کی کتاب کی آخری نظم ''ماں'' میں جس زبان، جس درد، جس تکلیف، محرومی کا بلکتا ہوا احساس ہے۔ میں اس سے نظر چرا کر نہیں گزر سکی جس میں فرزانہ کہہ رہی ہیں۔

بڑا محروم موسم ہے تمہاری یاد کا اے ماں
نجانے کس نگر کو چھوڑ کر چل دی ہو مجھ کو ماں
شفق چہروں میں اکثر ڈھونڈتی رہتی ہوں میں تم کو
کسی کا ہاتھ سر پر ہو تو لگتا ہے تم آئی ہو
کوئی تو ہو، جو پوچھے کیوں تیرے اندر اداسی ہے
میرے دل کے گروندے کی صحراحی کتنی پیاسی ہے

آخری بند میں کہتی ہیں ؎

کوئی موہوم سا بھی سلسلہ، باقی کہاں باہم
کہ اب برس میرے نیناں تمہاری دید کو چھم چھم
دلاؤں ایک ٹوٹے دل سے چاہت کا یقین کیسے

کئی پرانے درد جاگ اٹھے ہوں گے۔ بہت سی محرومیاں آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوگئی ہوں گی، بہت سی تہمتوں نے دل شکن رویوں نے اداس کیا ہوگا تو اس راہ پر خار سے

گزرتے ہوئے فرزانہ کہہ اٹھتی ہے ؎

میں نے تو کوئی بات کسی سے کہی نہیں
سوچا ہے جو وہی ہے فسانہ بنا ہوا
عورت کا ذہن مرد کی اس کائنات میں
اب تک ہے الجھنوں کا نشانہ بنا ہوا

یقین و بے یقینی کی کیفیت میں کہتی ہیں ؎

روز دیکھا ہے شفق سے وہ پگھلتا سونا
روز سوچا ہے کہ تم میرے ہو میرے ہو نا
کان میں پہن لی ہے تمہاری آواز
اب میرے واسطے بیکار ہیں چاندی سونا

ایک ماں بن کر سوچتی ہیں تو ؎

تخلیق کا عمل اُسے سچی خوشی لگا
عورت کو کرب ذات نئی زندگی لگا
لگتا ہے مجھ کو میں کسی مردہ بدن میں تھی
جینے کا حوصلہ جو ملا اجنبی لگا

اُداس لمحوں میں کہتی ہیں ؎

میں نس نس میں ٹکراتی ہوں خواہشوں سے
میں گرتا ہوا ایک خالی مکاں ہوں
ہواؤں میں اُڑتی ہوئی ریت ہے وہ
میں بکھری ہوئی پھول کی پتیاں ہوں

سامعین!

یوں تو اردو شاعری مقبول صنف غزل کا مطلب بھی عورت سے مخاطب ہونے، اس کے حسن و دلکشی، وفا و جفا، یا ادا و ناز کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنا ہے۔ اور عرصہ دراز تک شاعرات بھی اس اسلوب میں لکھتی رہیں۔ گویا عورت کی نفسیات، اس کی سائیکی، ذہنی خوبصورتی، فکری بالیدگی کی تصویر کشی کا کوئی خاص تصور اُردو شاعری میں کم بلکہ ناپید تھا۔ صرف عورت کا جسم اور جسمانی ربط و جذبات کا ملاپ۔ دوری اور نارسائی اور ہجر و فراق کی ترجمانی ہی شاعری کا مقصد اولین تھی۔ مگر ادا جعفری، زہرہ نگاہ، پروین فنا سید، سارہ شگفتہ، کشور نائید، فہمیدہ ریاض، عذرا ریاض اور پروین شاکر جیسی شاعرات جب شاعری کے میدان میں اتریں تو عورت کے حقیقی محسوسات کو اظہار کا نیا افق نصیب ہوا۔

میں فرزانہ خان کو ان کی تخلیقی کاوشوں پر مبارکباد دیتے ہوئے یقین دلاتی ہوں کہ درد کے اس سفر میں وہ اکیلی نہیں ہیں بات اپنے اس شعر پر ختم کرتی ہیں۔

میری ماں آسمان سے تجھے لاؤں یہاں کیسے
نجانے کونسی دنیا میں جا کے بس گئی ہو ماں
بڑا محروم موسم ہے تمہاری یاد کا......اے ماں

تو اصل شاعرہ کتاب کے پہلے شعر سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ اس سفر میں کئی مناظر آتے ہیں۔ کئی تصویریں بنتی ہیں، بگڑتی ہیں، مسکراہٹیں ہیں، شوخیاں ہیں، آنسو ہیں، آہیں ہیں گویا زندگی کے اس طویل سفر کے آخر میں تھکی تھکی سی، اداس شاعرہ ماں کی گود میں سر رکھنے کو بے قرار ہے۔

یہی دُکھ، یہی تکلیف، یہی اُداسی، یہی احساسِ محرومی، یہی احساس زیاں، نسائی شاعری کی روح ہے۔ یہی کرب ذات، یہی آگہی، عورت کو عورت بناتی ہے جس کے بارے میں پروین شاکر نے لکھا ہے کہ

آشوب آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پر آج تک نہیں اترا۔ مجھے چاند کی تمنا

کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا۔ شہر ذات......کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں......'' فرزانہ خان نے بھی اپنی کشتیاں جلا دی ہیں۔

جہاں فرزانہ نے بہت کچھ کہا ہے۔ بہت کچھ ان کہا رہنے دیا ہے۔ قلم ہاتھ میں پکڑ کر سوچتے ہوئے خیالوں کے کارواں نے کئی موڑ مڑے ہوں گے۔ کئی لفظ لکھے ہوں گے کئی لفظ لکھ کر کاٹ دیئے ہوں گے بہت سوچا ہوگا......آنکھوں کی دیواریں بھیگی ہوں گی۔ لبوں پہ مسکان آئی ہوگی۔

''سوزِ کلیم'' ایک حرفِ دعا اور سوزِ دروں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

یوں تو لطیف راز صاحب کی تحریر اکثر و بیشتر مضامین، خطوط اور آرا کی صورت میں مختلف رسائل اور جرائد میں عرصہ دراز سے پڑھنے کو مل رہی تھیں مگر ان سے اصل تعارف ان کے ایک مضمون بعنوان ''پوپ کہانی کی کہانی'' کے توسط سے ہوا جو ماہنامہ ساحل، لندن کے جنوری 2015ء کے شمارے میں۔ میرے لکھے گئے مضمون ''پوپ کہانی کا تاریخی پس منظر'' جو کہ ماہنامہ ساحل کے ستمبر/اکتوبر 2014ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جواب میں لکھا گیا تھا۔ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے جو تبصرہ کیا ہے وہ اچھا لگا کیونکہ ان کا پوائنٹ آف ویو بہت متوازن تھا اور ایک اچھی تحریر کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ بغیر کسی تعصب یا دوستی کا لحاظ رکھے ایک سچی رائے دے۔ انہوں نے یہ مضمون مجھ سے کسی رابطے کے بغیر ہی لکھا تھا اور یہ بات مجھے اور بھی اچھی لگی اور اس مضمون کے بعد ہی میں نے ان سے فون پر رابطہ کر کے اس موضوع پر طویل گفتگو کی اور ان کے بارے میں مزید جاننے کا موقعہ ملا کہ وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ معاصر ادب پر ان کی گہری نظر ہے اور حالات حاضرہ سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ صاحب فکر و نظر ہیں اور سوز و مستی کے سرور میں ڈوبے ہوئے ایک دردمند انسان ہیں۔

انہوں نے نہایت شفقت سے مجھے اپنی شعری تصنیف ''سوز کلیم'' عنایت فرمائی اس شعر کے ساتھ کہ ؎

سوز کلیم دیتی ہے تسلیم آگہی پر
پوشیدہ اس میں درس ہیں رازِ حیات کے

یہ پڑھ کر بھی اچھا لگا کہ ''سوز کلیم'' کی فروخت سے ہونے والی تمام آمدنی وہ ''فاؤنڈیشن ایجوکیشنل ٹرسٹ کی نذر کر دیتے ہیں۔ جو کہ ان کی علم و آگہی اور انسان دوستی سے محبت کا بین ثبوت ہے۔

ان کے شعری مجموعے ''سوز کلیم'' کا انتخاب بھی کافی فکر انگیز اور نوجوان نسل سے وابستہ مستقبل کے سنہری خوابوں کا مظہر تھا۔ لکھتے ہیں کہ: ''نوجوانوں کے اندر سوئی ہوئی اس غیرت کے نام۔ جس سے ملک و ملت کے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں''۔

''سوز کلیم'' کا جیسے جیسے مطالعہ کرتی گئی تو کئی دلچسپ پہلو ان کی ذات اور شاعری کے بارے میں آشکارا ہوتے گئے۔

''سوز کلیم'' کی اشاعتِ اول دسمبر 1964ء میں ہوئی اور دوسری اشاعت نومبر 2011ء میں وقوع پذیر ہوئی۔ گویا تقریباً 47 برسوں کا ایک طویل فاصلہ درمیان تھا۔

یہ مجموعہ کلام پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں حمد و نعت کے علاوہ شیدائے ختم نبوت اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے انداز میں بڑی محبت اور مان سے حمد و ثنا کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کے حضور میں شکوہ بھی کر رہے ہیں اور مستقبل کا خوف بھی دامن گیر تھا کہ اگر مسلمان نوجوانوں کے فکر و تدبر کر کے عمل کی راہیں اختیار نہ کیں تو آنے والا کل کیسا ہوگا؟ چند حمدیہ اشعار۔ ملاحظہ ہوں ؎

جنت کی تمنا ہے، نہ دوزخ سے ہے خطرہ
بس خدمت مزدور کی ہے مجھ کو تمنا

******

انسان ہوں اور درد کا احساس بہت ہے
یہ دولتِ احساس میرے پاس بہت ہے

******

یہ تنکے بھی طوفاں کے مقابل کبھی نکلیں
ہو تیری عنایت کہ تیرا ہات بہت ہے

******

گستاخ نہ ہو جاتے کہیں خامۂ گریاں
خاموش ہی ہو جاؤں مناجات بہت ہے

******

بارگاہ رسالت میں یوں شرفِ باریابی حاصل کرتے ہیں۔

بصیرت بھی ہوئی ہے باوضو رہنے کی اب قائل
کہ اسؐ کی راہ میں رہتی ہے محوِ، انتظار اب تک

******

تجھیؐ سے آرزو میری کہ میری لاج رکھیے گا
غریب و بے سہاروں کے بھی سر پر تاج رکھیے گا

******

میری کمزور کشتی کو تو ہمت دے، کنارہ دے
اسے مولائے یثرب ، اپنی رحمت کا سہارا دے

******

شاعری میں لطیف راز صاحب کی سوچ، اور فکر و فلسفہ اور وجدان، سوز و مستی اور ژرف نگاہی کافی حد تک شاعرِ مشرق۔ حکیم الامت علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر نظر آتی ہے۔ ان کی ایک طویل نظم پیغام اقبال اس بات کی مظہر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری نظمیں۔ آرزو موجِ بحر۔ تیرا گلہ بجا سہی۔ رقیب، اعتراف حقیقت، ضمیر، تحریر اور مستقبل بھی فکر اقبال کی ہی غمازی کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب وطن سے بوئے الفت کی ہوا آتی نہیں
اس گلستاں کی بہاریں بھی مجھے بھاتی نہیں
کیوں دل زردار سے طرز جفا جاتی نہیں
امتِ احمدؐ کو کیوں خوئے وفا آتی نہیں ہے
(ماخوذ از پیغام اقبال)

گری ہوں بجلیاں جن پہ لٹا ہو کارواں جن کا
اسی منزل کا خواہاں ہوں، وہی ہو قافلہ میرا
گریباں چاک ہو، آنکھوں میں آنسو ہوں تشکر کے
یہی اک آرزو میری، یہی اک مدعا میرا
(ماخوذ از نظم آرزو)

کس قدر بیتاب ہے یہ مضطرب موج بحر
ہے دل مزدور، لیکن اس سے بھی بیتاب تر
اس متاع بے بہا کے خون سے آئے گا رنگ
تو اگر خوددار ہے، موتی کو گوہر بار کر
(ماخوذ از نظم موجِ بحر)

میرے بحر جنوں میں کونسا طوفان برپا ہے
طبیعت ان دنوں، آتش فشاں معلوم ہوتی ہے
مجھے بھی بخشنے والے نے کیسا درد بخشا ہے
چبھن سی کوئی سینے میں نہاں معلوم ہوتی ہے
یہ کیسا شور ہے صحن چمن سے کون گزرا ہے
کہ ہر کانٹے کے منہ میں، ایک زباں معلوم ہوتی ہے
(ماخوذ از نظم اعتراف حقیقت)

ان کے یہ اشعار پڑھتے ہوئے مجھے علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار بہت شدت سے یاد آئے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
پریشاں ہوں کہ میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

لطیف راز کا سوز دروں اور سینے کی کھٹک گرمیِ محفل بننے کو مچل رہا ہے۔ان کا حساس دل اور جذبوں کی تپش۔غم منزل بننے کو بے قرار ہے جس کے شواہد ان کے شعری مجموعے ''سوزِ کلیم'' میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

حصہ دوم میں نذرانۂ عقیدت ہے محبانِ حسینؑ کے نام
میر تقی میرؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، علامہ اقبال اور قائداعظم کے لیے۔علامہ اقبال کی مشہور زمانہ نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے اتباع میں انہوں نے اپنے والد مرحوم کی یاد میں ایک طویل نظم لکھی ہے۔ان کے والد کا انتقال ان کی عدم موجودگی میں 22 ستمبر 1963 کو ملتان میں ہوا۔

یہ ایک نہایت خوبصورت نظم ہے جو ان کی اپنے والد سے جذباتی وابستگی کی مظہر ہے اور پھر ان کے، بچھڑ جانے کا غم۔وطن سے دوری اور ان کے آخری دیدار سے محرومی کی حسرت جانکاہ نے ان کے دلِ مفطر کو جس غم سے آشنا کیا ہے اس کا مظہر درج ذیل اشعار ہیں۔

چھپ چلا سورج اندھیرا ہر طرف چھانے لگا
دل اندھیرے کے تصوّر سے ہی تھرانے لگا

گلستاں اجڑے تو آ جاتی ہے اس میں پھر بہار
نخل ہستی ٹوٹ کر پھلتا نہیں ہے زینہار
آسماں یہ سازشیں ہیں کیا ستانے کے لیے
میں جو ہوں پردیس میں یہ زخم کھانے کے لیے
تیری تربت پر خدائی نور برسایا کرے
اور شاہِ دو جہاںؐ کا حشر تک سایا رہے

لطیف راز کی یہ نظم پڑھ کر میں بے حد اُداس ہوگئی کیونکہ اس میں میرے جذبات و احساسات کے ساتھ بے حد مماثلت ہے اور مجھے اپنے والد مرحوم کی یاد نے آبدیدہ کر دیا۔جس محرومی کے احساس سے لطیف راز تڑپ رہے ہیں میں بھی اسی طرح کے احساس سے آشنا ہوں۔مگر محرومی والد مرحوم کے آخری دیدار سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس طویل دوری کے سبب سے ہے جب میرے والد نے اپنا وطن چھوڑا اور ہجرت کی صعوبتیں برداشت کر کے اس دیارِ غیر میں آ گئے تو میں اس وقت صرف دس برس کی تھی۔اپنے والد سے میری جذباتی وابستگی بہت زیادہ تھی۔جب میں بیس برس کی عمر میں برطانیہ آئی تو صرف ایک برس کے بعد ہی میرے والد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔احساسِ محرومی کے ساتھ ساتھ ایک احساسِ جرم بھی میرے غم میں شامل رہا کہ میں اپنی زندگی کا بہترین وقت۔اپنی تعلیمی مصروفیات، کامیابیاں، شب و روز، ذہنی اور جذباتی نشو و نما۔کچھ بھی تو اپنے والد سے Share نہ کر سکی۔وقت نے مہلت نہ دی کہ میں ان کے پاس بیٹھ کر بیتے دنوں کی یادیں ہی تازہ کر لیتی۔میں نے بھی ان کی موت پر 1975ء میں ایک نظم لکھی تھی۔''سورج کی موت''۔لطف راز نے بھی اپنی نظم کے پہلے شعر میں والد کو سورج ہی سے تشبیہ دی ہے۔سورج ایک زبردست استعارہ ہے زندگی کا۔روشنی کا، امید کا، تپش کا، جس کے نہ ہونے سے حیات نمو نہیں پا سکتی۔میری نثری نظم ''سورج کی موت'' میں چشمِ تصور سے میں نے جو منظر کشی کی ہے اپنے والد کی موت پر۔ملاحظہ کریں۔

سورج کی موت پر
اندھیرے پھوٹ پھوٹ کر روئے
کائنات کی ہر شے متوجہ ہوگئی
آسمان زمین کی خبر گیری کو لپکا
ہوائیں سہم کر کونے میں جا بیٹھیں
پرندوں کے پر پتھر کے ہو گئے
ماؤں کی کوکھ میں پڑے کچے پکے بچے
قبروں میں گناہ وثواب کا حساب دیتے
زندہ و مردہ جسم......
اندھیروں کو دلاسا دینے کو لپکے

فرشتوں نے ڈر کر
سورج کی روح کو
اور احتیاط سے ہاتھوں میں پکڑ لیا
روح اگر دوبارہ بے جان وجود میں
آسرا ڈھونڈنے لگے
تو موت کو موت آجاتی ہے......!

(خوشبو، گلاب، کانٹے صفحہ 356)

''سوزِ کلیم'' کا حصہ سوئم حسنِ کائنات کے مطالعے اور اس کے فلسفے سے متعلق ہے جو قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

حصہ چہارم زندگی کی ان حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے جو ہر وقت ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں ابلیس، سرمایہ دار کی صورت میں۔ اور وقت و حالات کی چکی میں پستا ہوا مزدوران

کی سوچ کے نمایاں پہلو ہیں۔

''سوزِ کلیم'' کا حصہ پنجم، ''آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں''۔ ایک طویل نظم بعنوان ''راز و نیاز'' کے علاوہ ''شکوہِ ابلیس'' اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کی نظم ''راز و نیاز'' پڑھتے ہوئے مجھے اپنی نظم ''راز و نیاز'' اور کئی دوہے یاد آ گئے جو انہی موضوعات پر ہیں جو لطیف راز نے اپنی نظم شکوہِ ابلیس میں اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سجدہ مشتِ خاک کو جو میں نہ کر سکا!
تو خوش تھا کہ بہانہ تیرے ہاتھ آ گیا

میرے چند دوہے ملاحظہ ہوں جو ابلیس کی بجائے ہی طرزِ فکر پر حضرت انسان کا شکوہ ہیں۔

آدم کو جنت سے نکالا کیسا تھا یہ ناٹک
حشر تلک اب اس جنت کا بندر رہے گا پھاٹک
جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی بھاگیں کتنی ڈھیلی کر دیں
تیری عبادت کریں فرشتے اور انہیں کیا کام
سارے کام تو ہم کو سونپے پھر بھی ہم بدنام
جنت اور جہنم کی چنتا ہے مجھ کو گھیرے
بند کرو یہ ناٹک سائیں، ہم بندے ہیں تیرے
ہم کو بلاؤ کعبے میں اور بھید نہ کوئی کھولو
موسیٰ جب بھی طور پر آئے، بڑے رسان سے بولو

(ماخوذ از خوشبو، گلاب، کانٹے صفحہ 526)

''سوزِ کلیم'' کا مطالعہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا تو یوں محسوس ہوا جیسے لطف راز میرے اس شعر کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

ہے سکونِ قلب لٹا ہوا ہے حیات غم میں پھنسی ہوئی
تیرے فیصلوں کی کمان میں میری جاں ہے کب سے کسی ہوئی

مگر ان کٹھن فیصلوں کے باوجود لطیف راز کا سوز دروں رب العزت سے استدعا کر رہا ہے۔

میرے دل میں کوئی محشر بپا کر
میرے مولا سکوں ناآشنا کر
بخش کر اپنی چاہت کی تمنا
مجھے اپنی محبت میں، فنا کر

یا پھر یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

جہانِ عشق کی کوئی خبر دے
جنون عشق میں انگارے بھر دے
عقل بے چین کر دیتی ہے اکثر
میرے مولا مجھے مجذوب کر دے!!!

''سوزِ کلیم'' میں جذبات کی رو اتنی تیز ہے کہ زبان و بیان کی کئی لغزشوں سے قاری صرف نظر کر جاتا ہے۔ جس کا اعتراف انہوں نے ''سوزِ کلیم'' کے آغاز میں خود ہی کر دیا۔

راز نہ شاعر ہے کوئی نہ ادیب زر نگار
حالتِ مزدور کر دیتی ہے اس کو اشکبار

اپنے خالق اور اس کی مخلوق کے عشق اور دردمندی میں ڈوبا ہوا شاعر۔ خدا، رسولؐ اور اولادِ آدم سے محبت کے پیغام کو بہت دور تک پھیلانے کا متمنی ہے۔ کیونکہ اس کائنات کی اصل۔ اس کی بنیاد محبت ہی ہے۔ اور عشق و محبت ہی اصل کہانی ہے جو ''سوزِ کلیم'' میں بیان کی گئی ہے باقی سب باتیں وقتی اور جھوٹی ہیں۔ اس بے خطر آگ میں کود جانے والے جذبۂ عشق کو حکیم الامت علامہ اقبال نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

عشقِ دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

میں لطیف راز صاحب کو ان کے پاکیزہ اور عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے خیالات و جذبات کو ''سوزِ کلیم'' کی صورت میں رقم کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ رب العزت آپ کے جذبۂ عشق اور دردمندی کو سلامت رکھے۔ شکریہ

بروز اتوار مورخہ 26 اپریل 2015ء

صادق باجوہ......ایک دردمند شاعر

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

صادق باجوہ سے میرا پہلا تعارف چند سال قبل اس وقت ہوا جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ''میزانِ شناسائی'' بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ کتاب کو الٹ پلٹ کر کئی بار دیکھا۔ کتاب کے اندر یا باہر کچھ بھی تحریر نہ تھا۔ خیال گذرا کہ شاید کتاب غلطی سے بھیج دی گئی ہے۔ سوچتے رہے کہ یہ اچھا میزانِ شناسائی ہے کہ صاحبِ تحریر سے تعارف ہی نہیں اور کتاب مطالعے کے لیے حاضر ہے۔ اسے بھی اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا کہ ایسا کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

ہمارے تخیل کے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کو اس وقت لگام لگی جب جرمنی سے حیدر قریشی کے فون نے اس مخمصے کو حل کیا کہ کتاب ان کی جانب سے بھیجی گئی تھی۔ شکریے کے ساتھ ہی ''میزانِ شناسائی'' سے شناسائی پیدا کرنے کے لیے کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس شعری مجموعے میں باقر زیدی، سلطان جمیل نسیم اور اکرم ثاقب کے تبصروں اور جائزوں کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب کی مختصر تحریر بعنوان حرف اول بھی شامل تھی۔

میرے خیال میں یہ حرف اول ہی نہیں بلکہ حرف آخر بھی ہے کیونکہ صادق باجوہ نے جس انداز میں شاعر اور شاعری پر اظہار خیال کیا کہ ''ایک اچھے شاعر کی زندگی نشو ونما، رہن سہن، عادات واطوار، مشاہدات وتجربات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ شعر گوئی کا شعور و ادراک زندگی، ماحول، تہذیب وتمدن اور روزمرہ ہونے والے حالات و واقعات سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ایک شاعر انتہائی سنجیدگی اور حساس دل کی گہرائی سے روزمرہ پیش آمدہ

واقعات و مشاہدات اپنے سینے میں جذب وثبت کرنے کے عمل تسلسل سے دوچار رہتا ہے۔''

میں سمجھتی ہوں کہ تخلیقی عمل کی اساس (یا وہ نثر ہو یا شاعری) انہی عناصر کی مرہون منت ہے لیکن اگر اس میں ایک بہت ہی دردمند دل بھی شامل ہو پائے جو غم جاناں، غم دوراں اور غم عقبیٰ کو اکٹھا کر کے غموں کو کشید کرنے کا ہنر جانتا ہو تو میزان شناسائی اور کاسۂ نمناک جیسی دردمند تحریریں وجود میں آتی ہیں۔ جس کے لیے صادق باجوہ خود لکھتے ہیں کہ ؎

بانٹیں دکھ، پائیں سکوں امن واماں ہو ہر سو
عرصۂ دہر ہو میزانِ شناسائی کی

یا پھر

اشک کتنی دیر چھنتے ہی رہے
آنکھ کے اس کاسۂ نمناک سے

ان جیسے بے شمار اشعار صادق باجوہ کے دونوں مجموعۂ کلام میں آپ کو جا بجا ملیں گے جس میں ان کا حساس پن، ازلی اور ابدی، غمگساری، سوز وگداز اور مائل بہ شگفتگی انسانی قدروں کا نوحہ نظر آتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ شاعر نے اپنا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دینے کی سعی کی ہے جو پڑھنے والے کا دامن ہر قدم پر کھینچ کر اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مثلاً ؎

اپنے ہاتھوں میں ہی صادقؔ موت کا سامان ہے
آج کا انسان پھر گھاٹے میں ہاتف نے کہا

*****

انسانیت کے نام سے انساں کا خون ہے
پھیلا ہے شرق و غرب میں اک انتشار سا

میزان شناسائی میں اگر غزلیں، رباعیات وقطعات ہیں تو کاسۂ نمناک میں غزلوں

کے ساتھ ساتھ نظمیں اور پنجابی کلام بھی شامل تھا جو صادق باجوہ کے مجموعہ کی وسعت نظر اور مائل بہ تنوع شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

ایک شعر دیکھئے: ۔

ہے نظر کی بھی رسائی دور تک
ایک دنیا آنکھ کے اس تِل میں ہے

یہ شعر پڑھتے ہوئے نجانے کیوں مجھے ہندی سنیما کی ایوارڈ یافتہ فلم سلم ڈاگ ملینئر یاد آ گئی ہے۔ جہاں دور بین نظریں ہندوستان کی نام نہاد ترقی اور ان کی خوشحالی کا بھانڈا بیچ چورا ہے پھوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں اور صادق باجوہ کی نظروں کا ریڈار انسان اور انسانی زندگی کے المیوں کے گویا پاتال سے کھینچ کھینچ کر باہر نکالتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں: ۔

جانے کب سے دیکھ رہا ہوں آتے جاتے راہی کو
رستہ نہیں پہچانے شاید انسانوں کی ذاتوں کو

اس دردمندی اور غمگساری کے باوجود صادق باجوہ نے قنوطیت کا رستہ اختیار نہیں کیا بلکہ انسانی نفسیات اور زندگی کے دکھوں اور انسانی بے حسی کا نوحہ لکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے باہر نکلنے کی تدابیر بھی بتائی ہیں۔ گویا ان کا کلام رجائیت کا بھرپور انداز لیے ہوئے ہے جو پڑھنے والے کو بے حوصلہ نہیں کرتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ۔

انہیں ڈرائیں گے کیا موت سے حوادثِ غم
جو چل رہا ہے صلیبوں کو خود اٹھائے ہوئے

*****

بانٹ کر دوسروں کے دکھ صادقؔ
ہم نے جینے کا راز پایا ہے

*****

اسی امید پہ جیتے ہیں صادقؔ
کبھی تو قدر انسانی بھی ہوگی

*****

کربلا آج بھی کہتا ہے یہ ہم سے صادقؔ
بے خطر بڑھتے چلو، ظلم مٹانے کے لیے

*****

آرزو کوئی نہ خواہش ہے کوئی
جستجو صادقؔ کو ہے انسان کی

*****

صادق باجوہ انسان تو انسان خوابوں کو بھی دربدر ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ شعر دیکھئے: ۔

خواب جو دیکھے ہیں صادقؔ ان کی کچھ تعبیر ہے
آرزو کیونکر گریزاں دربدر ہو جائے گی

میرے خیال میں صادق باجوہ غزل کے پہلے مصرعے سے لیکر مقطع تک پہنچتے پہنچتے گویا صدیوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں مگر یہ آبلہ پائی انہیں اپنی سوچوں کے محور سے ہٹنے نہیں دیتی اور کسی ابہام کا شکار ہوئے بغیر وہ اپنے قطعات میں کھل کر سامنے آتے ہیں اور انسانی مصائب کے حل کی نہایت سچی تدبیر پیش کرتے ہیں کہ ۔

ڈھل پائیں ایک آن میں صادقؔ کثافتیں
پچھلے پہر کے آنسوؤں سے گر وضو کریں

میں صادق باجوہ کو ان کی دونوں کامیاب شعری تخلیقات پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ انسانوں سے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھیں گے کیونکہ ہم سب ان کی بات بہت غور سے سن رہے ہیں۔

پاکیزہ بیگ۔۔۔ایک اُداس شاعرہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

چڑیوں سے سرگوشیاں کرنے والی سادہ مزاج اور حساس دل پاکیزہ بیگ سے میرا غائبانہ تعارف برسوں پہلے ان کی چھوٹی بہن قانع ادا کے توسط سے اس وقت ہوا جب میں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات میں گریجویشن کر رہی تھی۔ گو کہ پاکیزہ بیگ کونجوں کی قطار کے ہمراہ بابل کے محلوں کو چھوڑ کر مغرب کے کھلیانوں کا رخ کر چکی تھیں مگر کالج میں ابھی تک ان کی شاعری اور پاکیزہ ترنم کے چرچے تھے۔ اپنے ترنم کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں کہ ''بس مجھے گنگنانے ہوئے ہی خدا کی اس دین کا پتہ چلا جس کے ذریعے گلے میں بھگوان بولنے لگتے ہیں۔''

اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل لگتا ہے کہ پاکیزہ بیگ گنگناتے ہوئے شاعری کی طرف آئیں یا شعر کہتے ہوئے گنگنانے لگیں۔ مگر معاملہ جو بھی ہو پاکیزہ بیگ اور ترنم اب لازم و ملزوم ہیں۔ وطن سے دوری نے جہاں پاکیزہ کی شاعری میں دردوغم کے دریا موجزن کر دیئے ہیں ان کے ترنم میں بھی سوز و گداز نے ان کو ممتاز و منفرد کر دیا۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں یوں ملتا ہے کہ ؎

اسے آواز کا جادو سمجھنا
یا اپنے پیار کی خوشبو سمجھنا
میں بیتے ساونوں کو ڈھونڈتی ہوں
میں کوئل ہوں میری کو کو سمجھنا

پاکیزہ بیگ سے برسوں پہلے کا تعارف برمنگھم میں ''آگہی تنظیم'' کے خواتین مشاعرے کی صدارت کی دعوت پر حقیقت میں تبدیل ہوا۔ انہیں دیکھ کر مجھے ان کی والدہ بہت شدت سے یاد آئیں۔ اپنی والدہ سے ان کی زبردست مشابہت ہے، رنگ روپ، قد کاٹھ، ناک نقشہ والدہ اور والد دونوں سے انہیں ملا ہے۔ گجرات میں ان کے ہاں اکثر جانا رہتا۔ ان کے والد ریٹائرڈ سی۔ ایس۔ پی آفیسر تھے۔ کسی زمانے میں بہت رعب دبدبہ اور شان و شوکت رہی مگر جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ بھی وہیل چیئر تک محدود ہو چکے تھے۔

پاکیزہ کا ذکر دونوں ہی بہت محبت سے کرتے۔ لگتا تھا بڑی بیٹی کی جدائی ان پر گراں گذرتی ہے۔ سادہ مزاج، پرخلوص اور محبتیں بانٹنے والے والدین تھے۔ ان کے سبھی بہن بھائیوں میں خداداد تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔ کوئی شاعری کر رہا ہوتا تو کوئی موسیقی میں مگن۔ کوئی مصوری میں پیش پیش، تو کوئی آواز کا جادو جگا رہا ہوتا۔ میں جب بھی ان کے ہاں جاتی تو وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

پاکیزہ بیگ کے خاندانی پس منظر کا علم رکھنے والا شخص جب پاکیزہ کی شاعری پڑھتا ہے تو وہ شاعری نہیں لگتی بلکہ ایک حقیقت ہے۔ قلبی واردات ہے۔ جہاں پاکیزہ کا وحشی دل انہیں نگر نگر دوڑاتا پھرتا ہے، کہیں یہ گاؤں سے گذرنے والی ندی بن جاتی ہیں تو کہیں زمین سے بچھڑ کر اجنبی جزیروں میں آباد ہونے کی کہانی ہے۔ باغوں میں بولتی کوئل کی کوک آج بھی انہیں سنائی دیتی ہے تو یہ بے چین ہو کر بکھر سی جاتی ہیں۔ اداس دھند بن کر چھا جاتی ہے۔ جانے انجانے ساحلوں پر کھوئے ہوئے منظر تلاش کرتی ہیں۔ ہوائیں شور مچاتی ہیں۔ سورج گہنایا ہوا لگتا ہے تو یہ پتھر کی کلی بن جاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک گہری اداسی، حزن و ملال، جدائیوں کا غم، اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا درد، وہ گلیاں، وہ محلے، وہ بابل کے اونچے چوبارے، راوی کی شامیں، چناب کے کنارے، بہت شدت سے اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ پاکیزہ نے اپنی زمین سے رشتہ نہیں توڑا، بس مجبوری میں خاک لندن کو وطن مان لیا ہے۔

ان سب کیفیات کا اظہار انہوں نے جس طرح شاعری میں کیا ہے ملاحظہ کریں۔

اس ہجر میں تپتے ہوئے صحرا کی طرح ہوں
آجاؤ کہ سوکھے ہوئے دریا کی طرح ہوں
کچھ عکس ہیں کچھ روپ ہیں کچھ لمس ہیں مجھ میں
گاؤں سے گذرتی ہوئی ندیا کی طرح ہوں

یا پھر۔

میں مٹی ہوں، میں تنکا ہوں، میں ذرّہ ہوں، میں خوشبو ہوں
اڑا دے اے ہوا مجھکو، میری ہستی کہیں لے چل

وطن سے دوری کے دکھ کا بیان ملاحظہ کریں۔

زمین کو چھوڑ کر پانی پہ آبسے ہم لوگ
نجانے ڈوبنے والوں کی بہتری کیا ہے
وطن سے دور گزاری ہیں کس طرح شامیں
یہ ہم سے پوچھو کہ رنجِ مسافری کیا ہے

یا پھر۔

یہ شبنم ،چاند تارے، پھول کلیاں
انہیں بکھرے ہوئے آنسو سمجھنا

انسانی جذبات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سب سے قوی جذبہ ''محبت'' کا ہے۔ یا پھر اس کے برعکس ''دشمنی یا رقابت'' کا۔ انسان کی ساری زندگی ان ہی دو جذبوں سے عبارت ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دشمنی اور رقابت بھی محبت ہی کی ایک شکل ہے۔ تو گویا یہ دنیائے رنگ و بو یہ کارزار حیات سب محبتوں کا ہی کاروبار ہے۔ پیار کا یہ سلسلہ ہے۔ دنیا میں سب دکھ سکھ، اضطراب، سکون ان ہی دو بنیادی جذبوں سے منسلک ہے۔

پاکیزہ بیگ نے بھی محبتوں کے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔ کسی مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ ''اچھا شعر تخیل کی مدد سے پاکیزہ جذبات کے اظہار کا نام ہے'' اور میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ پاکیزہ بیگ نے اپنے تخیل کی مدد سے پاکیزہ محبتوں کے جذبات کو زبان دی ہے۔ مگر جذبوں کے اظہار کے اس سفر میں وہ تنہا تنہا اور کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہیں۔ جن کا اظہار ان کی شاعری میں یوں ہوا ہے کہ۔

پاکیزہ سے نہ پوچھ کہ کس حال میں ہے وہ
اک عمر ہوگئی اسے خود سے ملے ہوئے

پہلا قدم......کتاب سیمیا

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

ڈاکٹر صفات احمد علوی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہماری تنظیم آگہی کی برطانیہ میں ''اردو قلمکار خواتین کی نیشنل ڈائریکٹری کی ترتیب و تدوین کے دوران جناب محمد ہاشمی صاحب کے توسط سے ہوئی جن کے پاس ڈاکٹر صاحب کے انگریزی میں لکھے ہوئے اردو زبان و ادب کے ارتقا پر چند مضامین تھے جو مجھے بہت پسند آئے اور ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے وہ خواتین ڈائریکٹری میں شامل ہوئے۔ بعد میں اسی ڈائریکٹری کی رسم اجراء کی تقریب میں ڈاکٹر صاحب شامل ہوئے اور ایک بے حد معلومات افزا مضمون اردو۔ ایک دوب گھاس کے نام سے انہوں نے پڑھا جو بعد میں ان کی کتاب انامیکا میں شامل ہوا۔

میں اپنی بات کی ابتدا محترمہ سلطانہ مہر کے ان الفاظ سے کروں گی کہ ''ڈاکٹر صفات احمد علوی ایک فرد نہیں ایک ادارہ ہیں۔علم و ادب کا۔لسانیات کا اور معلومات کا ایک ادارہ۔ لہٰذا ان سے گفتگو کے وقت احتیاط ضروری ہے کہ آپ کا رویہ طالبانِ علم والا ہو، ممتحن والا نہ ہو۔

میرے لیے یہ نہایت اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ایک ایسے شخص کی ادبی کاوش پر گفتگو کرنے کے لیے دعوت دی گئی۔تو میں بھی اردو زبان و ادب کے طالب علم مگر بحیثیت ایک پروفیشنل سوشل ورکر، ریسرچر اور ایک ماہر تعلیم بات کو آگے بڑھاتی ہوں۔

کتاب سیمیا میں مختلف افسانہ نگاروں کے دس افسانے، پانچ نظمیں اور مصنوعی حمل

کاری یعنی عمل سیمیا یا آئی وی ایف کی اخلاقیات پر تین مضامین شامل ہیں۔ جو بہت سوچ سمجھ کر کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔

گو کہ اردو زبان و ادب میں تقریباً ہر موضوع پر لکھا گیا ہے مگر جنسی موضوعات پر قلم اٹھانا ابھی تک ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ موضوع شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس پیڑ کے پھل کھانے کی پاداش میں آپ راندۂ درگاہ ہو سکتے ہیں جس کی مثال احمد علی کے انگارے، منٹو کے افسانے، عصمت چغتائی اور حسن عسکری کی جنس کے موضوع پر تحریروں کو ''مریضانہ ادب'' قرار دیا جاتا ہے۔

بات صرف جنس نگاری کی نہیں ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی سماجی مسئلہ جس سے کسی طور پر ہماری شرمندگی یا اہانت کا پہلو نکلتا ہو ہم اسی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں اس معاشرے میں Child Abuse یعنی بچوں کے ساتھ جسمانی، ذہنی، جذباتی اور جنسی زیادتی پر بات نہیں کی جاتی تھی۔

Disabled یعنی معذور بچوں کو معاشرے کی نظروں سے چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ یعنی گھریلو تشدد پر بات نہیں ہوتی تھی مگر آج سب راز کھل گئے ہیں۔ نہ صرف ان موضوعات پر کھل کر بات ہوتی ہے بلکہ مختلف قوانین بنا دیئے گئے تو مصنوعی حمل کاری میں بھی اس وقت ایک ایسا ہی موضوع ہے جس پر لکھنے کے لیے بہت ہمت کی ضرورت ہے اور اس کتاب کو اس سلسلے میں اگر پہلا قدم قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

کتاب کا انتساب بذات خود کتاب میں موجود تحریروں میں اٹھائے جانے والے موضوع کی نشاندہی کرتا ہے یعنی ''ان عوام کے نام جنہیں عمل بار آوری میں موجودہ سائنس کی تکنیکی ترقی نے اپنے نسب کی تلاش میں سرگرداں کر رکھا ہے۔''

تو اس میں (Catch Phrase) ہے نسب کی تلاش یعنی شناخت کا مسئلہ۔ اصل کی تلاش، جڑوں کی تلاش، وجود کا ادراک، ذات کی پہچان۔

اسی پہچان، اسی شناخت، اسی ادراک کے لیے کنبے اور خاندان بنائے گئے اور یہ کنبے

اور خاندان صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ چرند، پرند، نباتات، حیوانات یہاں تک کہ نظامِ شمسی کے اندر زبردست ربط وضبط، ایک پہچان اور ڈسپلن موجود ہے اور جس دن یہ نظم وضبط تہہ وبالا ہوا ہم سب جانتے ہیں کہ وہ روزِ قیامت ہوگا۔

تو انسان جس کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ

ترجمہ: ''کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کیا ہے۔''

تو ہم اس بہترین صورت کو جب ایک بہترین عمل کے ساتھ تشکیل نہیں دیں گے تو اس سے جو معاشرتی، نفسیاتی، جذباتی، روحانی اور اخلاقی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے اس کی ایک جھلک اس کتاب کے اندر شامل افسانوں میں موجود ہے۔

''حیدرقریشی کا ادبی سفر''
ایک تحقیقی مقالے پر تعارفی تبصرہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

''اردو ادب کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو مغرب کا جدید منظر نامہ جو صورتِ حال متعارف کرواتا ہے اس میں حیدرقریشی کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ ان کا متنوع تصنیفی سرمایہ پر سنجیدہ قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ بلند سطح کے ذوقِ سلیم اور گہرے پس منظری مطالعے کے بغیر حیدرقریشی جیسے ہمہ جہت اور صاحبِ طرز ادیب کی تحریروں سے حظ اٹھانا محال ہے۔ اپنی تبحیر علمی اور خوش ذوقی کی بنا پر جس سادگی اور پُرکاری سے عامر سہیل نے حیدرقریشی سے کثیر الجہت ادیب کو ایم فل کے مقالے میں سمیٹ کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ بجائے خود ان کی ناقدانہ اور محققانہ صلاحیتوں اور طباعی کی روشن دلیل ہے۔''

یہ الفاظ وتاثرات ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی کے ہیں جن کی زیرِ نگرانی عامر سہیل نے اپنا ایم فل کا مقالہ درج بالا عنوان کے تحت مکمل کر کے ستمبر 2005ء میں کتابی شکل میں شائع کروایا ہے۔

کل 320 صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر تصنیف بہ تعاون ارشد خالد، مدیر عکاس انٹرنیشنل، سقراط بکس، ایبٹ آباد نے شائع کی ہے۔

کتاب میں مقدمہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے نہایت مفصل اور مدلل انداز سے تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حیدرقریشی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور مرکز سے دور رہ

کر بھی جرمنی میں وہ ادبی دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس گذشتہ چار دہائیوں سے دلاتے چلے آ رہے ہیں۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بیک وقت ایک اچھے محقق، ناقد اور تخلیق کار ہیں۔لہٰذا ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا کسی عام ناقد اور محقق کے بس کا کام نہیں ہے۔ایسی ہمہ جہت شخصیت پر کام کرنا کسی رِشی مُنی کی طرح تنبیہ کرنے کے مترادف ہے۔آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''اردو ادب میں تنبیہ کرنے والے تپسوی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں اور عامر سہیل اردو کے کمیاب تپسویوں میں سے ایک ہیں۔''

اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ ''عامر سہیل نے اس کام کو سرانجام دینے میں تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے اور ان کی زیرِ بحث تصنیف ''حیدر قریشی کا ادبی سفر'' ان کی تنقیدی وژن کی بہترین مثال ہے۔''

کتاب کا انتساب عامر سہیل نے اپنے بیٹوں، جبرائیل، سقراط اور بیٹی حدیث کے علاوہ اپنی ہم قدم میمونہ عامر کے نام بھی کیا ہے۔ایبٹ آباد میں عامر سہیل کی جانب سے نہایت خلوص سے ارسال کردہ یہ کتاب پڑھ کر بے حد اچھا لگا کیونکہ ہمارے ہاں تحقیقی مقالات کو کتابی شکل میں شائع کروانے کی روایت خال خال ہی ہے۔زیادہ تر مقالہ جات یونیورسٹیوں کی بوسیدہ اور گردآلود الماریوں میں بند پڑے رہتے ہیں جہاں اکثر و بیشتر یا تو انہیں دیمک چاٹتی ہوئی نظر آتی ہے یا پھر تحقیق و جستجو میں سرگرداں طالبانِ علم ان مقالوں پر سے گرد جھاڑتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ ایک نہایت خوشگوار اور حوصلہ افزا تبدیلی ہے جو کہ نہ صرف علم بلکہ ادب ادیب اور محقق بلکہ مجموعی طور پر معاشرے کے لیے ایک نہایت نیک شگون ہے۔کیونکہ اس طرح نہ صرف تحقیقی کام محفوظ ہو کر بہت دور تک رسائی حاصل کرتا ہے بلکہ آئندہ کے تحقیقی کام کی راہیں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔محنتِ شاقہ سے تلاش کیے ہوئے نایاب گوہر الماریوں سے نکل کر جب عوام الناس تک پہنچتے ہیں تو علم و آگہی کے ابلاغ کے ساتھ ساتھ محقق کی محنت کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے کہ یہی پڑھے لکھے، تہذیب یافتہ اور باشعور معاشروں

کا چلن ہے۔

مزید برآں اس مستحسن عمل سے معیاری مقالات سامنے آئے ہیں اور غیر معیاری مقالات لکھنے اور لکھوانے والوں کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی ہے۔یہاں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس سے قبل بھی حیدر قریشی کی علمی اور ادبی خدمات پر انڈیا اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کئی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔جس میں ایک ایم اے، تین مزید ایم فل اور ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ شامل ہے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم اے، جبکہ کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایم فل کے دو مقالے لکھے جا چکے ہیں اس طرح بشمول عامر سہیل مقالہ ایم فل کے کل چار مقالے قلمبند کیے جا چکے ہیں۔

گلبرگہ یونیورسٹی، کرناٹک سے 2003ء میں عبدالرب استاد نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں'' نہایت کامیابی سے مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں عامر سہیل لکھتے ہیں کہ:

''میرا مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔باب اوّل میں حیدر قریشی کی تخلیقی نثر کے پانچوں اہم ادبی حوالے مثلاً افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سفرنامہ نگاری اور یادنگاری پر بات کی گئی ہے۔میرا طریق تحقیق یہ رہا کہ ان تمام بنیادی پہلوؤں کو اس انداز سے زیرِ بحث لایا جائے جس کی مدد سے حیدر قریشی کے فکری اور ادبی نظام کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جائے۔''

مزید لکھتے ہیں کہ ''باب دوم شعری مباحث کا احاطہ کرتا ہے اس میں زیرِ بحث شخصیت کی غزل، آزاد نظم اور ماہیا نگاری کے فنی اور فکری جہتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔باب سوم میں حیدر قریشی کو بحیثیت محقق موضوع بحث بنا کر ان کی تمام تحقیقات کو جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم کا تعلق ان کی تنقیدی خدمات کے ساتھ ہے جس میں معروضی انداز نظر
اپناتے ہوئے تمام ادبی فن ومحاسن پر سیر حاصل مباحث اٹھائے گئے ہیں جبکہ باب پنجم میں
حیدرقریشی کے فکری نظام کو بنیاد بنا کر ان کی مجموعی ادبی خدمات کا محاکمہ پیش کیا ہے اور
حاصل تحقیق کے اہم نکات اخذ کرنے کی طرف توجہ کی گئی ہے۔''

حیدرقریشی کے اوریجنل کام کے حوالے سے اب تک ان کی ستائیس (27) کتابیں
چھپ چکی ہیں جن میں چھ شعری مجموعے، دوافسانوی مجموعے، خاکہ نگاری، یادنگاری اور
انشائیہ نگاری پر ایک ایک مجموعہ اور ایک سفر نامہ شامل ہیں۔

حالات حاضرہ پر کالموں کے چار مجموعے جبکہ ماہیا کی تنقید وتحقیق پر پانچ کتابیں اور
متفرق تنقیدی مضامین کی چھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔کل ملا کر ان کی 35 کتب بشمول
مختلف ایڈیشنز منظر عام پر آ چکی ہیں۔

کتابیات کے باب میں بنیادی اور ثانوی مآخذ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بنیادی مآخذ
میں حیدرقریشی کی کل 23 نثری، شعری اور تحقیقی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے جبکہ ثانوی مآخذ
میں 110 کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس مآخذ میں استفادہ کرنے والی تحریروں میں
بہت نامور ادیب اور محقق شامل ہیں۔

ادبی رسائل اور جرائد کی کل تعداد 57 ہے جن کو اس تحقیقی مقالے کے مواد کے لیے
استعمال کیا گیا ہے۔ان میں الماس، اوراق بازیافت، تحقیق، ذہن جدید، خیابان، صحیفہ،
عکاس، فکر وتحقیق اور معیار شامل ہیں۔

اس کے علاوہ سات اردولغات، تین فرہنگ اصطلاحات اور اصول تحقیق کی کل نو
تصانیف سے اس مقالے کو قلمبند کرنے میں مدد دی گئی ہے۔

حیدرقریشی کا سوانحی خاکہ ارشد خالد نے مرتب کیا ہے جو کتاب کے آخر میں شامل کیا
گیا ہے۔

انٹرنیٹ پر حیدرقریشی کی کتابوں کی دستیابی کے لیے نہایت مربوط اور آسان متعدد

دیگر بلاگس اور لنکس کے مقابلے میں، تین آسان ترین لنک دیئے گئے ہیں۔

(1) http:// my27books.blogspot.del

(2) http:// kuliat-library.blogspot.del

(3) http:// work-on-haidergureshi.blogspot.del

فلیپ پر ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر عامر سیال، ڈاکٹر رشید امجد
لکھتے ہیں کہ ''حیدرقریشی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔نظم ونثر دونوں میں ان کی انفرادیت
حیثیت ہے۔تخلیقی جہتوں کے ساتھ انہوں نے تنقیدی میدان میں بھی اپنی اہمیت قائم
رکھی۔ ماہیا اور جدید نظم کے حوالے سے ان کے مضامین نے نئی جہتوں کا آغاز کیا۔ان کی
بنیادی خوبی ان کا کھرا پن اور سچ کہنے کا حوصلہ ہے جس کی وجہ سے انہیں کئی بار تیز وتند جملوں
کا شکار ہونا پڑتا ہے۔لیکن انہوں نے ثابت قدمی سے ان سب اعتراضات کے نہ صرف
جواب دیئے بلکہ اپنے مؤقف کو پوری دلیل سے واضح کیا اور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عابد سیال رقمطراز ہیں کہ ''حیدرقریشی معاصر اردو ادبی دنیا کی جانی پہچانی
شخصیت ہیں، ان کی ادبی شخصیت کی کئی جہات ہیں جن میں تخلیقی حوالے سے افسانہ نگاری،
خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سفرنامہ نگاری، یادداشتیں، غزل، نظم اور ماہیا ان کی پہچان ہیں۔
اس کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کی خدمات بہت قابل توجہ ہیں۔اردو
میں ماہیے کی مقبولیت کے ابتدائی زمانے میں ماہیے کی ہیئت اور مزاج کی شناخت اور تعین
کے حوالے سے ان کا مدلل اور مفصل کام یادرکھے جانے کے قابل ہے۔''

روس سے ڈاکٹر لڈمیلا وسیلیوا اپنے خیالات وتاثرات اس تحقیقی وادبی کام کے حوالے
سے یوں بیان کرتی ہیں:

''حیدرقریشی ایک عرصے سے اردو کی ادبی دنیا میں اپنی تحریروں سے پہچانے جاتے
ہیں اور ان کی ادبی سرگرمیاں دنیا کے ہر اس کونے میں مشہور ہوچکی ہیں جہاں اردو کا نام
ہے۔اکثر حیدرقریشی کا ذکر یورپ میں اردو ادب کے سفیر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔

اپنا علمی کام عامر سہیل نے بڑی محنت اور لگن سے کیا ہے۔ 316 صفحات پر مشتمل اس ضخیم تحریر کو حیدر قریشی پر موجودہ ادب میں ایک نمایاں اضافہ کہنا بالکل بجا ہوگا۔

عصری دور کے کسی اور اردو ادیب کی تصانیف اور اس سے منسلک ادب کے بارے میں زیادہ وسیع، واضح اور بالترتیب تفصیلات کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔

اور آخر میں کچھ ذاتی تاثرات اس ریسرچ کے حوالے سے بیان کرنا چاہوں گی۔

Let me congratulate you on completing such an invaluable piece of work. In any research work the dissemination of newly generated knowledge is crucial and you have already accomplished thie task by publishing your research in a book form. Well Done!!!

I Really appreciate the quality of work undertaken and the efforts you have made in collecting the primary and secondary data from a wide variety of sources, despite encountering substantial difficulties in accessing the data.

Your methodological choices are impressive particularly in terms of selecting the design for your research which is qualitative in this instance and by no means an easier choice for a novice researcher. However, you have handled the available data in a very skilful manner, especiallyy the way whole thesis is structured and the information/data analysed, has undoubtedly made it a very authentic piece of research.

My sincere advice for your next research project (Phd Degree) is that you should consider reviewing the prose and poetry

ontribution of Urdu writers living in the western world. I am sure it would make very interesting piece of research.

I wish you all the best for you future ventures.

Dr. Razia Ismail

10 Augusta Road, Atocks Green.

Birmingham. B27 61A, England, UK

صفیہ صدیقی بھی چلی گئیں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برمنگھم میں ادبی اور ثقافتی تنظیم آگہی کی جانب سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اور جہانِ اردو کی طرف سے محترمہ سلطانہ مہر اور جاوید اختر چودھری نے لندن میں مقیم معروف افسانہ نگار صدیقہ صدیقی کی ایک طویل علالت کے بعد رحلت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کے ساتھ ساتھ ان کے لواحقین اور دوست احباب کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے کہا کہ صفیہ صدیقی سے ان کی پہچان کم وبیش پچھلے پندرہ برسوں پر محیط تھی۔ جب 1997ء میں آگہی تنظیم کے آغاز پر برطانیہ کی خواتین قلمکاروں سے رابطے استوار کرنے کے لیے ایک نیشنل ڈائریکٹری اور آگہی ویب سائٹ کا آغاز کیا گیا۔ صفیہ صدیقی نے اس سلسلے میں بھرپور تعاون کرتے ہوئے آگہی لائبریری کے لیے اپنی کتابوں کا تحفہ بھی ارسال کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے پہلے شعری مجموعے ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' اور طنز ومزاح کے مضامین ''چاند میں چڑیلیں'' پر اپنے تاثرات نہایت خوشگوار انداز میں قلم بند کیے۔

صفیہ صدیقی کی تخلیقات میں ''پہلی نسل کا گناہ''، ''چاند کی تلاش''، ''چھوٹی سی بات''، ''دی گولڈن کیج'' The Golden Cage کے نام سے برطانیہ کی بارہ خواتین کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ اور انگریز مصنفہ میرین مالیٹو کے افسانوں کا ترجمہ زبان واحد (A Language in Common) کے نام سے کیا۔

اردو زبان وادب میں ان کی کمی تادیر محسوس کی جائے گی۔ برطانیہ کی سماجی زندگی کے مختلف مسائل اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کو انہوں نے اپنے افسانوں میں بھرپور انداز سے پیش کیا۔ ان کا افسانہ کمیونٹی لیڈر اس کی بہترین مثال ہے۔ سلطانہ مہر اور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے مزید کہا کہ پے در پے صدمات نے صفیہ صدیقی کی جذباتی اور نفسیاتی دنیا کو تہہ بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس عظیم خاتون، بہت اچھی قلمکار، محبت کرنے والی ماں اور رفیق حیات نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان صدمات کو رضائے الٰہی سمجھ کر قدرت کے فیصلوں پر سرِتسلیم خم کر دیا اور بالآخر غم کی چادر اوڑھ کر 28 نومبر بروز بدھ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔

''سلطاناؤں سے سلطانہ مہر تک''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

سلطانہ مہر اپنے نام کی مناسبت اور عرفیت سے مرقع کمالات ہیں۔ سلطان، سلطانہ اور سلطانی یہ سب جاہ وجلال والے نام ہیں اور سلطانہ مہر میں جاہ وجلال ہے۔ یہ جس محفل میں ہوتی ہیں حاضرین ان کی موجودگی سے بے خبر نہیں رہتے۔ ان کو محفل گزاری کا فن بھی آتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے کسی سلطانہ کو دربار آرائی میں درک اور دسترس حاصل ہوتی ہے اور جب تک وہ دربار میں رہتی ہے اس پر چھائی رہتی ہے۔ ایسے ہی سلطانہ مہر جس محفل میں ہوتی ہیں اس کی جان بن جاتی ہیں۔ اس پر چھا جاتی ہیں۔

سلطانہ ہونے کے باوجود سلطانہ مہر کو کسی تاج محل کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ان کے ارادات مند تو اپنے دلوں میں کب سے ان کے لیے عقیدت و احترام کے شیش محل سجائے بیٹھے ہیں۔

لیکن ایک اعتبار سے سلطانہ مہر صفات سلطانی سے قطعاً محروم ہیں۔ وہ یوں کہ ان کی پوری زندگی سلطانی وقت کے حدود و قیود کے خلاف بغاوت میں گزر گئی ہے۔ کیسا عجیب تضاد ہے ایک سلطانہ اور باغی، مہر ومحبت کے گیت بننے اور گانے والی اپنے عمل میں آج تک زمانے سے شیزہ کار اور آمادۂ پیکار رہی ہے۔

سلطانہ مہر کی شخصیت کا یہ پہلو بہت کم لوگوں پر آشکارا ہے کہ انہوں نے زندگی سماج کے مروجہ اصولوں، ضابطوں اور پیمانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں صرف کی ہے۔

ایک لڑکی جو ایک کٹر قسم کے قدامت پسند گھرانے میں آنکھ کھولے اور پھر جوان ہو کر اس کے نیم کو ماننے سے انکار کر دے باغی نہیں کہلائے گی تو اور کیا؟ ایک لڑکی جس کی مادری زبان سب کچھ ہو اردو نہ ہو وہ ہوش سنبھالنے اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی اردو میں کہانیاں لکھنا شروع کر دے اور اس پر اتنی کار بند رہے کہ گھر والوں کی مخالفت سے بچنے کے لیے اپنا نام ہی تبدیل کرے تو اس میں بغاوت کی پوری فوج ظفر موج پل رہی ہوگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سماج اور معاشرے کے ریت و رواج برسوں پہلے بلکہ صدیوں پہلے سے عورت کی آزادی کو مذہب اور نہ جانے کیا کچھ کے نام پر سلب کرتے آئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

سلطانہ مہر نے اس تسلط اور زیادتی کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اپنی ذات کو زادسفر بنا کر ایسے قلم کو راہوار کا رتبہ دے کر انہوں نے نہ صرف اپنی ذات کی نفی نہیں ہونے دی بلکہ اپنی جیسی اور ہزاروں لاکھوں دکھی عورتوں کی رہنمائی بھی کی ہے۔ انہیں اندھیری راہ پر چلتے ہوئے روشنی کا رزق دیا ہے۔ ان کی جدوجہد کو ایک جہت ایک راستہ ایک منزل فراہم کی ہے۔

سو آج تک وہ اردو شعر و نثر سوانح نگاری اور تاریخ سازی کے صحرائے بے آب میں مدر ٹریسا بنی ہوئی ہیں اور سرابوں سے بچتی ہوئی خود نئے نخلستان تلاش کیے جا رہی ہیں جس کے چشموں کے شائقین ادب وفن کی پیاس بجھے۔ رضیہ سلطانہ کی طرح یہ میدان مارتے ہوئے انہوں نے کسی غیاث الدین بلبن یا ملک کافور کا سہارا نہیں لیا۔ ہر دریا اپنے عزم کے پتوار سے پار کیا اور ہر دشت کو اپنی ذات کے راہوار سے عبور کیا۔ یہ ایک سو فیصد خود ساختہ یا self made مجاہدہ ہیں جنہوں نے اپنی جنگ کا ہر قاعدہ خود وضع کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اس عہد کی خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں کیونکہ

کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا سفر
بجھا چراغ تو دل کو جلا لیا میں نے

''یہ بڑے نصیب کی بات ہے!!''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

ڈاکٹر شہناز مزمل سے میری پہچان کوئی دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ محبت و یگانگت کے اس طویل سفر میں شہناز مزمل کی شخصیت ایک ہشت پہل ہیرے کی مانند جگمگا جگمگا کر ہر آن ہماری دوستی کی سلطنت کو خیرہ کرتی رہی۔ فرق صرف یہ رہا کہ ہیرے کا ہر عکس ایک جیسا ہی چمکتا ہے مگر شہناز مزمل کی تہہ در تہہ شخصیات کے ہر پہلو کے چمکنے کا انداز اور رنگ ڈھنگ مختلف رہا۔

وہ کبھی قادرالکلام شاعر کے روپ میں نظر آئیں تو کبھی ایک نثر نگار۔ کبھی سفر نامہ لکھ رہی ہوتیں تو کبھی کالم نگاری میں معاشرتی مسائل کا بھرپور ادراک پیش کر رہی ہوتیں۔

نعت گوئی کا وَردان یقیناً انہیں نسبت سادات ﷺ سے ورثے میں ملا۔ اسی لیے تو عشق خدا اور عشق نبی ﷺ میں ڈوبی ہوئی اس خوبصورتی سے حمد وثناء اور ذکر حبیب ﷺ کرتیں کہ جیسے کہہ رہی ہوں۔

آقا تیری کنیز ہوجاؤں
تیری گلیوں میں آ کے کھوجاؤں
من کی آنکھوں سے دیکھتی ہے مجھے
کاش میں آنکھ آنکھ ہو جاؤں

اور پھر وہ حقیقتاً آنکھ آنکھ ہی ہوگئیں۔ تلاش ذات کے سفر میں ۔ جادۂ عرفاں پر پابجولاں چلے ہوتے، یقیناً بڑے مشکل مقام اور کڑے امتحان آئے ہوں گے اسی لیے تو وہ

کہہ اٹھیں۔

کھڑی ہوں عشق سمندر کے میں کنارے پر
سفینہ موجوں سے باہر وہی اچھالے گا

اور جب سفینہ موجوں سے باہر نکلا تو دین و دنیا کی سعادتیں، برکتیں، عزتیں، ان کی جھولی میں آ گریں۔ عجز و انکساری، تہذیب و شائستگی، امن، محبت اور انسان دوستی کے درس دیتے ہوئے جہاں انہیں وقار پاکستان اور مادرِ دبستان لاہور، جیسے باعزت و باوقار خطابات سے نوازا گیا۔ وہیں اپنے نام مزمل کی لاج رکھتے ہوئے اللہ رب العزت اور اس کے حبیب ﷺ کے انوار سے پھوٹنے والی روشنیوں نے ''نور فرقان'' تک پہنچنے کا رستہ دکھا دیا۔ اسی لیے تو وہ کہہ رہی ہیں کہ

چھپایا تو نے جمال و جلال پردے میں
جمال ڈھونڈنے والا کمال میں نے کیا

یہ کمال یوں ہوا کہ شب و روز کی محنت اور ایک دہائی سے زیادہ عرصہ کے ریاضت، مجاہدے نے انہیں قرآن پاک کا منظوم مفہوم نور فرقان کے نام سے پیش کرنے کی سعادت دارین بخشی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست

کیونکہ جب تک اس مالک و خالق کا کرم۔ اس کا فضل شامل حال نہ ہو لکھنا تو دور کی بات ہے، نہ سوچ کی گرہ کھلتی ہے، اور نہ ہی قلم اٹھانے کی توفیق نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ قلم ہے جس کی پیدائش کا منبع نور محمدی ﷺ ہے اور اس قلم نے ساق عرش پر اوّل کلمہ لکھنے میں چار سو برس لگا دیئے تھے اور اس کے حبیب ﷺ کا نام مبارک لکھتے ہوئے تو ہیبت خطاب جل شانہ سے قلم تھرّا اُٹھا اور اس کے منہ پر ایسا شگاف مسنون جاری ہوا جو قیامت تک رہے گا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے قرآن پاک کی منظوم ترجمہ نگاری کرنے والی یہ پہلی

خاتون ہیں اس عظیم کام پر میں انہیں جتنی بھی مبارکباد پیش کروں کم ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ شہناز مزمل سے کچھ نسبت ہے ۔ اس عظیم کام کے باوجود شہناز مزمل کے ہاں عجز وانکساری اور کسر نفسی عروج پر ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے حاسدین کی موجودگی میں اس کام کا پایہ تکمیل تک پہنچنا بلاشبہ اس کُن والے کا فیکون کا فضل ہی تو ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہہ رہی ہیں:

’’یہ ترجمہ نہیں ۔اور نہ ہی میں اس کی اہل ہوں ۔بس یہ منظوم مفہوم ہے۔اسے میری ایک عاجزانہ کاوش کہہ سکتے ہیں۔‘‘

میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ شہناز مزمل کے اس کام پر کسی قسم کا تبصرہ یا رائے کا دینا میرا منصب بالکل نہیں ہے۔ میری کیا وقعت ہے، میری کیا مجال ہے کہ میں اس پر رائے زنی کروں۔بس اتنا کیا کم ہے کہ شہناز مزمل نے بہت محبت سے مجھے کچھ لکھنے کے لیے کہا اور میں باوضو ہو کر تبرکاً اس قافلے میں شامل ہو گئی۔ جنہوں نے اس عظیم فریضے میں ان کی مدد اور رہنمائی کی ہے دعا گو ہوں کہ اس کام کو شہناز مزمل کے ساتھ ساتھ ان سب کی بخشش کا ذریعہ بنا دے (آمین)۔

آخر میں میں اتنا ہی کہوں گی کہ ۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

اور شہناز بڑے نصیبوں والی ہے۔

اللہ پاک ان کا اقبال، عزت وتوقیر دونوں جہانوں میں بلند رکھے۔ (آمین)

ماہیا ونشی......حیدر قریشی

(ایک ہلکی پھلکی تحریر معذرت کے ساتھ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا
سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرے خیال میں حیدر قریشی کا یہ شعر ان کی ذات اور ان کی شخصیت کا بہترین تعارف ہے۔ کیونکہ حیدر قریشی صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ اس فرد واحد کے اندر سمندر کے وشال سینے کی مانند، بہت سی شخصیات ادب کی دھونی رما کر بیٹھی ہوئی ہیں۔

اس ادبی درویش کے فکر وفن کی دنیا صرف ہمارے عہد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کل، آج اور آنے والے کل کا بھی احاطہ کرتی ہے۔اس لیے حیدر قریشی ادب کی ایسی تہذیب ایک ایسی روایت ہے جس میں ایک نہیں بلکہ کئی عہد سمائے ہوئے ہیں۔

ایسی ہمہ جہت شخصیت پر کچھ لکھنے کے ارادے سے ہم نے جیسے ہی قلم کاغذ سنبھالا تو چاروں جانب سے جیسے باادب، باملاحظہ، ہوشیار کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ہم نے بے یقینی کے عالم میں پلٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرد قلندر بہت محبت سے غزل کے گیسو سنوارتا ہوا، نظم کو بغل میں دبائے، افسانے کی بُکل بارے، یادنگاری کے رتھ پر سوار انشائیے سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا، کالم نگاری کی عینک لگائے، تحقیق وتنقید کے چوب داروں کے ہمراہ، سفرنامے کی انگلی تھامے ماہیا کا تاج سر پر رکھے پورے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ ادب کے ایوان عالیہ میں داخل ہوا۔

ہم ان کی گوناں گوں ادبی خدمات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے شش و پنج میں تھے کہ ہمیں دور سے اکبر حمیدی کی آواز سنائی دی کہ ''حیدر قریشی کی یلغار سے اب تک بہت کم اصنافِ ادب محفوظ رہ سکی ہیں۔ نظم ہو یا غزل، نعت ہو یا ماہیا، افسانہ ہو کہ خاکہ، انشائیہ ہو یا تنقید، ایسا لگتا ہے کہ اصنافِ ادب ان کی راہ میں سر جھکائے کھڑی ہیں کہ وہ آئے اور انہیں شکار کر کے ان کی عزت و توقیر میں اضافہ کرے۔ ہمیں لگا کہ جیسے حیدر قریشی سکندرِ اعظم ہوں، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔''

ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ غزل سے ہمکلام ہوں یا نظم سے ہاتھ ملائیں۔ انشائیہ کے گال پر پیار سے چپت لگائیں یا تنقید و تحقیق کی قہر آلود نظروں کا سامنا کریں یا پھر پوری پنجابی سج دھج کے ساتھ والہانہ انداز میں اترا اترا کر چلتے ہوئے ماہیا کو جی آیاں نوں کہیں کہ اتنے میں ادب کے شہنشاہ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔

ہم نے حکایت دل زبان پر لانے کے لیے جیسے ہی ان سے نظر ملائی تو ہمیں یوں لگا کہ جیسے یہ عمر بھر ''سلگتے ہوئے خوابوں سے'' گریزاں رہے ہوں۔ مگر جیسے ہی ان کی تپش کم ہوتی سوختہ ذہنوں پر ''محبت کے پھول'' کھل اٹھے۔ ان رنگا رنگ پھولوں کے حسن و جمال کو دل و نگاہ میں بسائے۔ ''دعائے دل'' یہی تھی کہ ان کی نزاکت، بانکپن اور رنگینیں ہمیشہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ و مامون رہیں۔ دعاؤں کو شرف باریابی ملا تو ''روشنی کی بشارت'' لیے قصے کہانیاں بیان کرتے ہوئے ''اِدھر اُدھر'' گھومتے پھرتے اس انتظار میں تھے کہ دنیا سے کب نفرتوں کا وجود ختم ہو۔ کب شبِ گزیدہ سے ایسی سحر طلوع ہو کہ امن کی فاختہ خود ہی منڈیر پر آ کر محبت کے نغمے سنا کر ہماری سماعتوں میں رس گھول دے۔

اسی انتظار میں زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ یعنی اپنی ''محبتیں'' سمیٹے ہوئے ''سوئے حجاز'' چل پڑے۔ فاصلے سمٹے تو قربتیں بڑھیں، دوریاں ختم ہوئیں تو وقت کی دہلیز پر ''کھٹی میٹھی یادوں'' نے دامنِ دل میں بسیرا کر لیا۔

ہم خیالات کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن تھے کہ ان سے کیسے متعارف ہوں کہ کتاب

195

دل یعنی ماہیا نے ہماری دلی کیفیت کو بھانپ لیا اور آگے بڑھ کر نہایت خلوص سے ہمارا ہاتھ تھام لیا۔

جی ہاں...... حیدر قریشی صاحب سے ہمارا پہلا تعارف ماہیا کے توسط سے ہی ہوا۔ برمنگھم میں مقیم ''کشمیر اُداس ہے'' کے مصنف، ممتاز ادیب اور صحافی محمود ہاشمی اس بات کے گواہ ہیں، ان کی ماہیا کی ادبی تحریک سے متاثر ہو کر، ان سے ملے بغیر ہی ہم اتنے ماہیے لکھ چکے تھے کہ ان کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں'' کے نام سے شائع ہوا جس کا پیش لفظ حیدر قریشی صاحب نے ہی لکھا اور یوں ہمیں برطانیہ کی پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

غزل کے بارے میں نیاز بدایونی کا کہنا ہے کہ ؎

فکر اور فن کے تقدس کی علامت ہے غزل
ادب اے دوست یہ کوچہ میری تہذیب کا ہے

اسی طرح ماہیا بھی پنجابی فکر و فن، تہذیب اور ثقافت کی ایک خوبصورت روایت کا نام ہے۔ ایسا لوک گیت جس میں پنجاب کا دل دھڑکتا ہے، ایسا گیت جو کبھی کوئل کی کوک تو کبھی بانسری کی ہوک بن جاتا ہے۔ ماہیا نام کے پودے کو پنجابی زمینوں سے اٹھا کر اردو زمینوں میں پنپنے اور پھر ایک تناور درخت بنانے میں جس بے پایاں محبت، جذبوں کی شدت اور خلوص کی چاشنی سے حیدر قریشی نے کام کیا ہے اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ گویا اب حیدر قریشی اور ماہیا لازم و ملزوم ہیں۔

ماہیے سے ان کی ایسی محبت دیکھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ حیدر قریشی خانپور سے ماہیا گاتے ہوئے ہی جرمنی میں وارد ہوئے ہوں گے یعنی کہ ''کنیں مُندراں تے ہتھ وچ کاسہ رانجانی فقیر ہو گیا''۔ اس بات کی تصدیق خود ان کا یہ ماہیا کرتا ہے کہ ؎

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

ماہیے کی پرورش میں حیدر قریشی نے ایسی سر دھڑ کی بازی لگائی ہے کہ کسی کو جرأت نہ ہونے دی کہ وہ

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فعلن کے حصار سے باہر نکل سکے۔ اور اگر کسی نے اس حصار کو توڑنے کی جسارت کی تو حیدر قریشی اسی وقت کسی ''زولو چیف'' کی مانند تیر کمان تانے۔ خشمگیں نگاہوں سے اس کی جان کے اس طرح درپے ہو گئے کہ وہ زندگی بھر کے لیے یا تو ماہیا لکھنا چھوڑ گیا یا پھر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ہم ماہیا قبیلے کے سرخیل، سلطنتِ ماہیا کے بے تاج بادشاہ یعنی ''حیدر قریشی ماہیا ونش'' کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے ہر صنفِ ادب میں حرمتِ قلم کے امین بن کر، دید سے دیدہ ور تک کسی سے منافقت نہیں کی اور فکر و نظر کے ادراک و آ گہی کو پوری فکری سچائی کے ساتھ قلم کے سپرد کر دیا ہے اور یہ کام کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔

بقول جگر مراد آبادی:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

رضیہ بٹ اور وزیر آباد...میری یادوں کے آئینے میں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برمنگھم کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آ گہی'' کے زیر اہتمام اس سال جون میں میرے شعری کلیات ''خوشبو۔ گلاب۔ کانٹے'' کی رسم اجراء کی تقریب میں معروف علمی اور ادبی شخصیت طلعت سلیم نے اپنا تاثراتی مضمون پڑھتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہی کہ رضیہ بٹ، رضیہ فصیح احمد اور رضیہ سجاد ظہیر کے بعد اردو ادب کو چوتھی رضیہ مبارک ہو، ہماری دلی دعا ہے کہ اردو ادب کی چوتھی رضیہ یعنی رضیہ اسماعیل شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی پہلی تین رضیاؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قابل قدر اضافہ کرے۔

میں طلعت سلیم کی اس مماثلت پر کئی دنوں تک غور کر کے لطف لیتی رہی مگر چند ماہ بعد ہی رضیہ بٹ کی موت کی خبر نے ذہن کے دریچوں پر کچھ اس انداز سے دستک دی کہ یادوں کا کارواں مجھے کم و بیش چالیس برس پیچھے دریائے چناب کے کنارے پر واقع اس تاریخی شہر وزیر آباد میں لے گیا جہاں اپنے وقت کی مقبول ترین رومانی ناول نگار رضیہ بٹ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ساٹھ کی دہائی کے اختتامی سال تھے اور میں سیکنڈری اسکول ختم کرنے کے قریب تھی۔

وزیر آباد سے میری وابستگی کئی حوالوں سے ہے۔ اس شہر مردم خیز میں میری ننھیال تقسیم ہند سے قبل ہی رہائش پذیر تھی۔ بعد میں قیامِ پاکستان کے وقت میرے والدین مشرقی پنجاب (جالندھر) سے ہجرت کر کے اسی شہر کے نواح میں رہائش پذیر ہوئے جہاں ہم سب بہن بھائیوں نے جنم لیا۔

1963ء میں میرے والد گرامی جب برطانیہ تشریف لے آئے تو ہم سب اپنی ننھیال میں وزیرآباد آ کر رہنے لگے۔ یوں زندگی کے چند سال مجھے اس شہر بے مثال میں گذارنے کا موقع ملا۔ بعد میں بسلسلہ تعلیم اسلام آباد، لاہور، کراچی اور پھر انگلینڈ کی طرف رختِ سفر باندھا۔ اور 1981ء میں اس شہر میں اپنے خالہ زاد اسماعیل اعظم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی ایک پوری نسل رضیہ بٹ کے رومانی ناولوں کی گرفت میں رہی۔ یہ ان چند خوش نصیب ناول نگاروں میں سے تھیں جن کے ناول مارکیٹ میں آنے سے پہلے ہی ہفتوں بلکہ مہینوں تک بک ہو جایا کرتے تھے۔

جس زمانے میں رضیہ بٹ سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ شہرت کی انتہائی بلندیوں پر تھیں، ان کے ناولوں پر مبنی دو فلمیں نائلہ اور صاعقہ ریلیز ہو کر شہرت کے ریکارڈ قائم کر چکی تھیں۔ اس طرح سے رضیہ بٹ ایک ایسا نام تھا جس سے تقریباً ہر نسل کے لوگوں کو آگاہی تھی۔

رضیہ بٹ کی پیدائش راولپنڈی میں ہوئی مگر عمر عزیز کا بڑا حصہ انہوں نے شادی کے بعد پشاور میں گذارا۔ ان کی شادی تو سیالکوٹ میں ہوئی تھی مگر بعد میں ان کے سسرالی رشتے دار وزیرآباد منتقل ہو گئے۔ اس لحاظ سے رضیہ بٹ وزیرآباد کی بھی بہو تھیں۔ بعدازاں وزیرآباد میں میری سسرال ہونے کے باعث ہم میں اس حوالے سے بھی قدر مشترک قائم ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رضیہ بٹ اور میری سسرال ایک ہی محلے میں تھے۔ اور یہ وہی تاریخی محلّہ ہے جہاں کسی زمانے میں اردو زبان و ادب کے معروف قلمکار اور صحافی عطاء الحق قاسمی اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ قاسمی صاحب نے وزیرآباد کے حوالے سے اپنی یادداشتوں میں بھی اس محلے کا ذکر کیا ہے۔

قاسمی صاحب کی ہمشیرہ کی شادی بھی وزیرآباد میں ہوئی تھی جو کہ ہمارے محلے میں رہا کرتی تھیں بلکہ ہمارے اور ان کے گھر کی دیواریں سانجھی تھیں۔ اب تو قاسمی صاحب سے

سمدھیانہ ہو چکا ہے کیونکہ میری ماموں زاد بہن قاسمی صاحب کی بڑی بہو ہیں۔

اس محلے میں معروف شاعر، ادیب اور صحافی زاہد مسعود رہا کرتے تھے جو اب لاہور منتقل ہو چکے ہیں۔ ان کے والد سلیم چشتی درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وزیرآباد کی بزم اردو ادب کے روحِ رواں تھے اور تحریک پاکستان کے سرگرم رکن رہ چکے تھے۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ''بساطِ عجز'' کے نام سے 1993ء میں منظرعام پر آیا۔

زاہد مسعود کی اپنی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''شہر آئینہ''، ''شہر آشوب''، ''آدھے راستے میں'' کے علاوہ نثر میں ان کے کالموں کا مجموعہ ''کہا سنا معاف'' اور تنقیدی مجموعہ ''انیس ناگی۔ ناول نگار'' منظرعام پر آ چکے ہیں اور وہ اس وقت لاہور کی علمی و ادبی بساط پر ایک معتبر حوالہ ہیں۔

رضیہ بٹ سے پہلی ملاقات ان کے گھر پر اس وقت ہوئی جب وہ پشاور کو خیرباد کہہ کر نئی نئی وزیرآباد میں آ کر رہائش پذیر ہوئی تھیں۔ جس دن میں اپنی عزیز دوست (صغرا باجی) کے ہمراہ ان کے ہاں گئیں جو کہ رضیہ بٹ کے سسرالی محلے میں رہتی تھیں اور ان سے قرابت داری بھی تھی۔ وہ ابھی تک گھر کی سیٹنگ میں مصروف تھیں۔ سامان کے کئی بکس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ مگر لہجہ محبت بھرا۔ لبوں پر مسکان، بات کرنے کا ٹھہرا ٹھہرا سا انداز۔ مہمان نوازی میں پیش پیش۔ بڑی محبت سے ہمارے منع کرنے کے باوجود چائے بنا کر لائیں۔ اتنی قد آور شخصیت ہونے کے باوجود سادگی اور انکساری کی مورت تھیں خود پسندی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ تمام وقت گھر کی سیٹنگ، بچیوں کے اسکولوں اور کالجوں کی ہی باتیں کرتی رہیں، مگر لکھنے لکھانے یا فلموں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

مجھے یاد ہے صغرا باجی نے ان سے پوچھا تھا کہ ''بھابی اتنی مصروفیت میں لکھنے لکھانے کے لیے وقت کیسے نکال لیتی ہیں'' تو ان کا جواب صرف ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ اس وقت تک

ان کی بڑی بیٹی جسے وہ پیار سے نینو کہہ رہی تھیں، اس کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسری بیٹی روبی میری ہم عمر اور کلاس فیلو تھی جبکہ دوسری دو بیٹیاں چھوٹی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں سارا وقت رضیہ بٹ کو حیرت و استعجاب سے دیکھتی رہی اور اس کامیاب اور مقبول ترین ناول نگار اور عام سی گھریلو خاتون کا موازنہ کرتی رہی مگر اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ وقت کے سینے میں، قلم، کاغذ اور تخیل کی صورت میں کچھ امانتیں میرے لیے بھی محفوظ تھیں۔

رضیہ بٹ نے اپنی خودنوشت ''سلگتے لمحے'' کے نام سے لکھی جو کہ بے حد مقبول ہوئی اس کے بعد گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ مگر جب 1969ء میں اسلام آباد چلی گئیں تو کبھی کبھار وزیرآباد آنا ہوتا۔ پھر 1973ء میں انگلینڈ آ گئی۔ رضیہ بٹ بھی غالباً 1975ء تک وزیرآباد میں مقیم رہیں اور بعدازاں بیٹیوں کی شادیاں کر کے لاہور منتقل ہو گئیں۔

رضیہ بٹ کے ناول ''وحشی'' کا پڑھنا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ان کے سسر جو کہ آرمی سے ریٹائرڈ میجر تھے اور ہم انہیں ''باؤجی'' کہا کرتے تھے۔ اکثر ہمیں بڑے انہماک سے موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہوئے نظر آئے اور انہی میں رضیہ بٹ کے تازہ ترین ناول بھی شامل ہوتے تھے۔ رضیہ بٹ بطور احترام اپنے ہر ناول کی پہلی جلد اپنے سسر کو پیش کیا کرتی تھیں۔ اس دن بھی باؤجی بڑے گہرے مطالعے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ رضیہ بٹ کا تازہ ترین ناول ''وحشی'' ہے تو ہم باؤجی کے سر ہو گئے کہ ہمیں ناول چاہیے صرف ایک دن کے لیے ہی چاہے پڑھنے کے لیے دیں۔ میری دوست (صغرا باجی) عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں اور وہی باؤجی سے مذاکرات کرنے میں پہل کرتیں۔ ان کے زبردست مذاکرات کے صلے میں باؤجی نے ہمیں صرف ایک دن کے لیے ''وحشی'' ناول پڑھنے کے لیے دے دیا جسے ہم نے اسکول سے چھٹی کر کے، گرمیوں کی ساری دوپہر لگا کر، باری باری پڑھ کر ختم کیا اور حسب وعدہ دوسرے دن باؤجی کو ناول بڑے فاتحانہ انداز میں واپس کیا۔ باؤجی کا خیال تھا کہ ہم ناول پڑھ نہیں سکیں گے مگر وہ ہمیں بے یقینی کے انداز میں

دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ناول پڑھ لیا ہے کہ ویسے ہی شیخی بگھار رہی ہیں۔ اسی یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ڈوبتے ابھرتے باؤجی نے دوسرے دن فوجی انداز میں ہمارا ٹیسٹ لینے کا اعلان کر دیا۔ مگر ان کے خود ناول مکمل کرنے کے بعد......اور ہم ہنستے کھلکھلاتے ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ باؤجی کی بیٹھک سے باہر نکل آئے۔ ایک ہی دن میں ناول پڑھ لینے کی اس قدر خوشی تھی کہ ہم سب سہیلیوں کے سامنے اترا اترا کر اس کا یوں ذکر کرتے جیسے محمود غزنوی نے نہیں بلکہ ہم نے سومنات کا مندر فتح کیا ہو۔

اسی ناول پر بعد میں فلم ''پیاسا'' بنی۔ جس میں اداکار شاہد اور رانی نے کام کیا تھا۔ غالباً یہ اداکار شاہد کی پہلی ریلیز فلم تھی مگر فلم کا اختتام ناول سے قدرے مختلف تھا۔ اسی طرح نائلہ اور صاعقہ فلموں کے اختتام بھی ناولوں سے قدرے ہٹ کر تھے جس پر رضیہ بٹ اتنی مطمئن نہیں تھیں۔

وزیرآباد کی علمی، ادبی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی حیثیت مسلّم ہے۔ اس سرزمین نے بڑی بڑی نامور ہستیوں کو جنم دیا۔ جس کی قابلیت اور شہرت کا آفتاب اپنے اپنے ادوار میں نصف النہار پر رہا۔ ان باکمال، باذوق اور ادب نواز ہستیوں کی تفصیل بڑی طویل ہے جو یا تو اس شہرِ محترم خیز میں پیدا ہوئیں یا انہیں عمرِ عزیز کا کچھ حصہ اس خطۂ مردم خیز میں گذارنے کا موقع ملا۔ ایک زمانہ ان کے اسمائے گرامی سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ ناموں کا تبرکاً ذکر کرنا ضروری خیال کرتی ہوں۔ جن میں ظفر علی خان اور کرشن چندر ہیں۔

اس سرزمین کو شیخ القرآن، دانائے رموز و معرفت، شعلہ بیاں خطیب ابوالحائق محمد عبدالغفور ہزاروی رحمتہ اللہ علیہ جیسی فقید المثال ہستی کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف حاصل ہے۔ اسی سرزمین سے ''تحریک عید میلاد النبیؐ'' کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے وزیرآباد سے اٹھ کر برصغیر پاک و ہند کو اپنی نورانی لپیٹ میں لے لیا۔ آج اطرافِ عالم میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر جو شاندار جلسے، جلوس، آرائشی محرابیں اور تزئین شہر ہوتی ہے وہ اس تحریک سے قبل اس قدر زوروں پر نہ تھی بلکہ مسلمان ان ایام میں اپنے اپنے گھروں میں

انفرادی طور پر محافل ختم شریف پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ (از مفتی محمد عبدالشکور ہزاروی، 1989ء) میرے والد بھی ہزاروی صاحب کے مریدانِ خاص میں سے تھے اس کے علاوہ ہمارے خانوادے کے کئی افراد بشمول میری پرنانی اور ان کی بیٹی (بڑی خالہ) ان کے ہاتھ پر بیعت تھیں۔

عید میلاد النبیؐ ہر سال نہایت تزک واحتشام سے منائی جاتی تھی اور کئی روز تک میانی محلّہ کی وسیع وعریض مسجد میں درودوسلام کی روح پرور صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ عید میلاد النبیؐ کی تقریب میں پورے پاکستان سے اعلیٰ پائے کے نعت خوان حضرات تشریف لاتے تھے، انہی اجتماعات میں میں نے ممتاز نعت خواں اعظم چشتی کو سنا اور اس وقت ان کی تقریباً تمام نعتیں مجھے زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ ہزاروی صاحب کا سیرت النبیؐ کا ذکر، حضورؐ کی حیات طیبہ کا بیان اور اعظم چشتی کی عشق ومحبت میں ڈوبی ہوئی نعتیں، لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اشکوں، آنسوؤں اور آہوں کے نذرانے سرکارِ دوجہاںؐ کی خدمت اقدس میں پیش کیے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ایسے ہی موقع پر میری پڑنانی نے جوش عقیدت اور عشق رسالتؐ میں اپنے زیورات اتار کر خواتین کی گیلری میں مسجد کے صحن میں پھینک دیئے تھے کہ ''اور شان وشوکت سے مدحتِ رسولؐ کراؤ۔ اسباب کی پرواہ نہ کرو۔ حضورؐ کے غلام اور ان کی کنیزیں تن من دھن سے نثار ہونے کے لیے حاضر ہیں۔''

حضرت ہزاروی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک زمانے نے اکتساب علم کیا اور علم وفضیلت سے اپنی جھولیاں بھر بھر کر رخصت ہوئے۔ برطانیہ میں نور ٹی وی کے چیئرمین علامہ پیر علاؤالدین صدیقی رحمتہ اللہ علیہ، گدی نشین دربار عالیہ نہریاں شریف بھی ہزاروی صاحب سے تفسیر کا دور مکمل کر چکے ہیں۔ میرے والد گرامی جب 1963ء میں برطانیہ تشریف لائے تو اپنے مرشد کے پاپوش مبارک بھی ساتھ لیتے آئے اور اکثر انہیں آنکھوں سے لگا کر ان کی جدائی میں اشک بہاتے رہتے تھے مگر زندگی میں دوبارہ ملاقات دونوں کو نصیب نہ ہوئی۔ جن دنوں میرے والد گرامی پاکستان جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حضرت ہزاروی رحمتہ اللہ

علیہ فجر کی نماز کے بعد حسبِ معمول جی ٹی روڈ پر سیر کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔ رشد وہدایت کا یہ روشن آفتاب چشم زدن میں غروب ہو گیا۔ شہادت جیسی عظیم نعمت سے سرفراز ہو کر وزیر آباد میں ہی آسودۂ خاک ہو گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

''اردو ادب اور ڈرامہ دستک''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

آج تک یہی سنتے آئے ہیں کہ آرٹ جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا وہ زندگی کی ارفع و اعلیٰ قدروں کو ابھارنے میں اتنا ہی معاون و مددگار ثابت ہوگا جس میں ادب، ڈرامہ، مصوری اور فنِ موسیقی پیش پیش ہیں۔ تخلیقی کام انجام دینے والے لوگ ہمارے ہی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ مگر اپنی ذات کے علاوہ ان کی گرد و پیش کے ماحول پر بھی گہری نظر ہوتی ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ چیزوں کو ایک الگ انداز سے دیکھنا' معاشرتی ناہمواریوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کرنا اور اسے جذبے کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر لانا ہی انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے جذبے کی یہی سچائی جب ایک عام شخص کی سوچوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے صدیوں پرانے معاشرتی رویوں کو جھنجھوڑتی ہے تو بلاشبہ وہ شخص اپنی اس کوشش میں کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ اسی قسم کی صورت حال برطانیہ کی ممتاز افسانہ نگار شاہدہ احمد کے ڈرامہ دستک کو دیکھنے کے بعد وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تین ایکٹ کا یہ ڈرامہ جو کہ جسمانی طور پر معذور لوگوں کی سمت معاشرتی رویوں کو بے دردی سے بے نقاب کرتا ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو ہال سے پرنم آنکھوں کے بغیر اٹھنے نہیں دیتا۔ صدائے کشمیر کے بعد یہ ڈرامہ ان کی دوسری بہترین کاوش ہے اور بلاشبہ ادبی ڈراموں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اردو ادب میں اس سے قبل اس موضوع پر جسے عام طور پر لوگ ایک خشک موضوع سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی کوشش نہیں ہوتی ہے برطانیہ میں تخلیق ہونے والے ادب میں بلاشبہ اسے ایک بلند مقام حاصل ہوگا۔

200

گو کہ پاکستان اور بھارت کے بعد برطانیہ اب اردو کا تیسرا بڑا مرکز بن گیا ہے مگر یہ ستم ظریفی ہے کہ جب بھی اردو ادب کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کی ترویج و ترقی میں بیرون ملک تخلیق ہونے والے ادب کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر اس سے سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا جاتا ہے مگر کل کا نقاد اور مؤرخ جب برطانیہ میں اردو ادب کی تاریخ و تنقید مرتب کرے گا تو اردو ڈراموں میں دستک یقیناً صفِ اوّل کی کاوش شمار کیا جائے گا۔

کسی بھی تقریر و تحریر سے ڈرامہ ایک بہت طاقتور میڈیم ہے اور جبکہ لکھاری خود اس تحریر کا جیتا جاگتا کردار ہو تو اسے مؤثر طریقے سے پیش کرنے میں تمام مشکلات خود ہی راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ڈرامے کے میڈیم کے اتنے پر اثر ہونے کے باوجود برطانیہ میں بامقصد، اصلاحی، ڈرامے جو ایسے موضوعات کا احاطہ کریں جن پر بات کرنا بھی لوگ وقت کا زیاں سمجھتے ہیں اور جنہیں خالص ادبی ڈرامے کہا جا سکے نہیں لکھے گئے۔ ویسے بھی مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈرامہ تو زیادہ کمرشل طور پر ہی لیا گیا ہے جیسے ایک وقت میں اہل یورپ، اہل انگلستان اور ہندوستان میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلامی ممالک اور اسلامی تہذیب میں فنون لطیفہ کی نشو و نما اور ترقی کو وہ جگہ نہ مل سکی جو دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں ملی۔ اردو زبان نے گو کہ فارسی کی گود میں پرورش پائی مگر ڈرامہ کی صنف میں اردو کو فارسی سے بھی کوئی ایسی مثالیں یا نمونہ جات نہیں ملے جنہیں آگے بڑھایا جا سکتا۔

اردو ڈرامہ کا اگر ایک مختصر سا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو ڈرامے کا نقش اول لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کے دور میں لکھی جانے والی عشقیہ مثنوی افسانہ عشق ہے جسے رقص کے انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سید آغا حسن امانت نے 1853ء میں اندر سبھا امانت کے نام سے جو کتاب لکھی اسی سے باقاعدہ اردو ڈرامے کی ابتداء ہوئی۔ اور ڈرامے نے اپنے عروج کا دور بھی دیکھا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال، لکھنؤ کے نوابوں کی زبوں حالی اور انگریزوں کی حکمرانی نے

اردو ڈرامے کو بہت نقصان پہنچایا اور جنگ آزادی کے بعد تو سرمایہ دارانہ ذہنوں نے با قاعدہ تھیٹریکل کمپنیاں قائم کر کے اسے کمرشل کر دیا۔

اس دور کے نمائندہ ناموں اور ڈراموں میں آرام رونق، طالب احسن بے تاب اور آغا حشر کے نام نمایاں ہیں جبکہ ڈراموں میں دورنگی دنیا، لیل ونہار، دل فروش، حزن ناحق، چلتا پرزہ، قتل نظیر، فریب محبت اور زہری سانپ نے بہت شہرت حاصل کی۔

اردو ڈرامے میں آغا حشر صرف ایک نام ہی نہیں بلکہ انہیں ڈرامے کا ایک عہد کہا جاتا ہے جس نے ڈرامے کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا۔ ان کے ڈرامے، اگرچہ کمرشل مقاصد کے لیے لکھے گئے مگر ان ڈراموں کا معیار بہت بلند تھا جس میں ڈرامے کی تمام فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ جذبات کی بھرپور ترجمانی بھی ملتی تھی۔ ان کے کچھ ڈرامے طبع زاد تھے جبکہ کچھ دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوئے۔ جن میں رستم وسہراب، سیتابن باس اور بھیشم پرتگیہ۔ ایسے ڈرامے ہیں جس پر اردو تاریخ وادب ہمیشہ ناز کرے گی۔

آغا حشر ہی کے دور میں اور اس سے کچھ قبل مولانا محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، عبدالماجد دریا آبادی، ظفر علی خان، عابد حسن، ڈاکٹر اشتیاق قریشی، کلیم شجاع احمد اور سید امتیاز علی تاج نے بالترتیب اکبر، میوہ قلم، زود پشیمان، جنگ روس وجاپان، پردۂ غفلت، گناہ کی دیوار، باپ کا گناہ اور انار کلی جیسے ادبی ڈرامے لکھے۔ جن کا مقصد تجارتی نہیں بلکہ علم وادب کو فروغ دینا تھا۔ معاشرے کی بہت سی تلخ حقیقتوں کو ننگا کرنا تھا، تاکہ اصلاح احوال کا پہلو کھل سکے۔

1935ء میں برصغیر میں ریڈیو کی نشریات کے ساتھ ہی ریڈیو ڈرامے کا آغاز ہوا جس میں حکیم احمد شجاع، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر ناصر حسین، امتیاز علی تاج اور مرزا ادیب کے نام نمایاں ہیں۔

جہاں تک ادبی ڈراموں میں اصلاح احوال کا تعلق ہے تو دستک ڈرامے اپنی اس کاوش میں بے حد کامیاب ہے کہ اسی نے ناظرین کو شعوری اور لاشعوری سطح پر جھنجھوڑا ہے۔

صدیوں پرانے متعصب اور متعفن زدہ رویوں کو ہلا کر ناظرین کو سوچ اور فکر کی مثبت راہ دکھاتی ہے۔ تماشائی جب دو گھنٹے کا یہ ڈرامہ دیکھ کر تھیٹر سے باہر نکلتے ہیں تو واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ڈرامہ نویس نے اپنی تحریر اور عمدہ ہدایت کاری سے معذور لوگوں کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات پر بری طرح حملہ کر کے ان کے سب Defence توڑ دیئے ہیں۔ اور لاشعور میں معذور لوگوں کی طرف ان کی بے حسی، نفرت، تعصب اور غلط سوچ کو شعوری سطح پر لا کر پٹخ دیا گیا ہے۔ ان کے وہ جذبات جنہیں وہ کبھی شعوری طور پر چھپاتے تھے اور کبھی لاشعوری طور پر ظاہر کر دیتے تھے، وہ بے لباس ہو چکے ہیں۔ بھیگی آنکھوں اور پیشانی پر تفکر کی لکیریں لیے تماشائیوں کو ہال سے باہر جاتے دیکھا گیا ہے تو وہ ہے شاہدہ احمد کے ڈرامہ دستک کے بعد۔

یہ ڈرامہ لندن میں آدرش سوسائٹی اور برمنگھم میں آگہی کے پلیٹ فارم کے علاوہ برطانیہ کے دوسرے شہروں میں بھی پیش کیا جا رہا ہے اور کیا جا چکا ہے۔ کسی ڈرامے کا بنیادی اجزا میں پلاٹ، ڈرامے کے کردار، مکالمہ نگاری، ذہنی اور نفسیاتی الجھن یا کشمکش کے علاوہ اس کا نقطۂ عروج یعنی کلائمکس اور اس کا اختتام ہوتا ہے۔ دستک ڈرامے کا پلاٹ اتنا مضبوط اور مربوط ہے کہ دو گھنٹے کا یہ مسلسل ڈرامہ گذرنے کا ناظرین کو احساس ہی نہیں ہوتا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ ''بس ڈرامہ ختم ہو گیا۔''

ڈرامے کی زبان نہ بہت ثقیل ہے نہ سہل۔ اردو اور انگریزی کے امتزاج سے بولے جانے والے ڈائیلاگ کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی حالت کی بہت اچھی طرح غمازی کرتے ہیں۔ زبان میں شائستگی اور تہذیب اور معاشرتی اخلاقی قدروں کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ ایک جملہ بھی طبیعت پر ناگوار نہیں گذرتا۔ ڈرامے میں فلیش بیک، لائٹس اور سٹیج کی نہایت ماڈرن تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے جو کہ عام طور پر اردو ڈراموں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔

دستک ڈرامہ زندہ کرداروں کی بولتی ہوئی کہانی ہے جس میں ایک جسمانی طور پر

معذورنوجوان لڑکی کے جذبات واحساسات کی بھرپورعکاسی کی گئی ہے۔شادی کے قابل یہ لڑکی جس طرح اپنے ڈائیلاگ اور چہرے کی حرکات وسکنات سے اپنی جذباتی اور نفسیاتی تشویش کا اظہار کرتی ہے وہ شاہدہ احمد ہی کی تحریروں کا خاصہ ہے۔

شاہدہ احمد خود اپنی تحریروں کے بارے میں کہتی ہیں کہ میرے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔مگر یہ وہ عورت ہے جس کے بارے میں منٹو نے کہا تھا کہ:

''چکی پیسنے والی عورت، جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سوجاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہوسکتی۔ میں گھریلو عورتوں کی ستیہ کاریوں، ان کی صحت اور نفاست کو نظرانداز کرجاتا ہوں۔''

مگر شاہدہ احمد کہتی ہیں کہ:

''یہی چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کی مشقت کے بعد رات کو اطمینان سے سوجاتی ہے،اس کے ظاہری اطمینان کے پیچھے زندگی کی کتنی ننگی حقیقتیں اسے گندم کے دانوں کی طرح پیستی ہیں،اس کے نصیب کے دکھ، اس کے مقدر کے عذاب ہی میرا موضوع ہیں، گھروں میں بجی اور کھیت کھلیانوں میں رُلتی ہوئی عورت ہی میری اکثر کہانیوں کا موضوع ہے۔''

دستک ڈرامہ دیکھنے کے بعد شاہدہ احمد کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ برمنگھم میں یہ ڈرامہ پیش کرنے کے بعد ایک سوشل ورکر کے تاثرات یہ تھے کہ ''میں کافی عرصہ سے سوشل ورک کی فیلڈ میں ہوں مگر جسمانی طور پر معذور لوگوں کے بارے میں میں نے احساس وجذبات کی اس سطح پر کم ہی سوچا ہے۔اس ڈرامے نے میرے اندر سوچ کا ایک نیا زاویہ پیدا کیا ہے جو کہ یقیناً میرے لیے ذاتی طور پر اور میرے پروفیشن میں بے حد مددگار ثابت ہوگا۔''

ایک عام گھریلو خاتون کا کہنا تھا کہ ''دستک ڈرامہ دیکھنے کے بعد میری سوچ اور رویے میں معذور لوگوں کی طرف واضح تبدیلی آتی ہے جن لوگوں کو میں پہلے ہمدردی کے ساتھ ترس کھا کر دیکھا کرتی تھی اب انہیں اپنے ہی جیسا انسان سمجھنے لگی ہوں، بلکہ یہ لوگ ہم سے بہت بہتر ہیں کہ ہمارے غیر منصفانہ سلوک کے باوجود ہمت نہیں ہارتے اور قدرت کی آزمائش میں پورا اترتے ہیں۔ایک اور نہایت معتبر علمی اور ادبی شخصیت جناب محمود ہاشمی جو کہ میرے بے حد اصرار پر یہ ڈرامہ دیکھنے کے لیے آئے،اپنی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے وہ تقریبات میں نہیں جاتے ان کا کہنا تھا کہ:

''میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سین دیکھنے کے بعد اٹھ جاؤں گا مگر ڈرامے نے مجھے اس طرح جکڑ لیا کہ مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔گو کہ مجھے بیٹھنے میں کافی تکلیف ہورہی تھی مگر میں نے خود سے کہا کہ اگر آج یہ ڈرامہ دیکھتے ہوئے میں مر بھی جاؤں تو شہید کہلاؤں گا۔''

دستک کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک عام ناظر سے لیکر ایک پروفیشنل تک اور پھر ایک اعلیٰ ذہنی سطح کی علمی وادبی شخصیت کے تاثرات اتنے مثبت ہیں اس بھرپور کامیابی پر میں ذاتی طور پر اور آگہی تنظیم کی جانب سے اور ڈرامہ دیکھنے والے ہر قسم کے ناظرین کی طرف سے شاہدہ احمد اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتی ہوں ان الفاظ میں کہ۔

تھوں میں کیا ہے دریا کی روانی بول پڑتی ہے
اگر کردار زندہ ہوں کہانی بول پڑتی ہے

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طرح کے بامقصد ادبی ڈرامے لکھے جائیں جس سے برطانیہ میں اردو زبان وادب کو فروغ ملے گا بلکہ نہایت مؤثر طریقے سے معاشرتی مسائل کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جاسکے گی۔

یادوں کے چراغ......بیادِ رفتگاں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

اکیسویں صدی کے چودھویں برس کا تھکا ماندہ سورج...... گردشِ لیل ونہار کی تکمیل میں سرگرداں...... کچھ ہی دنوں میں وقت کی بے کراں، وسعتوں میں گم ہونے کو ہے۔

ہمیشہ کی طرح ایک گھمبیر سی اداسی سال کے آخری ایام میں دل و ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کئی چہرے، کئی پیکر...... کئی باتیں، کئی یادیں، دامن دل کو کھینچتے ہوئے جیسے کہہ رہی ہوں۔

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

آج سے اٹھارہ برس قبل 1997ء میں جب ہم نے برمنگھم میں ادبی اور ثقافتی تنظیم آگہی کی بنیاد رکھی تو برطانیہ بھر میں پھیلی ہوئی قلم کار خواتین سے رابطے کا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں تھا۔ رابطوں میں مسلسل دشواری کے پیشِ نظر یہ طے پایا کہ خواتین اردو رائٹرز کی ایک نیشنل ڈائریکٹری اور ویب سائٹ ترتیب دی جائے تاکہ نہ صرف آگہی تنظیم خواتین سے رابطے کر سکے بلکہ خواتین کو آپس میں رابطوں میں بھی آسانی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں آگہی کے پلیٹ فارم سے متعارف کروایا جائے اور ان کی ادبی و تخلیقی کاوشوں کو عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ اس کام میں تقریباً دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ ڈائریکٹری اور ویب سائٹ میں شمولیت کے حوالے سے پچاس سے زائد قلمکار خواتین سے رابطے ہوئے جو شاعری اور نثر میں اپنے تخلیقی جوہر دکھا رہی تھیں۔ ایک خوشگوار حیرت تھی کہ کس طرح سے یہ خواتین نامساعد حالات، وقت کی کمی، ابلاغ کے مسائل کے باوجود دیگر رشتوں کے درمیان، قلم،

کاغذ اور الفاظ سے ہی رشتہ نباہ رہی ہیں۔

ڈائریکٹری اور ویب سائٹ کی ترتیب و تدوین کے دوران بھی خواتین سے گھنٹوں بات چیت ہوتی رہی اور کچھ سے تو آنے والے دنوں میں یہ ابتدائی تعلق ایک مضبوط دوستی کے رشتے میں تبدیل ہو گیا جو کہ آج بھی برقرار ہے۔

اردو اور انگریزی میں شائع شدہ ''برطانیہ میں اردو قلمکار خواتین'' کی نیشنل ڈائریکٹری کی رسم اجرا کی تقریب 10 اپریل 1999ء میں منعقد ہوئی۔ جن کی صدارت انسانی حقوق کے بین الاقوامی شہرت یافتہ کارکن انصار برنی نے کی۔ یہ خواتین قلم کار برمنگھم، لندن، نوٹنگھم، بریڈفورڈ، کاونٹری، گلاسگو، مانچسٹر، اولڈہم اور ویلز میں مقیم تھیں ان میں لندن سے امیر زہرہ رضوی، انور نسرین، بانو ارشد، پروین لاشاری چاندکرن، حمیدہ معین رضوی، سحاب قزلباش، سعیدہ شریف، شاہدہ احمد، سلیم عالم، شمسہ مسعود، مغیہ صدیقی، بدر نازش، فیروزہ جعفر، ڈاکٹر فیروز مکرجی، زہرہ نسیم، عذرا عباس، محسنہ جیدانی، نجمہ عثمان، ماہ پارہ صفدر، عطیہ خان، صدیقہ شبنم، شوکت بزجس مرزا، صباحت مشتاق، سیما جبار، پاکیزہ بیگ، نور جہاں نوری اور شاہین صدیقی شامل تھیں۔

برمنگھم سے رضیہ اسماعیل، طلعت سلیم، سلطانہ مہر، نسیم اختر، شبانہ یوسف، یاسمین حبیب اور طاہرہ صفی تھیں جبکہ بریڈفورڈ سے نجمہ انصار، نزہت محمود نزہت، صبا نصرت، ڈاکٹر سکندر سالم اور ستارہ لطیف خانم سے رابطے ہوئے۔ کاونٹری سے فوزیہ ناہید کاظمی، ویلز سے صبیحہ علوی اور شمع چودھری جبکہ مانچسٹر سے نغمانہ کنول اور یاسمین کومل تھیں۔ گلوسگو سے راحت زاہد اور راجو کوثر جبکہ نوٹنگھم سے فرزانہ خان، سعدیہ سیٹھی، شمیم انصاری، زینب حسن، مسرت طارق اور نیلمانہ ناصر سے سیر حاصل گفتگو ہوتی رہی۔ بہت سی خواتین نے آگہی کی لائبریری کے لئے اپنی تصنیفات عطیہ کیں۔ گئے برسوں میں ڈائریکٹری اور ویب سائٹ میں شامل بہت سی خواتین ہم سے بچھڑ چکی ہیں جب بھی ان کی رحلت کی جانکاہ خبر ملتی ہے تو ڈائریکٹری میں سے ان کا نام کاٹتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ کانپ جاتا ہے۔ ہم سے بچھڑ

جانے والی خواتین ڈاکٹر فیروز مکرجی، سحاب قزلباش، نسرین انور، عطیہ خان، صفیہ صدیقی، نزہت محمود نزہت، نجمہ انصار، فیروزہ جعفر، بدر نازش اور طاہرہ صفی ہیں۔ ان سب کی باتیں ان کی یادیں ان کے لکھے ہوئے حروف آج انسانی پیکر میں ڈھل کر جیسے باری باری سامنے آ کر دل کو عمیق اداسیوں کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں۔ ذہن کئی برس پیچھے لوٹ جاتا ہے۔
ڈاکٹر فیروز مکرجی کا مہربان چہرہ سامنے آجاتا ہے جو برمنگھم میں آگہی کے زیر انتظام گھریلو تشدد کے موضوع پر منعقدہ کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لائیں تو پنڈت رتن ناتھ سرشار پر لکھا ہوا اپنا ڈاکٹریٹ کا انگریزی مقالہ جو کہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا میرے لیے ساتھ لیتی آئیں۔ اس کے علاوہ خواتین کے لیے جاری کیے جانے والے رسالے ''جنبشِ نو'' جس کی وہ خود مدیرہ تھیں۔ دو کاپیاں میرے لے لیکر آئیں سحاب قزلباش سے فون پر کئی مرتبہ گفتگو ہوئی، زیادہ طویل گفتگو کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ سانس کی تکلیف نے بات کرنی مشکل کی ہوئی تھی پھر بھی نہایت شفقت سے میری بات سنتی رہیں اور ویب سائٹ کے لیے اپنی دو نظمیں ''دو جسم اور ''لینڈ لیڈی'' ارسال کیں۔

فیروزہ جعفر نے اپنی دو نظمیں ''خون کا سرطان'' اور ''مقدس کہانی'' ویب سائٹ کے لیے عطیہ کیں۔

بدر نازش سے کئی مرتبہ بات چیت ضرور ہوئی مگر ان کی کوئی شعری تخلیق ویب سائٹ کے لیے نہ مل سکی انور نسرین سے ملاقات لندن میں اس وقت ہوئی جب شاہدہ احمد نے میری کتابوں کی رسم اجرا کی تقریب منعقد کی۔ بہت خلوص سے ملیں اور میری تحریروں کو سراہتی رہیں۔

بریڈفورڈ سے نزہت محمود نزہت خواتین کے مشاعرے میں شرکت کے لئے بطور خاص تشریف لائیں۔ ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ، شائستہ لب و لہجہ ان کی پہچان تھا، اپنی دو شعری تخلیقات '' کھلتے سے گلاب'' اور ''مہکتے سے گلاب'' آگہی لائبریری کے لیے تحفے میں دے گئیں۔ بریڈفورڈ سے ہی نجمہ انصار جو پہلے نجمہ خان کہلاتی تھیں اور بعد میں لندن

شفٹ ہو گئیں۔ ان سے رابطے رہے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''زخمۂ احساس'' ان کی زندگی میں ہی منصۂ شہود پر آ گیا تھا۔ اس سال ہم سے بچھڑ جانے والی خواتین صفیہ صدیقی، طاہرہ صفی اور عطیہ خان ہیں۔ صفیہ صدیقی بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ ان کے افسانے عصری شعور سے مالا مال تھے۔ برطانیہ کی سماجی زندگی اور ہجرت کی صعوبتیں اٹھاتے اٹھتے نڈھال ہو جانے والی خواتین کے دکھ، ٹوٹتی ہوئی اخلاقی قدریں ان کے افسانوں کا خاص موضوع تھے۔

آگہی کی ڈائریکٹری اور ویب سائٹ کے لیے ان سے رابطوں کا سلسلہ بہت دراز رہا۔ اپنی بہت سی تخلیقات اس میں سے انہوں نے پہلی نسل کا گناہ، چھوٹی سی بات اور اپنے افساوں کا انگریزی ترجمہ گولڈن کیج آگہی کی لائبریری کے لیے روانہ کئے۔ میری شعری اور نثری تخلیقات پر اپنے تاثرات لکھے جو کہ میری کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' میں شامل ہیں
عطیہ خان ایک نہایت منجھی ہوئی قلم کار تھیں۔ انشائیہ بہت اچھا لکھتی تھیں۔ ان کا انشائیہ چار پائی ''مجھے بے حد پسند تھا جس کا اظہار میں نے کئی بار ان سے کیا۔ اپنے افسانوں کا مجموعہ '' تجربات و حوارث'' اور گلہائے رنگا رنگ آگہی کی لائبریری کے لیے بہت خلوص سے روانہ کئے جو آج بھی بک شیلف کی زینت ہیں۔ طاہرا صفی، دھیمے لہجے کی نہایت پر اثر شاعرہ اس سال اکتوبر میں برمنگھم میں انتقال کر گئیں جس سے برمنگھم کے ادبی حلقے سوگوار ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ان کی زندگی میں ہی آ گیا تھا مگر رسم اجرا کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ راہی ملک دم ہو گئیں ان کے یہ اشعار مجھے بے حد پسند تھے۔

اس قدر چاہو نہ اس کو وہ خدا ہو جائے گا
دیکھنا اک روز وہ تم سے جدا ہو جائے گا
لمحہ بھر کی قربتیں یہ کاروان رنگ و بو
ہوش میں آنے تلک سب کچھ ہوا ہو جائے گا

مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سے بچھڑ جانے والی قلم کار خواتین نے قلم، کاغذ

اورالفاظ سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔تخلیق کا تعلق دوسرے جہاں میں بھی برقرار ہے۔یوں لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے چھوڑے ہوئے لفظ ہمارے ہونے کی گواہی دیتے رہیں گے۔ہم انمٹ ہیں،ہم کبھی نہیں مرسکتے کیونکہ تخلیق کار مر بھی جائے تو اس کی تخلیق زندہ رہتی ہے۔آوازوں کی بازگشت ہمیشہ خلا میں موجود رہتی ہے۔الفاظ کبھی نہیں مرتے۔لفظوں کی جھنکار ہمیشہ سنائی دیتی ہے۔حرف وصوت کا تعلق ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند کرے اور ہم سب کو ان کے لیے کلمہ خیر کہنے کی توفیق عطا کرے۔(آمین)

اجازت،اپنے ان اشعار کے ساتھ۔

تری یادوں کا جو اک دیپ جلا ہوتا ہے
شاخ پر جیسے کوئی پھول کھلا ہوتا ہے

روح یوں پھاند گئی جسم کی دیواروں کو
جیسے پنچھی، کوئی پنجرے سے رہا ہوتا ہے

شخصیت کی تعمیر میں زبان کی اہمیت

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

میں تقریباً پچاس برس سے برطانیہ میں مقیم ہوں۔سوشل ورک میرا پروفیشن ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا نصب العین بھی ہے۔برطانیہ میں اردو زبان وادب کے حوالے سے جتنی سرگرمیاں پچھلی دو ہائیوں میں دیکھنے اور سننے میں آئی ہیں یہ صورت حال اس سے پہلے نہیں تھی۔پاکستان اور بھارت سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے والوں کے لیے اردو روزمرہ کی زبان تھی لیکن برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچوں کے لیے رابطے کی زبان انگریزی ہی ٹھہری جہاں تو گھر میں عام بول چال اردو زبان ہی رہی وہاں تو خیریت گزری۔لیکن جنہوں نے انگریزی کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا وہاں والدین کا تو شاید اتنا نقصان نہیں ہوا لیکن ان کے زیرسایہ پرورش پانے والے بچے اپنی زبان سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔

زبان صرف رابطے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس زبان کے لفظوں میں کسی قوم کی تہذیبی، لسانی، معاشرتی اور ثقافتی قدریں بھی بسیرا کرتی ہیں۔اس قوم کے رہنے سہنے کا ڈھنگ، اٹھنا بیٹھنا، محبت، رواداری، لحاظ، احترام، شرم وحیا کے پیمانے صرف اپنی زبان میں ہی صحیح طرح جانچے جاسکتے ہیں مگر جس زبان میں بڑوں اور بچوں کو you سے مخاطب کر کے ہی کام چلا لیا جائے وہاں اپنی زبان سے ناواقفیت اور دوری تہذیب وثقافت سے دوری کا سبب بھی بن جاتی ہے۔اپنی زبان سے نابلد برطانیہ میں پروان چڑھنے والی نسل کا اس وقت سب سے بڑا المیہ زبان سے دوری کے نتیجے میں اپنے تہذیب وتمدن سے دوری

بھی ہے۔ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل والدین کا مغربی بودوباش کی طرف جھکاؤ ان
کے دل کی تسلی کے لیے انہیں نام نہاد ''ایلیٹ کلاس'' کا درجہ تو دے سکتا ہے۔لیکن ماں باپ
کی نقالی میں بچوں کے منہ میں دوسروں کی زبان ڈال کر بچے جو نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ
والدین اس زیاں کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ انسان کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی
ہے کہ وہ اپنی ماں بولی سے ہی نا آشنا ہو جائے۔ زبان ہماری شناخت ہے۔ہمیں دوسروں
سے ممتاز کرتی ہے۔ ہماری پہچان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اپنی زبان گم کر کے ہم اپنی
شناخت بھی کھو بیٹھتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

میں بہت سے ایسے گھرانوں سے ذاتی طور پر واقف ہوں جہاں بچے انگریزی کے سوا
اور کوئی زبان نہیں جانتے، حالانکہ یہاں کی انگریز کمیونٹی بھی مادری زبان کی اہمیت کو پوری
طرح سمجھتی ہے۔اس لیے آج برطانیہ میں اردو زبان میں جی سی ایس ای اور اے لیول کی
تعلیم دی جارہی ہے۔اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے مختلف قسم کے فنڈز مہیا کئے
جاتے ہیں تاکہ وطن سے دور بیٹھے ہوئے لوگ بالکل ہی غریب الوطن نہ ہو جائیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھانے کی طرف سنجیدگی
سے توجہ دیں۔ اگر مالی وسائل اجازت دیں تو اپنے ملکوں سے ان کا رابطہ بھی برقرار رکھا
جائے تاکہ انہیں زبان کو صحیح طور پر بولنے، سمجھنے اور اپنی تہذیب وثقافت کے حوالے سے
جانچنے اور پرکھنے کا موقع مل سکے۔ان کا یہ گراں قدر تجربہ نہ صرف ان کی متوازن شخصیت کی
تعمیر میں اہم کردار ادا کرے گا بلکہ وہ اپنے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی ورثوں پر شرمندہ ہونے کی
بجائے فخر محسوس کریں گے وگرنہ یہ صورت حال ہوگی کہ

''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم''

''معصوم بچوں کے خلاف جارحیت کی روک تھام'' کا عالمی دن

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

میرے خیال میں تاریخ کی گواہی سے زیادہ معتبر گواہی اور کوئی نہیں ہوسکتی اور
صدیوں پر محیط انسانی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات اس بات کی
گواہی چیخ چیخ کر دے رہے ہیں کہ طاقت وروں نے اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کرتے
ہوئے کمزوروں کے حقوق کو پامال کیا ہے۔ طاقت، دولت اور اختیارات کے نشے میں
وحشت و بربریت کی ایسی ایسی داستانیں رقم کی ہیں کہ خود وحشت کو بھی وحشت ہونے لگتی
ہے۔

صدیوں پہلے کا ''غیر مہذب انسان'' پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جانوروں کا شکار
کیا کرتا تھا مگر صدیوں بعد آج کا ''مہذب انسان'' اپنے طمع، لالچ اور ہوس کی آتش کو سرد
کرنے کے لیے انسانوں کا شکار کر رہا ہے۔تہذیب وتمدن کی ترقی کے خمار میں لڑکھڑاتا ہوا
انسان آج خود جانور بن چکا ہے۔طاقت کے اس منہ زور سیلاب کا مظاہرہ کبھی عالمی سطح پر نظر
آتا ہے تو کبھی ہماری ذاتی اور گھریلو زندگیوں میں،صرف کینوس بدلتے ہیں،کبھی چھوٹے تو
کبھی بڑے،ظلم وجبر کی داستانوں کے کردار اور حوالے بدل جاتے ہیں مگر ظلم، ناانصافی، زور
زبردستی اور استحصال طاقت کے دھاگے میں پروئے ہوئے وہ نوکیلے پتھر ہیں جو کمزور اور
بے بس انسانوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا ہے۔جس طرح ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ
پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے کبھی حوصلہ مند افراد تو

کبھی ادارے اور تنظیمیں سینہ سپر ہو جاتے ہیں تا کہ معاشرے کے کمزور اور پس ماندہ طبقات میں اپنے اپنے حقوق کی تنہا جنگ لڑنے والے افراد اور گروہوں کی ناروا حالت اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے عوام الناس میں مناسب حد تک شعور و آگہی پیدا ہو۔

اس مقصد کے پیشِ نظر اقوام متحدہ اور اس کے بہت سے ذیلی ادارے کئی عالمی دنوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ مثلاً خواتین کا عالمی دن، معذوروں کا عالمی دن، مزدوروں اور بوڑھوں کا عالمی دن وغیرہ وغیرہ۔ مگر بچوں اور نوجوانوں کے حوالے سے ایک نہیں بلکہ تین مختلف عالمی دنوں کو منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں اگست کے مہینے میں نوجوان کا عالمی دن، نومبر میں بچوں کا عالمی دن اور 4 جون کو دنیا بھر کے ''معصوم بچوں کے خلاف جارحیت کے خاتمے'' کا عالمی دن نہایت جوش و جذبے سے منایا جاتا ہے۔

بچے قدرت کا بہترین عطیہ ہیں۔ دنیا میں آنے والا ہر نیا بچہ یہ امید لیکر آتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہے۔ بچے ہماری امید، ہمارا مستقبل ہماری آنکھوں کی روشنی اور دل کی ٹھنڈک ہیں۔ بچوں کے بغیر گھر ایک گھر نہیں بلکہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ دس بالغ افراد مل کر بھی ایک بچے کی کمی پوری نہیں کر سکتے۔ بچوں کے معصوم قہقہوں اور دل آویز ہنسی، معصوم شرارتوں اور بھولی بھالی باتوں سے محروم گھروں کی تاریکی میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو اولاد سے محروم والدین کے چہروں پر لکھی ہوئی تحریریں ہزاروں کہانیاں سنا رہی ہونگی۔

بچے جہاں ہماری خوشیوں کا منبع میں وہیں یہ اپنی جسمانی، ذہنی اور جذباتی نشو و نما کے لیے ہمارے محتاج بھی ہیں۔ بالغ انسانوں پر مکمل انحصار کرنے والی اس کمزور اور معصوم مخلوق کے خلاف کسی قسم کا غلط اور منفی رویہ یا سلوک بے حد تشویش ناک ہے کیونکہ بچپن کے اچھے یا برے تجربات و مشاہدات ہی انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے اس کمزور اور بے بس طبقے کے خلاف ظلم، زیادتی اور جارحیت ایک لمحہ فکریہ ہے کیونکہ بچے کسی ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے اور اگر کبھی کسی سے حال دل کہہ

بھی دیں تو اکثر و بیشتر ہم بچوں کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے یعنی دوسرے لفظوں میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف عملی طور پر کچھ کرنے کے لیے ہم متعدی سے آگے نہیں بڑھتے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو پھر بھی ایسے ادارے اور تنظیمیں موجود ہیں جو بچوں کی بہبود کے لیے سرگرم ہیں مگر ان ممالک میں کئی حکومتی اور رضا کارانہ اداروں کی موجوگی کے باوجود بچے نہایت برے حالات اور سلوک کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو بچوں کی بہبود کا کوئی مؤثر نظام نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں بچوں سے اچھا سلوک اور ان کے حقوق کی حفاظت ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہی رہ جاتا ہے اور جس کسی میں کچھ شرافت، نیکی اور خدا ترسی ہوگی۔ وہ بچوں سے اچھا سلوک کرے گا اور اس کے برعکس بچے بس حالات کے بے رحم تھپیڑوں کی زد میں رہیں گے۔ وقت کا سیل رواں انہیں کیسے اور کہاں اٹھا کر پھینکتا ہے وہ کن جسمانی، جذباتی، ذہنی اور نفسیاتی اذیتوں سے گزرتے ہیں اس کا حساب رکھنا مشکل ہے۔

بچوں کے خلاف جارحیت کی روک تھام اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان بچوں کو ہی ہمارے سماجی ڈھانچے کے تانے بانے بننے ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی مثبت سوچ صحت مند معاشرتی رویے، ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں'' بیمار جسم و جاں اور ادھوری شخصیتیں صرف بیمار اور ادھورے معاشرے ہی پیدا کرتے ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے خلاف جارحانہ رویے کا مطلب کیا ہے اور اس کا اطلاق کن صورتوں اور حالات میں ہوتا ہے؟

جارحیت کو انگریزی میں ایگریشن (Aggression) اور جارحانہ رویے کو ایگریسوایٹی چیوڈ (Aggressive attitude) کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً زبانی اور لفظی طور پر غیض و غضب اور غصے یا ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن اگر فریق مخالف کا یہ زبانی غصہ کنٹرول سے باہر ہو جائے جو کہ اکثر صورتوں میں ہوتا ہے تو یہ تشدد یعنی وائلنس (Violence) کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جارح شخص صرف زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں رہتا

بلکہ طاقت کا جسمانی مظاہرہ بھی کرنے لگتا ہے کیونکہ یہ صرف ایک بالغ اور بچے کے درمیان کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ ایک طاقت ور اور کمزور کے درمیان معرکہ آرائی بن جاتی ہے جس میں بچہ ہر صورت میں ایک کمزور اور بے بس فریق ہے جسے جس طرح سے کوئی چاہے اُکھاڑ پچھاڑ دے۔ اس لیے جارحیت اور تشدد کو ایک دوسرے سے حتمی طور پر الگ الگ کر کے دیکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جہاں پر جارحیت ہوگی وہاں تشدد ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

بچوں کے ساتھ جارحیت کے ارتکاب کی کئی صورتیں ہیں۔ یہ جارحیت بچوں کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں بھی ہو سکتی ہے اور گھر سے باہر بھی۔ گھر کی چار دیواری میں ہونے والی جارحیت کی سب سے زیادہ عام شکل گھروں میں والدین کے درمیان لڑائی جھگڑا، مار پیٹ یا تشدد کی دیگر صورتیں ہیں۔ اس گھریلو تشدد کو ہم ڈومسٹیک وائلنس کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ گھروں میں ماؤں کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک بچوں کی جسمانی، ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور معاشرتی نشوونما پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے اسے بچوں کے ساتھ جارحیت کے زمرے میں ہی شمار کیا جائے گا۔ ایسے گھرانوں میں بچے اکثر و بیشتر جسمانی زدوکوب کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے بچے کی جسمانی، ذہنی اور تعلیمی اور جذباتی ضروریات کو پورا نہ کرنا یا مکمل طور پر نظر انداز کرنا جارحیت کی ہی شکل ہے اس کے علاوہ گھروں میں بچوں کے جارحانہ اقدامات اور رویوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی لڑائی جھگڑے کی عادت کو برا بھلا کہنے اور سرزنش کرنے کی بجائے اسے سراہنا ان کی آئندہ زندگی میں بہت سی مشکلات کھڑی کر دیتا ہے۔ اس قسم کے حالات اور ماحول میں پروان چڑھنے والے بچوں میں تضاد، کشمکش، بدمزاجی، چڑچڑاپن، لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، بدزبانی اور تشدد ایک عام سی بات بن جاتا ہے جو آہستہ آہستہ بچے کی فطرت کا حصہ بن جاتا ہے اور مزید ذاتی اور سماجی برائیوں کے دروازے کھول دیتا ہے...... کسی نے سچ کہا ہے کہ ایسے گھروں میں پروان چڑھنے والے بچے بڑے نہیں ہوتے۔ گھروں میں بچوں کے ساتھ جارحیت کی ایک

اور شکل بچے میں کسی قسم کا ڈسپلن پیدا نہ کرنا بھی ہے یہ ڈسپلن روزمرہ کے معمولات کے علاوہ تعلیمی معاملات میں رکھنا پڑتا ہے اس کے علاوہ تفریح کے نام پر بچوں کو جرائم، تشدد، قتل و غارت اور لڑائی جھگڑے سے بھرپور ٹیلی ویژن پروگرام یا فلموں کا دیکھنا دکھانا بھی بچوں کے خلاف جارحیت میں شمار ہوگا۔

گھر کی چار دیواری سے باہر نکلیں تو بچوں کے لیے قدم قدم پر گہری کھائیاں منہ کھولے ہوئے ہیں جن میں سرفہرست بچوں کو ڈرگز یعنی نشے کی لت لگانا یا انہیں نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت میں ملوث کرنا اور دیگر جرائم کی ترغیب دینا اور مجرمانہ حرکات کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرنا۔ بچوں کے ساتھ جنسی تشدد روا رکھنا۔ آبروریزی کرنا، بھیک منگوانا، بچوں کو اپنی تفریح طبع کے لیے یعنی کھیلوں اور سرکس وغیرہ کے لیے استعمال کرنا۔ بچوں کو اغوا کرنا، جبری مشقت کروانا، جسے بانڈڈ اور چائلڈ لیبر کہا جاتا ہے یہ سب بچوں کے خلاف جارحیت کی شکلیں ہیں۔

غرضیکہ بچوں کے ساتھ کوئی بھی ایسا ناروا سلوک یا رویہ جو ان کی مثبت شخصیت کی تعمیر میں رکاوٹ بنے۔ ان کو ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر نقصان پہنچائے اور اس کی بحیثیت فرد صلاحیتوں کے پروان چڑھانے اور اس معاشرے کا ایک مفید شہری بننے کی راہ میں رکاوٹ ہو جارحیت اور تشدد کے زمرے میں آئے گا۔

اسلام دین فطرت ہے اور بشری کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں رب العزت نے سب انسانوں کے حقوق وفرائض کی حدود میں مقرر کی ہیں تا کہ کسی بھی شخص کے بنیادی حقوق غصب نہ کئے جا سکیں۔ اس سلسلے میں پہلا حق انسان کو ''عزت نفس'' کا حق دیا گیا ہے۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ کسی سے عزت نفس چھین لو اس کے پاس کچھ باقی نہیں بچے گا۔

عزت نفس جسے انگریزی میں سیلف ریسپکٹ کہتے ہیں فرد کی صحت مند ذہنی جذباتی اور نفسیاتی نشوونما کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ انسان کا یہ بنیادی حق کبھی شعوری تو کبھی

لاشعوری طور پر پامال کیا جاتا رہا ہے۔ بچوں پر جارحیت اور تشدد انہیں عزت نفس سے محروم کر دیتے ہیں۔ عزت نفس سے محروم بچوں میں بالغ ہونے پر بھی خود شناسی، خودی اور خودداری جیسی اعلیٰ انسانی صفات پیدا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اوائل عمر کے حالات و واقعات تجربات ومشاہدات آپ کے ساتھ زندگی بھر چلتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ذہن کے ٹیپ ریکارڈر پر بچپن میں جو کچھ ریکارڈ ہو جاتا ہے آئندہ ساری زندگی اسی ریکارڈ رنگ کی بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔ یعنی Tape Replay ہوتا رہتا ہے جسے بعد میں مٹانا یعنی Delete کرنا تقریباً تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے۔

اسی لیے تعلیم یافتہ معاشروں میں بچوں کے اوائل عمر میں تعلیم وتربیت کی اہمیت پر بے حد زور دیا گیا ہے کیونکہ انہی نازک ایام میں شخصیت کی بنیادیں اٹھائی جاتی ہیں۔

بچوں کی نشوونما کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ تقریباً دو سال کی عمر کے لگ بھگ کے بچے اپنے غصے کا اظہار واضح طور پر کرنا شروع کر دیتے ہیں یہ کیفیت کبھی تو معمولی قسم کی ہوتی ہے اور کبھی غیض وغضب کی شدید کیفیت ہو سکتی ہے جس میں بچہ غیر معمولی انداز میں چیخ چیخ کر روتا اور غصے کا اظہار کرتا ہے۔ کھلونے توڑ دیتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر غصے میں پھینک دیتا ہے۔ یا اپنے قریبی لوگوں کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔

آہستہ آہستہ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے اور بات چیت کرنا سیکھ جاتا ہے تو پھر غصے کا مظاہرہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں کرتا بلکہ زبان بھی چلانے لگتا ہے اس عمر کے بچوں میں انا مرکزیت (Egocentricism) بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس لیے بچوں کے ساتھ محبت نرمی، شفقت اور عزت سے بات کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں کوئی نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں۔

ماہرین نفسیات کے مطابق جارحیت کا شکار ہونے والے بچے خود بھی جارح ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی بے چینی، بے سکونی، بے اطمینانی یا اضطراریت پائی جاتی ہے حوصلہ، صبر اور اطمینان کا فقدان ہونے کے باعث بات بات پر غصہ کرنے لگتے ہیں یعنی

تنک مزاجی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بچوں میں ذہنی اور جذباتی ناپختگی (Immaturity) اور جذبات و خیالات بیان کرنے میں بے قاعدگی یا بے ربطگی (Inarticulate) پیدا کر دیتی ہے۔

دیگر تحقیقات سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ نامساعد حالات وواقعات (جارحیت اور تشدد) کا شکار ہونے والے بچے ایک خاص قسم کی مستقل اضطراری کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں جسے ماہرین نفسیات نے P.T.S.D یعنی پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر (Post Traumatic Stress Disorder) کا نام دیا ہے۔ یہ کیفیت کبھی تو بچپن میں ہی شروع ہو جاتی ہے مگر زیادہ تر عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب شعور زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے اور انسانی ذہن گزرتے ہوئے حالات و واقعات کا جائزہ لیتا ہے تو P.T.S.D کے اثرات زیادہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسے افراد میں پژمردگی، مایوسی، یاسیت یعنی ڈپریشن ہیجان، بے اعتمادی، غصہ، محرومی اور ناکامی کے جذبات واحساسات انہیں بے حد پریشان کر دیتے ہیں اور وہ یکسوئی سے ایک مستعد اور مثبت انداز میں زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں انتہائی صورتوں میں یہ افراد اپنی زندگی کے درپے بھی ہو سکتے ہیں۔

بچوں کے خلاف جارحیت کا تدارک اگر وقت پر نہ کیا جائے تو بعد میں صورت حال بہت پیچیدہ ہو سکتی ہے کیونکہ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچوں میں منفی جذبات واحساسات اور جارحانہ رویے اپنی بے بسی اور عدمِ تحفظ کے احساس کی وجہ سے تشکیل پاتے ہیں اس لیے بحیثیت انسان ہماری یہ ذاتی اور سماجی ذمے داری ہونی چاہیے کہ ہم بچوں کے خلاف کسی قسم کے جارحانہ اور متشدّد رویوں کی حوصلہ شکنی کریں اور انہیں معاشرے کے ذمہ داری اور موثر شہری بننے میں ان کی مدد کریں۔

''برطانیہ میں نسائی اردو ادب کا جائزہ''

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

عورت کا لفظ سے رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ خود انسانی تہذیب کیونکہ الفاظ جذبات کے ترجمان اور دلی کیفیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ عورت کی تخلیق جس جذباتی اور نفسیاتی تانے بانے سے عمل میں آئی ہے وہ جہاں بہت کچھ لفظوں میں کہتی ہے۔ بہت کچھ ان کہا رہ جاتا ہے۔ بہت سی لائنیں اور مصرعے قلم زد ہوتے ہیں۔ بہت سے لفظ لکھ کر مٹا دیئے جاتے ہیں اور بہت سی سرگوشیاں ہونٹوں کی جنبش میں ہی دفن ہو جاتی ہیں۔

ایسے میں سوچتی ہوں کہ اپنی بات کی ابتدا کہاں سے کروں۔ یہ موضوع اگر آسمان کی طرح وسیع ہے تو سمندر کی طرح گہرا۔ ایسے میں کہیں تاریخ آواز دیتی ہے تو کہیں جغرافیہ دامن پہنچتا ہے۔ کہیں تہذیب و معاشرت راستہ روکتے ہیں تو کہیں سیاست آڑے آتی ہے اور ان سب کے درمیان کلچر، آرٹ، ادب، لٹریچر اور وہ بھی نسائی اردو ادب، سرزمین یورپ کے ایک چھوٹے سے جزیرے برطانیہ میں، مشرقی زمینوں میں سینچے جانے والی قلم کار خواتین جنہیں ہجرتوں نے اجنبی زمینوں پر آباد کر دیا وہ آج بھی غریب الوطنی کے صدمے سے باہر نہیں نکلیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیارِ غیر میں جا کر آباد ہونے والوں کے ہاں عام طور پر دو قسم کے رویے مشاہدے میں آتے ہیں۔ یا تو وہ ماضی کے سب حوالے فراموش کر کے نئی بستیوں کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں یا پھر اپنی مٹی سے محبت کا فطری جذبہ زندگی بھر انہیں کچوکے لگاتا رہتا ہے اور اگر وہ ایک تخلیقی کار ہے تو تخلیق کا کرب اپنی جگہ اور ہجرتوں کے تازیانے اس کرب کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔

برطانیہ میں موجود قلم کار خواتین نے کئی ہجرتیں کی ہیں۔ پہلے تو بابل کے محلوں کے مست رنگے کبوتروں کو چھوڑا، جنم دینے والی کوکھ کو خدا حافظ کہا۔ جس زمین پر پہلا سانس لیا اس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کو الوداع کہا۔ عمر بھر خونِ جگر سے جن پودوں کی آبیاری کی وہ بھی اپنی زمین اور آسمان ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اتنی ہجرتوں کے بعد اگر آنکھ سے آنسو نہ بہیں، قلم سے خون نہ ٹپکے تو تخلیق کار ہونے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ادب کائنات کے حوالے سے انسان کے عمل اور ردعمل کی ہی داستان ہے یا پھر زندگی اور زندگی کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ کی ترجمانی کا نام ہی ادب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں جاننا ہو تو اس کے ادب اور خاص طور پر ناول اور افسانے کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ زمینی سچائیاں جہاں ادیب کے فکر و نظر کو متاثر کرتی ہیں وہیں کاغذ کا سینہ بھی لہولہان ہو جاتا ہے اسی لیے ادیب کا باطن جس قدر ہمہ گیر اور متنوع ہوگا اتنا ہی زندہ ادب اس کی تخلیق میں شامل ہوگا شاید اسی لیے برطانیہ میں لکھنے والی خواتین نے اپنی تحریروں میں موسم، ہجرت، بھنور اور خوشبوؤں کے استعارے بکثرت استعمال کر کے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ ان کہا رہنے دیا ہے۔ مثلاً چند کتابوں کے سرورق نمونے کے طور پر پیش کر رہی ہوں جن میں بکھرے لوگ، پیڑ سے بچھڑی شاخ، بے زبانی کے عذاب، ادھورے خواب پیپل کی چھاؤں میں۔ آسیب سے پرچھائیں تک، تنکوں کا دوپٹہ۔ اداس گلیوں میں، گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو، ہجرتوں کے بھنور، یا پھر چڑیو میری بات سنو وغیرہ وغیرہ۔

نسائی اردو ادب کا جائزہ کسی بھی سرزمین پر لیا جائے، چاہے امریکہ ہو یا افریقہ، مشرقی وسطیٰ ہو کہ مشرقِ بعید، مغرب ہو یا مشرق، ہمیں تھوڑا سا پیچھے مڑ کر ضرور دیکھنا ہوگا کیونکہ کل، آج اور کل وقت کی وہ تین کڑیاں ہیں جن میں ایک قلم کار ادب تخلیق کرتا ہے کیونکہ اپنے پیش رووں کے تجربات و مشاہدات اپنے عہد کا وجدان و آگہی اور آنے والے کل کی تصویر ہی ایک اچھی تحریر کا خاصہ ہے۔

بیسویں صدی اس لحاظ سے بہت ہیجان انگیز تھی کہ اس میں فکر و بیداری کی ایسی زبردست لہریں اٹھیں کہ بہت سے ازمز (Isms) کے سفینے ڈوب گئے۔ بہت سے بت پاش پاش ہوتے۔ پرانے نظریات کی جگہ نئے نظریات اور تحاریک نے لی بہت سی معاشرتی اور ثقافتی موومنٹس شروع ہوئیں جن میں ویمن رائٹس یعنی خواتین کے حقوق، آزادی نسواں یعنی ویمن لبریشن موومنٹ بہت نمایاں رہیں۔ بیداری کی اس لہر نے مشرق اور مغرب دونوں کو متاثر کیا، ہر خطہ زمین کے حساس ذہین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے قلمکاروں نے اپنے ادراک وآگہی کو اپنی تحریروں میں سمودیا۔ بات نسائی ادب کی ہورہی ہے تو آزادی نسواں کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا مگر جس طرح فیمنزم کے نام پر مغرب میں عورت کا استعمال ہوا ہے اور مسابقت کی دوڑ میں جس طرح عورت کی نسانیت، اس کا عورت پن بری طرح متاثر ہوا ہے مجھ جیسی حساس قلمکار اپنی نظم عقوبت خانے میں یوں رقمطراز ہے کہ

زندگی کے عقوبت خانے میں
صرف جسم قید نہیں ہوتے
ضمیر دربان بن جاتے ہیں
سوچوں کے چہرے پر
سیاہی مل دی جاتی ہے
خیالوں کے پاکیزہ بدن کو
ناپاک ہاتھ چھوتے ہیں
اندھیرا روشنی کی آبروریزی کرتا ہے
رات دن کی داشتہ بنتی ہے
خواب اندھے ہوجاتے ہیں
خوشبو بیوہ

اورعورتیں مرد بن جاتی ہیں

نسائی ادب کے نام پر کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ اور پروین شاکر جیسے نام شاعری کے اُفق پر طلوع ہوئے مگر پروین شاکر کو چھوڑ کر ایسا محسوس ہوا کہ شاعرات نے تخلیقی تجربے کو نعرہ بازی اور غیر ضروری جدیدیت سے آلودہ کر دیا ہے بہت سی ہم آواز خواتین کو چپ کا روزہ رکھ لینے کی تلقین کی مگر بعد میں اسی چپ کو اپنی لیڈری چمکانے کے لیے نہایت بے رحمی سے استعمال کیا۔

نسائیت یہ ہے کہ ''عورت اپنے عورت پن پر فخر کرے۔ مرد کی تضحیک کی بجائے زندگی کے سفر میں اس کے ساتھ کو ضروری سمجھے، مرد کی مردانگی اور عورت کی نسائیت اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ عورت کا عورت پن سے فرار ادھورا پن ہے۔ نسوانی سوچ کو، احساسات و جذبات کو حجاب اور تہذیب کے خوبصورت جامے میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرنا کہ جس میں وفا بھی ہو۔ حیا بھی ہو، لب پہ دعا ہو تو ہاتھ پر رنگ حنا بھی ہو۔

برطانیہ میں اردو افسانے کے حوالے سے تخلیق ہونے والے ادب میں ایک بڑی تعداد خواتین کی ہے جن میں خالدہ احمد، محسنہ جیلانی، صفیہ صدیقی، حمیدہ معین رضوی، عطیہ خان، فیروزہ جعفر، بانو ارشد، نجمہ عثمان اور پروین مرزا جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہجرت کا دکھ اجنبی زمینوں پر سفر کی صعوبتیں، مشکل راستے، اکیلا پن، بچوں کی شادی بیاہ کے مسائل، منشیات شراب جوا، گھریلو تشدد، ہم جنس پرستی، نسل پرستی، نئی نسل کے لیے شناخت کے مسائل، زبردستی کی شادیاں، مذہبی تشخص، بیروزگاری، پیری فقیری اور مذہبی انتہا پسندی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ اردو فکشن کے ہراول دستے کی خواتین جن میں عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی، ہاجرہ سرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، واجدہ تبسم اور الطاف فاطمہ اور بشریٰ رحمٰن جیسے نام شامل ہیں اور انہوں نے نہایت اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا جسے عالمی فکشن کے اونچے درجے کی تخلیقات کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔

گوکہ برطانیہ کی نثر نگار خواتین لکھ رہی ہیں مگر ابھی تک اپنے پیش روؤں کی مانند عالمی فکشن کے اونچے درجے کی تخلیق سامنے نہیں آسکی ہے مگر ان کی تحریریں آنے والے وقت کے لیے حوالے کے طر پر یقیناً دیکھی جاسکیں گی۔ اس وقت برطانیہ میں تقریباً 40 خواتین قلمکار ہیں جن میں سے 24 شاعرات ہیں جبکہ 7 قلمکار شاعری اور نثر دونوں لکھ رہی ہیں۔ ناول کی بجائے زیادہ افسانہ لکھا جارہا ہے۔ کچھ خواتین انشائیہ بھی لکھ رہی ہیں مگر طنز و مزاح پر کسی خاتون کا کام سامنے نہیں آیا سوائے رضیہ اسماعیل کے جن کا انشائیوں کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' کے نام سے شائع ہوا۔

برطانیہ میں سب لکھنے والیوں کا تعلق پاکستان یا انڈیا سے ہے وہیں کی پروردہ اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک بھی قلم کار نے برطانیہ کی زمین سے جنم نہیں لیا۔

میرے ماہیے......میرے دوہے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

ماہیے اور دوہے لکھنے کی داستان بھی خاصی دل چسپ ہے۔ یہ کم و بیش کوئی چودہ پندرہ برس قبل کی بات ہے کہ میں برمنگھم میں مقیم نامور بزرگ صحافی اور ''کشمیر اداس ہے'' اور ''نگارشاتِ محمود ہاشمی'' کے مصنف جناب محمود ہاشمی کی ذاتی لائبریری سے اکثر و بیشتر استفادہ کرتی رہتی تھی۔ جس سے مجھے بہت سی ایسی نادر کتب پڑھنے کا موقعہ ملا جو کہ برطانیہ کی لائبریریوں میں دستیاب نہیں تھیں۔

یوں ہی ایک دن یکسانیت سے اکتا کر میں کسی دل چسپ کتاب کی تلاش میں ہاشمی صاحب کی لائبریری تک جا پہنچی تو انھوں نے بتایا کہ آج کل ''ماہیا'' میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہ پائی تو انھوں نے وضاحت کی کہ جرمنی میں مقیم نامور شاعر اور ادیب حیدر قریشی اور پشاور سے ''ابلاغ'' رسالہ نکالنے والی سیّدہ حنا کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا ہوا ہے۔ اور ماہیوں کے اوزان کی بحث اب گھر سے نکل کر چوباروں چڑھ گئی ہے۔ ہاشمی صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں تو آپ دونوں کی ماہیوں کی کتابیں لے جائیں اور خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ اُردو ماہیا کس وزن پر لکھا جانا چاہیے۔ اور اگر کچھ تحریک پیدا ہو تو پھر اس میدان میں طبع آزمائی بھی کریں۔

سچ مانیے تو مجھے ہاشمی صاحب کی شگفتہ بیانی، زیرِ لب مسکرانا، ماہیے کی طول پکڑتی ہوئی بحث، سیّدہ حنا کے دلائل اور حیدر قریشی صاحب کے دلائل در دلائل اور ماہیے کے وزن کا جھگڑا بہت دل چسپ معلوم ہوئے۔ میں ماہیوں کے دونوں کتابیں پڑھنے کے لئے لے آئی مگر اس کے ساتھ ہی میں نے ہاشمی صاحب سے کہا کہ یہ دونوں کتابیں تو میں آپ کی تجویز

پرلے کر جا رہی ہوں مگر جمیل الدین عالی کی دوہوں کی کتاب بھی مجھے ضروری چاہیے۔

بہر حال جلد واپسی کے وعدے پر تینوں کتابیں ان سے لے کر آ گئی اور آتے ہوئے بڑی احتیاط سے انھوں نے میرے دستخط (بقلم خود) اپنے بُک بنک (Bookbank) کے کھاتے میں لے لئے تاکہ سند رہے۔اب بات چل نکلی ہے تو اتنا ضرور کہے دیتی ہوں کہ ہاشمی صاحب کتاب کے معاملے میں کسی پر کم ہی اعتبار کرتے تھے مگر میری کتابی دیانت داری سے متاثر ہو کر اکثر وبیش تر مجھے کتابیں عنایت کر دیا کرتے اور ساتھ ہی کہتے کہ ''آپ ہمیشہ کتاب وقت پر واپس کرتی آئی ہیں ورنہ تو لوگ کتاب ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں مارتے۔''

میں جب بھی ان کی شیلفوں پر سجی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی تو اس عرصے میں ہاشمی صاحب کافی مضطرب سے نظر آتے۔جیسے ہی کسی کتاب کو ہاتھ لگاتی تو ساتھ ہی شاہی فرمان نازل ہو جاتا کہ آپ اس کی جگہ بالکل تبدیل نہ کریں اور بس دیکھ کر واپس رکھ دیں۔کیوں کہ میں نے ان سب کو اپنے حساب سے رکھا ہوا ہے۔کچھ کتابیں میری تنظیم ''آگہی'' کی لائبریری کے لئے بھی عنایت کیں اور ایک کتاب بطور خاص محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں دیتے ہوئے کہا کہ آپ جیسی خواتین کو ایسی کتابیں پڑھنا چاہئیں وہاں بہت سی اور تاریخی ادبی تحریریں مجھے دیکھنے کو ملیں جن میں قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ ان کا یہ کہنا اور کتابیں نہایت شفقت سے پڑھنے کے لئے دینا میرے لئے ایک اعزاز کی بات تھی۔بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔بہر حال دونوں کتابیں پڑھنے کے بعد مجھے خود بھی ماہیے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی مگر حیدر قریشی کے اُردو ماہیے مجھے پنجابی ماہیے کے وزن پر زیادہ درست معلوم ہوئے۔کیوں کہ پنجابی ماہیے (ٹپّے) کی لے سے میرے کان بچپن سے آشنا تھے اس لئے اس وزن میں ماہیے لکھنے میں مجھے کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوئی۔اور ایک نہایت فطری انداز میں ماہیے خود کو لکھواتے رہے۔

حیدر قریشی اس سلسلے میں خود رقم طراز ہیں کہ ''ماہیا نگاری کے سلسلے میں مجھے خوشی ہے

کہ اُردو ماہیے کو پنجابی ماہیے کے وزن اور مزاج کے مطابق کرنے میں بنیادی نوعیت کا کام کرنے کا موقعہ ملا۔میں نے پنجابی ماہیے کے وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُردو ماہیے کہے ہیں اور اس میں موضوعاتی لحاظ سے لکھنے کے نئے تجربے کیے ہیں۔''

غرض کہ ماہیے کی دل چسپ بحث نے مجھے بھی ماہیا نگار بنا کر ہی چھوڑا۔اور صرف چند ہفتوں کے اندر میں نے مختلف موضوعات پر کوئی تین سو کے قریب ماہیے لکھ ڈالے۔ میں جب ہاشمی صاحب کو کتابیں واپس کرنے گئی تو ساتھ ہی ماہیوں کا مسودہ بھی لے گئی جس سے انھیں بڑی خوش گوار حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ آپ کے اس تخلیقی کام سے جرمنی میں حیدر قریشی یقیناً بہت خوش ہوں گے۔کیوں کہ آپ نے ان کے تجویز کردہ وزن میں ماہیے لکھ کر ان کی ماہیے کی تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔بعد میں انھوں نے میرا قریشی صاحب سے فون پر تعارف کروایا۔حیدر قریشی نے بعد ازاں میرے ماہیوں کے مجموعے کا پیش لفظ بھی لکھا۔اس طرح سے میں یورپ میں (بھارت، پاکستان کے بارے میں علم نہیں) پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون قرار پائی۔میری ماہیوں کی کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' 2001ء کے آغاز میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔

جہاں تک دوہوں کا تعلق ہے، تو عالؔی صاحب کے دوہے پڑھنے کے بعد میں نے کوئی ایک سو کے قریب دوہے بھی لکھ لیے اور بعد میں کہیں گم کر بیٹھی۔مگر دس بارہ برس کے بعد جب گھر تبدیل کیا تو دوہے دوبارہ دریافت ہو گئے۔اُن کی نوک پلک درست کر کے میں نے جرمنی میں حیدر قریشی صاحب سے رابطہ کیا کہ دوہوں کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع کریں مبادا پھر سے گم شدہ ہو جائیں۔ان کی طرف سے حوصلہ افزائی پر میں نے تیس کے قریب دوہے ان کے ششماہی جریدے ''جدید ادب'' کے لئے روانہ کر دیئے جو جنوری 2012ء کے شمارہ نمبر 18 میں شائع کر دیئے گئے۔گویا ایک طرح سے ''جدید ادب'' نے میرے دوہوں کی رسمِ اجراء کر دی ہے۔

مٹی کی آواز (پیش لفظ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

انسان کی حقیقت ایک مٹھی رنگا رنگ کی خاک کے سوا اور کیا ہے؟

اپنی ابتدا پر غور کرتی ہوں تو چشمِ تصور سے وہ منظر دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں جب روح پاک کو حکم صادر ہوا کہ بدن آدم علیہ السلام میں داخل ہو لیکن روح لطیف نے خاک کثیف میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تو خطاب رب الارباب کا روح کو پہنچا۔ ''اے جان داخل اس بدن میں ہو سو روح ڈرتے ڈرتے خاک کے پتلے کے تنگ و تاریک وجود میں داخل ہوئی مگر صرف ایک مقررہ وقت کے لیے!!!''

یعنی یہ طے پایا کہ انسان فانی ہے اور کائنات میں فرد کی وقتی موجودگی اور دائمی عدم موجودگی ہے۔

جیسے بدن کثیف اور بدن لطیف کا ملاپ تاریکی اور روشنی کا ملاپ ہے۔ ویسے ہی زمین بھی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی آسمان کی وسعت میں گھوم رہی ہے۔ جس قدر سوچتی ہوں اتنا ہی اس مسحور کن کہانی کی بھول بھلیوں میں الجھتی چلی جاتی ہوں تب کسی کی کہی ہوئی بات یاد آنے لگتی ہے کہ ''کہانی کا سحر وہ سحر ہے جو ازل سے ہی انسان کو مسحور کرتا چلا آ رہا ہے اور کرتا رہے گا خواہ اس میں راستہ بھول جانے کا ہی خطرہ کیوں نہ ہو۔''

لیکن کہانی میں راستہ بھول کر ادھر ادھر بھٹک جانا بھی کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر کافکا کے بارے میں آئن سٹائن کی کہی ہوئی بات ذہن میں گونجنے لگتی ہے کہ ''کافکا کے افسانے دماغ پر خراشیں ڈال دیتے ہیں۔''

میرے خیال میں ابن آدم کی کہانی ذہن پر نہیں بلکہ روح پر خراشیں ڈالتی ہے کیونکہ الستُ بِربّکُم کے جواب میں قالُو بلٰی کہنے کے باوجود ہم مٹی کی حقیقت کا ادراک ٹھیک سے نہیں کر پاتے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں، کوتاہیوں پر کوتاہیاں اور نفرتوں پر نفرتیں بکھیرتے ہی چلے جاتے ہیں پھر ادراک کے کسی لمحے میں اس کھنکتی سڑی ہوئی مٹی کے پتلے سے آواز آنے لگتی ہے۔

ہم خاکی صورت لوگ جہاں میں
کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں
سب ڈھونگ یہیں رہ جاتے ہیں
ہم مٹی میں مل جاتے ہیں
یہ مٹی اول آخر ہے
یہ مٹی ظاہر باطن ہے
اس مٹی میں ہم تیرتے ہیں
اس مٹی میں بہہ جاتے ہیں
اس مٹی سے تم پیار کرو!
جاں سو سو بار نثار کرو!
کبھی مٹی سے بھی پوچھو تم
جب چکی پاٹ پسی تھی یہ
جب آوے پار اتاری گئی
بے چین سلگتی روحوں سے
جب اس کی گود سنواری گئی
نخوت سے روندی جائے جب
کیا اس کے دل پر بیتتی ہے

یہ منہ سے چاہے کچھ نہ کہے
پر ایک حقیقت جانتی ہے
جسے ساری دنیا مانتی ہے
ہم خاکی صورت لوگوں کو
آغوش میں اک دن لے لے گی
پھر راز و نیاز کرے گی یہ
بے نور ہوئی ان آنکھوں میں
تب سو سو اشک بھرے گی یہ
جب یہ ہی اندر باہر ہے
جب یہ ہی آگے پیچھے ہے
یہی اوپر ہے، یہی نیچے ہے
کس بات پہ تم اتراتے ہو!
مٹی ہو تو مٹی بن کے رہو
اے خاکی صورت لوگو تم......!

اب اس مشتِ خاک کے بارے میں مزید غور و فکر کرنے کا کام قارئین کے سپرد!

11/3/2019

چاند میں چڑیلیں (پیش لفظ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

مزاح نگاری کا مجھے دعویٰ نہیں اور طنز میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو عام زندگی میں ایک طنزیہ جملہ بھی منہ سے نکالتے ہوئے زبان پتھر کی ہو جاتی ہے۔ مبادا کسی کی دل آزادی ہو جائے۔ ان تحریروں سے بھی کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات میرے ماحول کا حصہ ہیں اور میں خود ان کا ایک کردار ہوں۔ دوسرے کی کمزوریوں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ اپنی بدحواسیوں پر ہنسنا بھی اچھا لگتا ہے۔ کہیں کہیں کچھ رنگ آمیزی بھی ہے۔ لیکن کسی واقعہ کو ادب بنانے کے لیے کچھ کمی بیشی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ لکڑی کی صحیح تراش خراش کے بغیر فرنیچر نہیں بنتا۔

دراصل حقیقی زندگی میں مسائل، تکالیف، رنج و غم، شکر رنجیاں اور آہ و بکا اس قدر ہے کہ وہی حزن و ملال تحریر میں لانے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ نسبت مجھے شاعری سے بھی ہے لیکن شاعری ایسی چیز ہے جس پر آپ کا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ سو فیصد پلان بنا کر شاعری نہیں کرتے۔ پتہ نہیں کس لمحے میں کیا منکشف ہو جائے۔ مگر نثر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں آپ سے بات کرنے کو جی چاہا۔ عام زندگی میں میری شخصیت کے اس رخ سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جن کے ساتھ بات کرتے ہوئے ''ایٹ ہوم'' محسوس کرتی ہوں۔ ایسے ماحول میں ذات کے پرت خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں اور یہی لوگ صحیح معنوں میں آپ کی شخصیت سے واقف ہوتے ہیں۔ وگرنہ تو تکلف اور تصنع کے گھٹے گھٹے ماحول میں اچھی سے اچھی شخصیت بھی سات پردوں

میں جا چھپتی ہے اور بات چیت رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسے لوگوں کے حصے میں صرف میری سنجیدہ طبیعت کا پرتو ہی آتا ہے۔ کہ بقول شاعر:

کیا جانئے سودا اسے کس حال میں دیکھا

لیکن ایک لکھاری اور قاری کے درمیان ایک ان دیکھی اپنائیت کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک پہچان سی ہوتی ہے۔ ایک الگ ہی ویولینتھ ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں جو آپ حقیقی زندگی میں زبان سے نہیں کہہ سکتے، وہی کاغذ اور قلم کو ساتھی بنا کر بہت آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔

میری تحریر سے اگر آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہ بھی آئے (کیونکہ قہقہہ لگوانا تو ہرگز مقصود نہیں ہے) تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوبارہ پڑھئے۔ شاید آپ کی سوچ کے دروازے یا کسی کھڑکی پہ ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دے جائے۔ اگر ایسا ہو تو آپ اپنے آپ کو اور ساتھ ہی مجھے بھی شاباش دے دیجئے۔

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (حرفِ آغاز)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے کرب نے آگہی کی جو روشنی عطا کی وہی لوٹا رہی ہوں۔ اپنے کلام کے پہلے سامع شریکِ زندگی اعظم اسماعیل کی شکرگزار ہوں۔ تخلیق کے اولین دور میں ڈاکٹر سعید اختر درانی کے مشوروں کے لیے شکرگزار ہوں۔ عدیم ہاشمی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لیے دل کی گہرائیوں سے ان کی ممنون ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کا اصرار نہ ہوتا تو یہ تحری آپ تک نہ پہنچتی۔

بقول عدیم ہاشمی

''آپ کی تحریر دنیائے شعر و ادب کی امانت ہے، جس میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔''

1999ء

آدھی چادر (پیش کلام)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

نہایت متبرک ساعتوں میں معرضِ وجود میں آنے والی مملکتِ خداداد پاکستان کی اس نسل سے میرا تعلق ہے، جس کا جنم بٹوارے کے چند سالوں بعد ہوا۔ میں ایک ایسی نسل کی وارث ہوں جسے لوریوں کی جگہ ہجرت کی خونچکاں داستانیں سُننا پڑیں۔ بے خانماں، بے سروسامان، زخم خوردہ، شکستہ پا، مگر آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے خواب سجائے، حوصلوں کی جولانیوں سے آباد دلوں کے ساتھ، میرے آباؤاجداد جن گھروں میں اترے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہاں پوجا پاٹ کے لیے بنے ہوئے استھانوں سے ہم نے خود مورتیاں ہٹائیں۔ طاق میں رکھے ہوئے دیوالی کے دیئے کے دھوئیں سے سیاہ ہونے والی دیواروں کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

رام چندر، سیتا، راون، اور ستی کے جلوس کی کہانیاں ہمیں نصاب میں پڑھنے کو ملیں۔ دسہرا، بیساکھی، دیوالی، بنارس، کاشی اور متھرا کی اندھی عقیدتوں کے قصے ہمیں ازبر کرائے گئے۔

ہماری زمانے کے سرد و گرم سے ناچشیدہ آنکھوں میں تعبیر و تعمیر پاکستان کے خوابوں کی فصل بوئی گئی۔ خوابوں کے بوجھ سے دم توڑتی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ ہم فضاؤں میں جیسے تیر رہے تھے۔ خوابوں کا فسوں ایسا تھا کہ جیسے اندر سے آواز آ رہی ہو:

خواب گر ہوں
مرے کانچ کے خواب ہیں
چوڑیوں کی بجائے سجالو
مرے خواب بانہوں میں تم
خواب پہنو مرے، خواب اوڑھو مرے
میں بھی تن پہ سجائے قبا خواب کی
حالتِ خواب میں چل رہی ہوں
نئی منزلوں کی طرف
راستے میں مرے کوئی کانٹا نہیں
خواب کی فصل ہے لہلہاتی ہوئی
خوش نما خواب رستوں میں لٹکے ہوئے
ٹہنیوں پہ کہیں خواب اٹکے ہوئے
راستہ نیند میں جیسے بھٹکے ہوئے
خواب آنکھوں کی بانہوں میں سوئے ہوئے
خواب خوابوں کے من میں سموئے ہوئے۔۔۔

پتہ ہی نہ چلا کب خوابوں کی فصل کانٹوں میں تبدیل ہوگئی۔ خواب ٹوٹنے لگے، خواب بکھرنے لگے، ان بدنصیب آنکھوں نے پاکستان کو ٹوٹتے اور خوابوں کو دربدر ہوتے ہوئے دیکھا۔ دوقومی نظریے کی دھجیاں بکھرتی اور خلیج بنگال میں ڈوبتی ہوئی دیکھیں۔ ایسے میں میرے خواب مستقل اداسی کی ردا اوڑھ کر جیسے تھک کر سو گئے ہوں سو تب سے میں ایک اداس نسل کی بے حد اداس فرد ہوں۔

پھر میرے پرکھوں کی طرح میرے مقدر میں بھی ہجرت لکھ دی گئی۔ لیکن ان کی جبری ہجرت کے برعکس میری ہجرت اختیاری تھی سو میں اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے

پچھلے چالیس برس سے زائد عرصے سے اپنے نئے وطن (برطانیہ) میں مقیم ہوں۔

اب جب کہ زندگی کی دوپہر ڈھل رہی ہے۔سورج کی تمازت رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی ہے۔افق پہ لالی اپنے خیمے گاڑ رہی ہے۔پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سارا منظر جیسے کُھلنے لگتا ہے۔سوچتی ہوں یہودی ہولوکوسٹ پر گریہ زاری کرتے نہیں تھکتے مگر پنجاب کے ہولوکوسٹ کی کہانی کب لکھی جائے گی؟ اس کا نوحہ کون لکھے گا؟ پنجاب کے ہولوکوسٹ کے میوزیم کب بنیں گے؟ کب بین الاقوامی قوانین اس بات کا اقرار کریں گے کہ پنجاب پر کیا بیتی؟ اس کے نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ پنجاب اور پنجابیوں کی تقدیر کا فیصلہ کیوں ان پہ چھوڑ دیا گیا جن کا پنجاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا؟ اس آدھی پونی غیر منصفانہ تقسیم سے بلند ہونے والے شعلے کب سرد ہوں گے؟ کالی سیاہی سے نقشے پہ کھینچی ہوئی لکیر کب اور کیسے خونی لکیر بن گئی؟ انسان کب انسانیت کا چولا اتار کر وحشی بن گیا؟ بے شمار سوالات ہیں مگر وقت کی اندھی گھپاؤں سے کوئی جواب نہ پا کر یہی کہنا پڑتا ہے:

تیرے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

کیا صرف ایک امرتا پریتم کے وارث شاہ کو دہائیاں دے دے کر قبروں سے بلانے پر پنجاب کے زخموں کا مداوا ہو گیا؟

اس کتاب کا محرک بننے والا افسانہ ''آدھی چادر'' بھی پنجاب اور پنجابیوں کی حرماں نصیبیوں کی داستان ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے واہگہ اٹاری بارڈر پر میرے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔یہاں قلم بند کی جانے والی کئی کہانیوں میں بٹوارے کی تلخیاں سانس لے رہی ہیں جن میں آدھی چادر کے علاوہ ہرنام داس، باکا اور چیچہ وطنی شامل ہیں۔

مجھے اپنے افسانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے کیونکہ یہ محض افسانے نہیں ہیں میرے اندر کا شور ہے جس نے بہت عرصے سے میرے اندر ایک اُدھم مچایا ہوا تھا۔اب کاغذی پیرہن سے لپٹ کر ممکن ہے اسے کچھ قرار آ گیا ہو۔میرا ماننا ہے کہ جب تک یہ

کہانیاں باہر نہ آتیں۔دوسری اَن گنت کہانیوں کو راستہ ملنا دشوار تھا۔اب جبکہ بارش کے پہلے قطرے کی مانند یہ کہانیاں کاغذ کی سجل دھرتی پر برس گئی ہیں تو امید ہے کہ سالہا سال سے منتظر اور بہت سی کہانیوں کی رم جھم جلد ہی صفحۂ قرطاس کو شرابور کر دے گی۔

آپ انھیں پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کیونکہ

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

16 مارچ 2016ء

دائروں کا سفر (پیش لفظ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

ہر سفر کا انجام کسی دوسرے سفر کا نقطۂ آغاز بنتا ہے مگر دائروں کا سفر کبھی کسی انجام تک نہیں پہنچتا وہ رنڈی کے چھلکے کی طرح ایک دائرے میں ہی چک پھریاں لگاتا تا جسم و جاں کی دھنائی کرتا رہتا ہے برسوں پہلے نہ جانے کس حال میں کس خیال میں ایک شعر لکھا تھا کہ

میں دائروں کے سفر کو تمام کرتی ہوں
سحر تو ہوتی نہیں شام شام کرتی ہوں

معلوم نہیں تھا کہ ایک دن یہ شعر میری کتاب کا سرورق بن جائے گا۔ سو افسانچوں کا مجموعہ ''دائروں کا سفر'' قارئین کی نذر ہے۔

یکم مارچ 2019ء

پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک

(پیش لفظ، کہانی بول پڑتی ہے)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

(برمنگھم، برطانیہ)

داستان گوئی یا قصہ کہانی کہنے، سننے اور سنانے کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی تہذیب بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے اس کرّہ ارض پر قدم رنجہ فرمانے سے بہت پہلے ہی کہانی وجود میں آ چکی تھی تو اس میں شاید کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ ابتدائے آفرینش سے وجود میں آنے والی کہانی کا تانا بانا خود حضرتِ انسان ہی کے گرد گھومتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں میں موجود ازلی کشمکش نے ایک ایسی کہانی کو جنم دیا جو انسان کے اس کرّہ ارض پر آباد ہونے کی وجہ ٹھہری۔

بالفاظ دیگر کہانی زندگی سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کہانی سے الگ کوئی چیز ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمپلیمنٹ کرتی ہیں۔ اسی بات کو کسی صاحبِ بصیرت نے یوں بیان کیا ہے کہ ''کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے۔'' گویا کہانی صرف وقت گزاری کے لیے، دلچسپی یا چٹخارے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر پیش کر کے اس کی بہت سی ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے جنہیں عام انسان کی نظر دیکھنے سے محروم رہتی ہے۔

ویسے تو اردو نثری ادب، ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ کہانی بلکہ مختصر کہانی (یک سطری دو یا سہ سطری) سے مالا مال ہے مگر کچھ عرصے سے ''پوپ کہانی'' کی بازگشت ادب کے ایوانوں میں سنائی دے رہی ہے اور ایک بحث سی چل نکلی ہے کہ آخر ''پوپ کہانی'' عام

روایتی کہانی سے کس طرح الگ ہے کہ اسے ''پوپ کہانی'' کا نام دے کر اسے ایک نئی صنف تسلیم کر لیا جائے۔ آخر اس کی اپنی ہیئت، تکنیک اور پہچان کیا ہونی چاہیے کہ اسے دوسری نثری اصناف کے ہجوم میں الگ سے پہچانا جا سکے۔ جیسا کہ اردو شاعری میں غزل، نظم، آزاد نظم، نثری نظم، رباعی، ماہیا، دوہا، ہائیکو وغیرہ اپنی ہیئت اور تکنیک کی بنا پر ایک نظر میں ہی پہچان لی جاتی ہیں۔ تو اسی طرح ''پوپ کہانی'' کی پہچان کیا ہے؟ یعنی کونسی چیز ایک کہانی کو ''پوپ کہانی'' کا درجہ دیتی ہے۔ اگر اس کہانی میں کوئی انفرادیت ہے تو پھر اس کا اپنا کوئی فارمیٹ ہے یا نہیں؟ یا پھر صرف کسی بھی کہانی کے ساتھ ''پوپ کہانی'' کے الفاظ لکھ دینے سے کیا اس کے ایک الگ یا نئی صنف ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ ایسے بہت سے سوال ہنوز جواب طلب ہیں!

مقصود الٰہی شیخ جو کہ ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں ان کی ''پوپ کہانیوں'' کی کتاب 2011ء کے اوائل میں منصۂ شہود پر آئی تو کسی نے اسے ''پوپیاں'' (مصنف نے خود بھی انہیں پوپیاں کہا ہے) تو کسی نے اسے ''پاپ کہانی'' کا نام دے ڈالا تو کسی نے اسے اردو ادب میں ایک نئی صنف کا درجہ دے کر اس کی دریافت کا سہرا شیخ صاحب کے سر باندھا!!!

کئی رسائل وجرائد میں ''پوپ کہانی'' پر کئی تبصرے نظر سے گزرے تو میرا ذوقِ تحقیق و جستجو بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا مگر ''پوپ کہانی'' کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں اصل کتاب کا مطالعہ کروں۔ اولین فرصت میں شیخ صاحب سے (بریڈفورڈ) رابطہ کر کے ہدیے کا چیک سپردِ ڈاک کیا تو چند ہی دنوں میں پوپ کہانیوں کی کتاب، مخزن کا آخری (تاریخی) شمارہ اور چند اردو اخباروں کے تراشے بذریعہ ڈاک موصول ہوئے۔ ایک ہی نشست میں اپنے فکری تجسس کی تسکین کر ڈالی۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پیش لفظ علی سفیان آفاقی کا لکھا ہوا ہے جبکہ ''نئی صنف'' کے عنوان سے شیخ صاحب نے مختصر سا مضمون پوپ کہانی کی وضاحت میں قلمبند کیا ہے اور

ان کی اکیس پوپ کہانیاں اس حصے میں شامل ہیں۔ اس حصے میں ممتاز حسین کا مضمون ''پپو یار تنگ نہ کر'' جبکہ دوسرے حصے میں عمران نقوی (انٹرویوز) صفیہ صدیقی، جاوید اختر پاشا، احمد صفی، ڈاکٹر عمران مشتاق، ڈاکٹر مجیبر احمد آزاد کے تبصرے اور کہانیوں کے علاوہ سیّد ظفر ہاشمی (ایڈیٹر گلبن) اور تنویر اختر (ایڈیٹر ماہنامہ ساحل) کے تبصرے شامل ہیں۔ ہر ایک قلمکار اور تبصرہ نگار نے ''پوپ کہانی'' کو اپنے اپنے انداز میں دیکھنے، سمجھنے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی سفیان آفاقی رقمطراز ہیں کہ ''شیخ صاحب نے اردو ادب میں ایک نئی صنف متعارف کی ہے۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔''

''پوپ کہانی'' کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ ''پوپ کہانی افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلم بند کرنے کا نام ہے۔ جب قلم سے جڑا احساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم لفظوں میں سپردِ قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے۔ یہی اس کا نیا پن یا اس میں ''نیا'' ہے یا پھر پوپ کہانی سے نازک سہل اور فوری تاثر پیدا ہوتا ہے۔'' صفیہ صدیقی نے اسے دل سے نکلی ہوئی آہ یا خوشی سے لگایا ہوا قہقہہ قرار دیا ہے'' مگر سید ظفر ہاشمی تو اسے کوئی نئی صنف ماننے کو تیار ہی نہیں اور لکھتے ہیں کہ ''میں نے ان کہانیوں میں کوئی بات ایسی نہیں پائی کہ جو فی الوقت اِدھر اُدھر دکھائی دینے والے افسانچوں، منی کہانیوں، یک سطری، دوسطری چٹکلوں سے مختلف ہو اور جن کی بنا پر انہیں ایک الگ صنف قرار دیا جائے بجز اس کے کہ ان پوپ کہانیوں کا ماحول اور افکار مغربی ہیں اور کردار قید و بند سے آزاد، بے لگام معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' مزید لکھتے ہیں کہ ''فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں پوپ کہانیوں کی نہ تو کوئی تعریف بیان کی ہے اور نہ ہی اس پر بحث کی ہے کہ ان کی ہیئت اور تکنیک کیا ہے اور کن معنوں میں یہ منی کہانیوں/ افسانچوں سے مختلف ہیں۔''

ماہنامہ ساحل کے مدیر تنویر اختر کی رائے میں ''Pop انگریزی لفظ Popular کا مخفف ہے اور اس موسیقی کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو عام طور پر کاروباری بنیادوں پر ریکارڈ کی گئی ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ ''ان کہانیوں کے لکھنے کے انداز میں واضح فرق موجود ہے۔ یہ نظم کے مصرعوں کی صورت، مکالمے، خود کلامی یا روایتی کہانی کے نثری انداز میں لکھی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موضوع اور انداز کے لحاظ سے اس کی سمت ابھی طے ہونا باقی ہے مگر ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب مختصر ہیں جیسے آپ لنچ کی بجائے سینڈوچ کھالیں۔''

مئی 2011ء کے ندائے ملت میں انور سدید نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ ''مجھے خدشہ ہے کہ پوپ کہانی کی اصطلاح تاحال اپنے خدوخال سے محروم ہے اور شیخ صاحب نے جس قسم کی پوپ کہانیاں لکھی ہیں ان سے اولیت کا دعویٰ تو کر سکتے ہیں اور موجد بھی کہلا سکتے ہیں لیکن اس سے کہانی نئی جہت کی طرف بڑھتی نظر نہیں آتی اور۔۔۔اس میں روایتی کہانی کا پورا اسٹرکچر موجود ہے۔''

علی سفیان آفاقی کا یہ کہنا کہ شیخ صاحب نے پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی ہے۔اور مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔ میرے لیے سوچ کے بہت سے دریچے کھول گیا کہ اگر پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی گئی ہے تو پھر پوپ کہانی کا موسیقی سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رہا ہوگا اور اگر نہیں بھی رہا تو کیا اردو ادب میں لکھی جانے والی ''پوپ کہانی'' کو مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کر کے پوپ کہانی کے خدوخال کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔اس طرح کے بہت سے سوال تھے جنہوں نے مجھے مشرقی کلاسیکی موسیقی کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ لفظ (Pop) انگریزی کے لفظ (Popular) کا مخفف ہے۔ جس زمانے میں برطانیہ میں بیٹلز نے پوپ میوزک کا آغاز کیا تو ان کے پیش نظر یہی سوچ تھی کہ موسیقی جو اس وقت تک صرف خواص یعنی ایلیٹس (Elites) کے لیے مخصوص تھی۔ عام

آدمی کے لیے اسے سننا سمجھنا اور ذہنی اور مالی طور پر اس سے حظ اٹھانا اتنا آسان نہیں تھا تو انہوں نے ایک ایسی موسیقی کی داغ بیل ڈالی جو کہ عام فہم ہو اور ایک عام شخص کی دسترس میں ہو۔ یعنی کہ خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام میں مقبول ہو اور یوں اسے پوپ میوزک کا نام دیا گیا۔ یہ میوزک نوجوان نسل میں انتہائی مقبول ہو کر بہت مختصر عرصے میں مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑتی ہوئی پوپ میوزک کے گھر (برطانیہ) سے باہر نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی مگر صحیح معنوں میں امریکہ میں جا کر پروان چڑھی۔

اس ایک نقطہ نے میری توجہ انگریزی اور امریکن لٹریچر دونوں کی طرف مبذول کروائی مگر میں پہلے اپنی مشرقی کلاسیکی موسیقی کی تلاش و جستجو کو بیان کرنا چاہوں گی۔ مجھے برطانیہ میں مشرقی کلاسیکی موسیقی پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں مل پائی تو میں نے پاکستان میں اپنے قلمکار دوستوں زاہد مسعود اور شہناز مزمل سے رابطہ کر کے متعلقہ کتابیں بھجوانے کی استدعا کی۔ شہناز مزمل نے سید محمد اسلام شاہ کی ''غزل گائیکی'' اور ''طائرانہ نظر'' کے نام سے دو کتابیں پہلی فرصت میں مجھے برطانیہ بھجوائیں۔ زاہد مسعود نے تلاش بسیار کے بعد ''معارف النغمات، حصہ اول'' از محمد نواب علی خان جو کہ استاد بدرالزماں (صدارتی تمغہ حسن کارکردگی) کی ترتیب و پیشکش تھا، بھجوائی جو کہ اس سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ جس کے لیے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

مشرقی موسیقی کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر یہی نکتہ تھا کہ اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کر دیا جائے یا اس سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت، تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں، اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہو سکے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی مانند راگ اور راگنیاں بھی مختلف اوقات میں مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً راگ ملہار، برسات کے موسم کی کیفیت کو باندھتا ہے تو راگ بھیروی، بلاول، بیم پلاسی اور بھوپال بہت شانت، سنجیدہ اور سکون آور راگ ہیں۔

راگ پیلو اداسی کی کیفیت کا مظہر ہے تو تلک کمود اور ونداون شوخ وچنچل راگ ہیں جبکہ بھاگیہ شری ایک گھمبیر راگ ہے۔ اسی طرح مالکوس ،ایمن اور پنچم وغیرہ مختلف جذباتی کیفیات کے مظہر ہیں۔

کلاسیکی موسیقی کے مزید مطالعے سے پتہ چلا کہ موسیقی میں کل 9 ٹھاٹھ ہیں اور ہر ایک ٹھاٹھ کے اندر بہت سے راگ ہیں۔ مثلاً کلیان ٹھاٹھ (17راگ)، بلاول ٹھاٹھ (24راگ)، کھماچ ٹھاٹھ (18راگ)، بھیروں ٹھاٹھ (20 راگ)، بھیرویں ٹھاٹھ (23راگ) ٹوڑی ٹھاٹھ (6راگ) پوربی ٹھاٹھ (14راگ)، ماروا ٹھاٹھ (13راگ) کافی ٹھاٹھ (32راگ) پر مشتمل ہے۔ اس پر راگوں سے نکلتی ہوئی بے شمار راگنیاں اور راگوں کے پچھمن مثلاً گرہ، انش نیاس، تار، مندر، اپنایاس، سنیاس، ونیاس بہت اور الپت اور اس پر تال آستائیاں، انترے، سرتیاں اور ماترے وغیرہ وغیرہ پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ موسیقی تو ایک ایسا بحرِ زخار ہے جس میں ایک پوپ کہانی لکھنے والا ڈوب تو سکتا ہے مگر شاید پاپ کہانی نہیں لکھ پائے گا۔ سچ کہوں کہ موسیقی کے اس بحرِ بیکراں کے سامنے مجھے ننھی منی پوپ کہانی ایک ''لولی پوپ'' سے زیادہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے میں نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پوپ کہانی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے تال میل پہ مزید کام نہیں ہوسکتا۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

اب آتی ہوں انگریزی اور امریکن لٹریچر کی تلاش وجستجو کی طرف۔ جیسے جیسے میری تحقیق آگے بڑھتی گئی تو میں یہ جان کر نہایت خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی ایک نہایت پختہ نثری صنف کے طور پر پہلے سے ہی موجود ہے اور بہت عرصے سے لکھی اور پڑھی جارہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پوپ میوزک سے پہلے ہی امریکن لٹریچر میں ''پوپ اسٹوری'' بے حد مقبول ہو چکی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا بلکہ امریکہ میں ایک وقت ایسا تھا کہ پوپ میوزک کی بجائے پوپ اسٹوری زیادہ مقبول تھی اور اس کے رائٹرز راک

اسٹارز کی طرح سیلبرٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ جن میں ارنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemengway) ایڈگر ایلن پو (Edgar Alan Poe) ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (F. Scott Fitgerald) ڈیومس (Dumas) ار آر ایل سٹیونسن (R.L Stevenson) جیک لنڈن (Jack London) او ہنری (O,Henry) اور جارج سمنن (George Simenon) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ بہت اچھی پوپ کہانیاں لکھ کر بے حد داد وصول کی۔ دی موسٹ ڈینجرس گیم (The most Dangerous game) اور لیڈی اور دی ٹائیگر (The Lady or The Tiger) اعلیٰ درجے کی خالصتاً پوپ کہانیاں ہیں جو اپنے وقت میں بے حد مقبول ہوئیں۔

امریکن لٹریچر میں اس سوال کا جواب نہایت سلیقے سے دیا گیا ہے کہ آخر مختصر کہانی اور شارٹ اسٹوری کے مقابلے میں پوپ اسٹوری لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ آخر وہ کونسے عوامل تھے جنھوں نے ایک روایتی کہانی کو پوپ میں تبدیل کر دیا!!

پوپ کہانی کیوں؟ (Why Pop Story)

لکھا ہے کہ ''مغربی ادب میں رفتہ رفتہ شارٹ اسٹوری کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا اور دیگر تمام اصناف کے مقابلے میں شارٹ اسٹوری سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ مثلاً ایک وقت تھا کہ شارٹ اسٹوریز شائع کرنے والے مختلف رسائل وجرائد بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتے تھے پھر یہ رسائل بند ہونے لگے اس لیے کہ شارٹ اسٹوری کے قاری خطرناک حد تک کم ہوتے جارہے تھے۔ مغرب کی تیز رفتار زندگی میں کہانی کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور زندگی قاری کو لے کر بہت آگے نکل گئی تھی۔''

مغرب میں آج بھی بہت اچھی شارٹ اسٹوریز لکھی جارہی ہیں اور یہاں اس صنف کے بہت اچھے قلمکار موجود ہیں مگر زیادہ تر شارٹ اسٹوری کی کتب سٹوروں میں شیلفوں پر گاہکوں کے انتظار میں پڑی رہتی ہیں جس طرح ایک جوان طوائف

کے مقابلے میں ایک ادھیڑ عمر طوائف کو گاہک کے لیے زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔
قاری ان کو خرید نہیں رہا اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ Short stories are not connecting with the American public اس کے مقابلے میں ٹی وی، کمپیوٹر، میوزک، اسپورٹ، آئی پوڈ، فیس بک، ٹویٹر اور ای بکس (E-books) نے تیزی سے اپنی جگہ بنالی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر کوئی موٹروے کی فاسٹ لین میں جارہا ہے اور عام کہانی بہت سست رفتاری سے تھرڈ لین میں چل رہی ہے۔ ان حالات میں پوپ کہانی نے امریکن ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

اس بات کی گواہی میں اپنی ایک انگریزی قلمکار دوست (Gaynor Arnold) کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے بھی دے سکتی ہوں۔ جس کا پہلا ناول A Girl in the Blue جو کہ چارلس ڈکنز کے ناول Great Expectations کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا۔ بکر پرائز (Booker prize) کی لونگ لسٹ میں منتخب ہوا تھا۔ برطانیہ میں یہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس کا ناول ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جبکہ اس کی دوسری شارٹ اسٹوریز کی کتاب Lets lie together کو اتنا اچھا رسپانس نہیں ملا اور اب وہ پھر تیسری کتاب ناول ہی لکھ رہی ہے۔ اس لیے کہ یہاں شارٹ اسٹوری کی کوئی خاص مارکیٹ نہیں ہے۔ بقول گینا آرنلڈ ''Serious readers want to read a novel"

مغربی ادب میں شاعری کی مارکیٹ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پورے سال میں شاعری کی غالباً دس یا بارہ سے زیادہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو بقول شخصے ''تعلیم یافتہ معاشروں میں زیادہ نثر ہی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔''
مغرب کے قاری کے مطابق شاعری پڑھنے کی نہیں بلکہ سننے کی چیز ہے یعنی سپیکنگ پوئٹری اور اس طرح اس کا ایمپیکٹ بھی زبردست ہوتا ہے۔ یہ تو وہ حالات ہیں جنھوں نے امریکن قاری کو پوپ اسٹوری کی طرف متوجہ کیا۔

پوپ کہانی کیا ہے؟ (What is a Pop Story)

پوپ کہانی کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ:

-1 پوپ کہانی کا پلاٹ مربوط ہونا چاہیے۔ سٹرکچر مضبوط ہو مگر یہ بنیادی نوعیت کی پراثر کہانی ہونی چاہیے۔
-2 پوپ کہانی میں پلاٹ یا کردار کہانی کو آگے بڑھائیں۔
-3 یہ سادگی اور پرکاری کا اچھا نمونہ ہونا چاہیے۔
-4 پوپ کہانی کوئی ادب پارہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ کسی ادبی نقاد کے لیے نہیں لکھی جاتی بلکہ عام قاری کے لیے لکھی جاتی ہے۔
-5 کہانی تہہ دار نہیں ہونی چاہیے۔
-6 ضرورت سے زیادہ تفصیل سے احتراز کریں۔
-7 مناسب طوالت ہو یعنی نہ بہت چھوٹی اور نہ بے حد طویل۔
-8 کہانی اور قاری کے درمیان رابطہ ہر حال میں برقرار رہنا ضروری ہے۔

''پوپ کہانی لکھتے وقت قلمکار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ ایک کہانی سنا رہے ہیں کوئی فلسفہ، جدیدیت، مابعد جدیدیت، علامتی یا تجریدی تجربہ نہیں کر رہے ہیں۔ بس کہانی ہی ہونی چاہیے۔ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے اندر کہانی ہی سب کچھ ہے یعنی "You are telling a story, that's all"

دوسرے لفظوں میں پوپ اسٹوری اور پوپ میوزک میں کوئی واضح تعلق سامنے نہیں آ سکا ماسوائے کہ اسے پوپ اس کے پاپولر ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے کیونکہ یہ عوام الناس کے لیے لکھی جاتی ہے اور ان میں بے حد مقبول ہے۔
یہ تو رہی میری تحقیق و جستجو کی داستان...... مگر میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ میں امریکن لٹریچر میں لکھی جانے والی پوپ اسٹوری میں سے کچھ کہانیاں نمونے کے طور پر اردو

ادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں تا کہ پوپ کہانی کے بارے میں چھڑی ہوئی بحث میں اس کہانی کے خدوخال واضح کرنے میں کچھ مدد ملے۔

دریں اثنا ای بک (E-book) پر امریکن رائٹر کنگ وینکلس (King Wenclas) کی کتاب "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزری تو میں نے یہ کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کی۔ ان کہانیوں کو پڑھا اور ان میں سے دو کہانیاں مشین (Machine) اور سرخ دروازہ (Red Door) اردو ترجمے کے لیے منتخب کرلیں مگر میں مغرب میں کاپی رائٹس (Copy rights) کی سچوایشن سے پوری طرح باخبر تھی اس لیے بغیر پبلشر یا رائٹر کی اجازت کے میں ان کہانیوں کو ترجمہ نہیں کرنا چاہتی تھی مبادا مستقبل میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ میں نے پبلشر کے نام ای میل مورخہ 14 فروری 2012ء کو بھیجتے ہوئے لکھا کہ:

''میں نے حال ہی میں ای بک پر کنگ وینکلس کی دس پوپ کہانیاں پڑھی ہیں میں خود بھی اردو زبان میں شاعری اور نثر لکھتی ہوں میری خواہش ہے کہ میں کنگ کی چند پوپ کہانیاں اردو میں ترجمہ کرکے اپنے قلمکاروں اور قارئین کے لیے پیش کروں تا کہ اس بات سے آگاہی حاصل کی جاسکے کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی کیسے لکھی جارہی ہے اور ہم امریکن پوپ کہانی کے ماڈل سے اردو ادب میں پوپ کہانیاں لکھتے ہوئے کس طرح استفادہ کرسکتے ہیں۔''

مورخہ 18 فروری 2012ء کنگ وینکلس کی جوابی ای میل موصول ہوئی کہ:

''آپ کی ای میل اور میری پوپ کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ میں چند سوالوں کے آپ سے جواب چاہتا ہوں۔

☆ آپ نے دس پوپ کہانیاں کیسے اور کہاں تلاش کیں؟

☆ آپ نے کتاب کب اور کہاں سے خریدی؟

☆ ان کہانیوں کے تراجم کون کرے گا؟

☆ ان تراجم کو آپ کہاں پیش کرنا چاہیں گی؟ وغیرہ وغیرہ''

میں نے جوابی طویل ای میل مورخہ 20 فروری 2012ء کو کنگ وینکلس کو لکھتے ہوئے کہا کہ:

''آپ کے جواب کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ میں کچھ عرصے سے پوپ کہانیاں پڑھنے میں کافی دلچسپی رکھتی ہوں مگر کہیں سے پوپ کہانیوں کی نشاندہی نہیں ہو رہی تھی۔ پوپ کہانی پر ریسرچ کے دوران انٹرنیٹ پر آپ کی "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزریں۔ میرے خیال میں ایمزن کی ویب سائٹ تھی میں نے کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کرلی مگر آپ کی پوپ کہانیاں میں پرنٹ کرنے سے قاصر تھی۔ (شاید تمام ای بکس کی کہانیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رہا ہوگا) آپ کی چند کہانیاں بہت دلچسپ لگیں اور میری خواہش ہے کہ میں انہیں اردو میں ترجمہ کرکے اردو زبان و ادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں کہ امریکی ادب میں پوپ کہانی کے خدوخال کیا ہیں کیونکہ امریکہ میں یہ ایک نہایت پاپولر فارم آف آرٹ ہے۔ میں خود ان کہانیوں کا ترجمہ کروں گی۔ میں اس وقت خود بھی پوپ کہانیاں لکھنے کے مرحلے سے گزر رہی ہوں اور بہت ممکن ہے کہ انہیں جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرواؤں۔ آپ کی پوپ کہانیاں اس کتاب میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔ یہ کتاب اردو زبان میں شائع ہوگی اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کو کتاب کی ایک جلد ارسال کردوں گی جب کتاب چھپ جائے گی تو۔ مجھے امید ہے کہ میں

نے آپ کے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دیئے ہوں گے تاہم اگر
اس بارے میں آپ مزید معلومات کے متمنی ہوں تو براہ کرم رابطے میں
تردّد نہ کریں۔ جلد جواب دینے کے لیے ایک بار پھر نہایت مشکور ہوں
آپ کے جلد جواب کی منتظر رہوں گی کیونکہ میں جلد ہی بیرون ملک سفر
کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

میری ای میل کے جواب میں کنگ وینکلس کا جواب مورخہ 22 فروری کو موصول ہوا اور انہوں نے مجھے اپنی پوپ کہانیاں ترجمہ کرنے کی اجازت اس وعدے کے ساتھ دے دی کہ میں ان کے نام اور کام کو Acknowledge کروں اور ساتھ ہی انہوں نے میری پوپ کہانیوں کی کتاب کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کنگ کو بھیجی گئی میری آخری ای میل حوالے کے لیے موجود ہے۔

Dear Mr. Wenclas

"Thank you very much for allowing me to translate some of your work. I really appreciate.

I have selected two pop stories ie Machine and Red Door for translations and I hope it gives some idea to the Urdu readers as well as the writers as to what is a true pop story."

Warm Regards

Dr. Razia Ismail

Birmingham. England. UK

میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہنوز تشنہ ہے کہ آخر ہم اپنے مخصوص حالات اور ماحول میں اردو ادب میں پوپ کہانی کس طرح سے لکھیں یا کس طرح سے اس کی ایک الگ

پہچان بنائیں کہ ہمیں اس کے ساتھ کسی سابقے یا لاحقے کی ضرورت پیش نہ آئے اور بادی النظر میں ہی معلوم ہو جائے کہ یہ پوپ کہانی ہے۔ جیسے اردو میں ناول، افسانہ، رپورتاژ، کالم، سفرنامہ وغیرہ وغیرہ اپنی ہیئت سے ہی اپنی صنف کا پتہ دے دیتے ہیں یعنی کہ "لفافہ دیکھ کر مضمون خط کا بھانپ لیتے ہیں"

اس ضمن میں سوچ کے کچھ زاویے ہیں جن پر مزید غور و خوض کیا جاسکتا ہے مثلاً:

1- کیا مشرق کے مخصوص حالات اور ماحول میں لکھی جانے والی پوپ کہانی کو کسی طرح مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کیا جاسکتا ہے جو کہ ممکن ہے مشرق میں اس کی ایک الگ پہچان بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے؟

2- یا پھر ہم امریکن لٹریچر میں وضع کردہ خدوخال کے مطابق ہی پوپ کہانیاں لکھیں؟

3- یا پھر صرف ایسی کہانی کو پوپ کہانی کا درجہ دیا جائے جو کسی مخصوص مغربی سوچ یا فلسفے کی غمازی کرتی ہو۔

4- اس کے کردار بے شک مشرقی ہوں مگر مغرب سے انکا تعلق کسی نہ کسی انداز سے واضح ہوتا ہو یا وہ مغربی معاشرے میں رہ رہے ہوں یا رہ چکے ہوں یا ان کے تجربات مغربی معاشرے یا سوچ سے متعلق ہوں۔

5- عام اردو تحریر کے برعکس کیا انگریزی الفاظ کے بکثرت استعمال سے پوپ کہانی کی الگ پہچان بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ (اسی خیال کے پیش نظر میں نے اپنی لکھی ہوئی پوپ کہانیوں میں انگریزی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں) مگر یہ معاملہ بحث طلب ہے کہ ایک عام قاری (جس کے لیے کہانی لکھی جارہی ہے) اگر اس کا انگریزی زبان کا علم محدود ہے تو کیا وہ اس سے حظ اٹھا سکے گا؟

میں نے نمونے کے طور پر کنگ وینکلس (امریکن پوپ سٹوری رائٹر) کی دو کہانیوں کے تراجم شامل کتاب کیے ہیں اور خود بھی امریکن لٹریچر میں دی گئی پوپ کہانی کی تعریف و تجاویز کے اتباع میں بارہ پوپ کہانیاں لکھی ہیں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک

کامیاب ہوئی ہوں۔ اس کا فیصلہ میں آپ سب پر چھوڑتی ہوں کیونکہ یہ کہانیاں لکھتے وقت میرے پیشِ نظر صرف کہانی اور قارئین تھے۔ میرے نزدیک یہ کہانیاں قاری اور رائٹر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک مخصوص ماحول اور حالات کے اندر لکھی گئی (یہ تجرباتی کہانیاں) میری آپ کی اور ہم سب کی یعنی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ زندگی ایک تجربہ گاہ ہے اور میرے خیال میں تجربے میں بہتری اور نکھار کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔
شکریہ!

24 فروری 2012ء

پوپ کہانی کا قضیہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

''کہانی بول پڑتی ہے'' میری پوپ کہانیوں پر مبنی کتاب 2012ء جون میں منصۂ شہود پر آئی، جبکہ اس سے قبل جناب مقصود الٰہی شیخ کی پوپ کہانیوں پر مشتمل کتاب جنوری، فروری 2011ء میں منظرِ عام پر آ چکی تھی جس کی اشاعت کے ساتھ ہی شیخ صاحب نے پوپ کہانیوں کے ''موجد'' ہونے کا دعویٰ کر دیا ان کے دوست احباب نے اس دعویٰ کی معاونت میں خوب خوب خامہ فرسائی کی۔ بقول شاعر:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

شیخ صاحب کی پوپ کہانیوں کا شہرہ سن کر میرے ذوقِ تجسس نے مجھے مجبور کیا کہ میں پوپ کہانی پر کچھ تحقیق کروں۔ میری تحقیق نے ثابت کیا کہ پوپ کہانی امریکی ادب مس ایک پختہ نثری صنف کی حیثیت سے عرصہ دراز سے لکھی جا رہی ہے میں حیران تھی کہ شیخ صاحب نے کس طرح پوپ کہانی کے ''موجد'' ہونے کا سہرا اپنے سر پہ سجا لیا ہے؟ گویا وہی بات ہوئی کہ کسی بچے کے ہاتھ سے لولی پوپ چھین کر یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ یہ تو میری ہے!!!

مجھے اس ضمن میں جو کام کرنا تھا میں نے کر دیا۔ میں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ''پوپ اسٹوری'' امریکی ادب میں عرصہ دراز سے لکھی جا رہی ہے جبکہ شیخ صاحب کی پہلی کتاب ہی 2011ء میں منظرِ عام پر آئی ہے اس لیے پوپ کہانی کے موجد'' ہونے کا

دعویٰ سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔مشہور امریکی پوپ اسٹوری کے مصنف کنگ وینکلس (King wencles) سے اس سلسلے میں میری خط وکتابت (بذریعہ ای میل) ہوئی جسے میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کے پیش نظر میں بعنوان ''پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک'' بیان کیا ہے۔گاہے بگاہے پرسکون تالاب میں کنکریاں پھینکنے کا مقصد ومنشا اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ''موجد'' ہونے کے دعوے کی بحث کو زندہ رکھا جائے!!!

کوئی کسی چیز کا بانی یا موجد ہے یا نہیں ہے اس کا فیصلہ تاریخ خود کرتی ہے اور اس سلسلے میں تاریخ بڑی بے رحمی سے پوسٹ مارٹم کرتی ہے۔پھر بھی کسی ایجاد کا دعویٰ کرنے والے کو پورے حقائق اور شواہد کے ساتھ اس ایجاد کا باقاعدہ فارمولہ دینا پڑتا ہے وگرنہ آرشمیدس کی طرح خالی یوریکا، یوریکا(Eureka) یعنی مل گیا۔مل گیا کا شور مچا دینے سے ہی اسے حساب، جومیٹری اور فزکس میں موجد نہیں مان لیا گیا تھا۔

جہاں تک ''پوپ'' لفظ کو پہلی بار اردو ادب میں استعمال کر کے موجد ہونے کی بات کی جاتی ہے تو صرف ایک دوسری زبان سے دو لفظ (پوپ اسٹوری) اٹھا کر اپنے ہاں لے آئے اور ایک لفظ کا اردو میں ترجمہ کر دینے سے کوئی کیسے ''موجد'' کہلا سکتا ہے؟ ہاں البتہ مترجم ہونے کا سہرا اپنے سر سجایا جا سکتا ہے کہ اسٹوری (Story) کا ترجم کہانی کیا گیا ہے۔اسی بحث کو ذرا آگے بڑھائیں تو اردو زبان میں عربی، فارسی اور ہندی کو چھوڑ کر بے شمار مروّج الفاظ مغربی زبانوں سے آئے ہیں تو جن لوگوں نے پہلے پہل وہ الفاظ اردو زبان میں متعارف کروائے یا استعمال کئے تو کیا وہ سب ان کے ''موجد'' ہو گئے؟

اسی طرح ہائیکو جاپان سے درآمد ہوئی تو پھر جس کسی نے بھی پہلے پہل ہائیکو لفظ اردو میں متعارف کروایا ہوگا۔کیا وہ اس صنف کا ''موجد'' ہو گیا؟

انشائیہ جسے انگریزی میں لائٹ ایسے (Light Essay) کہا جاتا ہے فرانس سے ہوتا ہوا انگریزی ادب میں آیا جس پر چارلس لیمب نے بہت کام کیا اور اردو میں وزیر آغا مرحوم

نے اس صنف کے خدوخال نکھارنے پر بہت عرق ریزی کی تو کیا وہ انشائیے کے ''موجد'' ہو گئے؟

اردو ماہیا پر حیدر قریشی (مقیم جرمنی) نے تحقیق وتنقید کی پانچ کتابیں لکھی ہیں۔ماہیے کی اوزان مقرر کئے اور آج اردو ماہیا نگاری عروج پر ہے تو کیا وہ اردو ماہیے کے ''موجد'' ہو گئے؟

اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان سب حضرات نے کبھی بھی ان اصناف کے ''موجد'' ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور کوئی بھی ذی ہوش انسان ایسی بات کر ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ سرے سے ہی غلط ہوگی۔

زیادہ دور کیوں جائیں 2013ء میں بکر پرائز جیتنے والی امریکی مصنفہ لڈیا ڈیوس (Lydia Davis) نے مختصر ترین کہانی (Shortest story) پر انعام حاصل کیا۔اس نے تو اس پر ''پوپ'' کا دم چھلا نہیں لگایا!!!

''افسانچے کا سفر'' کے عنوان سے اسلام آباد سے جاری ہونے والے رسالے عکاس انٹرنیشنل نے شمارہ نمبر 18 میں افسانچے اور پوپ کہانی کی بحث کو بہت مدلل اور عالمانہ انداز میں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ مختصر کہانی یا افسانچہ (مروجہ نام) اردو ادب میں عرصہ دراز سے لکھا جا رہا ہے۔کسی پرانی چیز پر مانگے تانگے کے لیبل چسپاں کر دینے سے کوئی اس کا ''موجد'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سعدی شیرازی، خلیل جبران، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید، حیدر قریشی، کنگ وینکلس (امریکی پوپ کہانی کار) مقصود الٰہی شیخ، نذیر فتح پوری اور راقم کی تحریروں اور تجزیوں سے ''پوپ کہانی'' کی حقیقت عکاس انٹرنیشنل نے کھول کر رکھ دی ہے۔اور یہ شمارا ایک حوالہ جاتی دستاویز کے طور پر درج ذیل لنک پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

http://akkas-International blogspoy-del

میری پوپ کہانیوں کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی مارچ 2014ء میں رسم اجرا

کے موقعہ پر پڑھے جانے والے حیدر قریشی، حمیدہ معین رضوی، زاہد مسعود، عقیل دانش خواجہ محمد عارف اور امجد مرزا کے مضامین کو عکاس انٹرنیشنل کے علاوہ مارچ 2014ء میں جاری ہونے والے انٹرنیٹ میگزین ''ادبی منظر'' میں درج ذیل لنک پر دیکھا جاسکتا ہے۔

http://Issuu.Com/adbi-Manzar

یاد رہے کہ میری پوپ کہانیوں کی کتاب میں لکھی جانے والی کہانیاں ٹھیک ٹھاک طوالت کی کہانیاں ہیں محض چٹکلے نہیں ہیں اور یہ کہانیاں امریکی ادب میں اس وقت سنجیدہ لکھی جانے والی پوپ کہانیوں کے اتباع میں ہی لکھی گئی ہیں بلکہ امریکی پوپ کہانی کار کنگ وینکلس کی دو انگریزی کہانیاں اردو میں ترجمہ کر کے بعنوان ''سرخ دروازہ'' اور ''مشین'' شامل کتاب ہیں۔ جس سے پوپ کہانی کے سحر میں گرفتار افراد کو یہ بتانا مقصود ہے کہ پوپ کہانی اپنے اصل مرکز میں کس طرح لکھی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس کسی بھی شعبدہ بازی کو میں کبھی بھی پوپ کہانی کا نام نہ دیتی۔ بریڈفورڈ کی پوپ کہانی کے جواب میں لندن سے امجد مرزا نے مختصر کہانی کے لیے ایک اور اصطلاح ''کہانچی'' متعارف کروائی ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

بریڈفورڈ سے ڈاکٹر صفات علوی کا پوپ کہانی کے حوالے سے نہایت دل چسپ مضمون (2 فروری 2012) بعنوان ''ایک لیکھک کی نت جیوت اچھا اردو فکشن کے اتہاس میں پوپ کہانی کا آوشکار بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

بالی وڈ کی بیشتر کامیاب ترین فلمیں انگریزی فلموں کا چربہ ہیں اور جن فلم بینوں نے اصل انگریزی فلم دیکھی ہو وہ چند مناظر دیکھتے ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ کس انگریزی فلم کا چربہ ہے چونکہ فلم بینوں کی اکثریت انگریزی فلموں سے نابلد ہے اس لیے وہ نقل کو ہی اصل مان کر واہ واہ کرتے اور تالیاں پیٹتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے بیشتر اردو قلم کاروں میں مغربی ادب کا مطالعہ یا تو بہت کم ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے ایسے میں اگر کوئی مغربی ادب سے کسی صنف کا نام اٹھا کر اردو میں لے آئے۔

یہ سوچ کر کہ کسے پتہ چلے گا کہ پوپ اسٹوری نام کی کوئی چیز بھی کہیں اور موجود ہے۔ اور اسے اپنے نام سے متعارف کروا کے اس کی ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرے تو ایسے میں موجد اور اس کے ''ارادت مندوں'' کی واہ واہ کے جواب میں صرف کلمۂ افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے کہ ''استعمال شدہ'' لفظ پہلے سے ہی مغربی/امریکی ادب میں موجود ہے مگر اس پر ہونے والی تحقیق کو ''پوپ کہانی کے موجد'' آسمان میں تھنگی'' لگانے سے موسوم کرتے ہیں۔

ایک لمحے کے لے اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ شیخ صاحب کے علم میں نہیں تھا کہ پوپ اسٹوری نام کی چڑیا پہلے سے ہی کسی منڈیر پر بیٹھی ہوئی ہے تو پھر ان کی ''ذہنی اپچ'' نے ''پوپ'' ہی کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ پوپ کہانی کے بجائے اسے ڈسکو کہانی بھی کہہ سکتے تھے۔ راک یا جاز کہانی کا نام بھی دے سکتے تھے۔ زمبا (Zumba) کہانی کی اصطلاح بھی استعمال کی جاسکتی تھی۔ صرف ''پوپ'' پر ہی نظر کرم کیوں آ کر ٹھہری؟؟؟

پوپ کہانی کے ضمن میں صرف اردو ادب تک محدود رہنے پر اصرار کرنے والے شاید بھول جاتے ہیں کہ Pop تو ہے ہی انگریزی لفظ Poplar کا مخفف تو پھر اردو ادب کی بحث میں انگریزی ادب کا حوالہ کیسے منہا کیا جا سکتا ہے جب جب پوپ کہانی کی بات ہوگی۔ تب تب مغربی ادب کا حوالہ دیا جائے گا کیونکہ یہ اصطلاح مغرب سے ہی درآمد کی گئی ہے اور لفظ پاپولر کا استعمال اگر وسیع ادبی تناظر میں دیکھا جائے تو مغربی ادب میں ایڈگر ایلن پو، ارنسٹ ہیمنگولے، سکاٹ فٹز جیرالڈ، ڈیوس ایل سٹیونس (جو ناول نگاری کے ساتھ ساتھ کہانیاں بھی لکھتے تھے) جیک لندن، او ہنری اور جارج سمنسن (Simenon) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ بے حد پاپولر کہانیاں بھی لکھیں جو کہ ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہیں لیکن کسی کا ذہن اگر پاپولر لفظ کو اس کی محدود صورت میں 1910ء سے ہی (جب پوپ میوزک کا غلغلہ اٹھا تھا) دیکھنے کا متمنی ہے تو پھر بھی پوپ کی اصطلاح شیخ صاحب کی پوپ کہانیوں کی دونوں کتابیں شائع ہونے سے بہت پہلے ہی استعمال ہو چکی ہے۔ اس بنیاد پر بھی وہ ''موجد''

ہونے کے دعویدار نہیں ہو سکتے مختصر کہانی (موجودہ افسانچہ) کی تاریخ اگر سعدی شیرازی اور
خلیل جبران سے بھی کافی پہلے جا کر کنگالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 620 قبل مسیح میں یونان
میں مختصر کہانی لکھنے والے کا نام ایسپ (Aesop) تھا مگر کسی نے آج تک اس کی جانب سے
مختصر کہانی کا ''موجد'' ہونے کا دعویٰ نہیں سنا۔

(بحوالہ عکاس انٹرنیشنل شمارہ نمبر 18 صفحہ 25)

ویسے مجھے ذاتی طور پر لفظ ''موجد'' کے استعمال پر ہی اعتراض ہے کیونکہ موجد کا لفظ
اپنی حقیقی روح میں عموماً سائنسی ایجادات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور یہاں کونسا ادبی پہیہ
ایجاد ہو گیا ہے کہ جس پر اردو ادب کی ساکت ریل گاڑی متحرک ہو گئی ہے؟

تخلیقی عمل کے لیے درست لفظ بانی ہوگا یعنی بنیاد ڈالنے والا۔ اب ہم نے یہاں کس
چیز کی بنیاد ڈالی ہے کون سا بنیادی نوعیت کا کام اس صنف کے ضمن میں ہوا ہے جس کی بنا پر
کسی کو ''پوپ کہانی'' کا بانی قرار دے دیا جائے؟ بہت سے سوالوں کے جواب اس سلسلے
میں قرض ہیں شیخ صاحب کی طرف، مجھے ڈر ہے کہ اگر اسی طرح اردو ادب میں ''موجد اور
بانی'' کی تکرار کی قبیح رسم چل نکلی تو پھر ادب اور ادیب دونوں ہی فاتحہ پڑھ کر بیٹھ جائیں۔

اب آخر میں ایک حوالہ اس شخص کا جسے ہمارے شیخ صاحب نے بریڈ فورڈ میں موعو
کیا۔ ان کے اعزاز میں تقریب برپا کی۔ ہمیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی بوجوہ ہم
شریک نہ ہو سکے۔ مگر شیخ صاحب کے کہنے پر خیر سگالی کا پیغام لکھ کر ارسال کر دیا (اب
افسوس ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا) غالباً یہ تقریب اس امید پر منعقد کی گئی کہ شیخ صاحب کو
پوپ کہانی کا موجد مان لیا جائے مگر اس شخص کی طرف سے نہایت تکلیف دہ باتیں بیرون
ملک رہنے والے اردو ادب کے سبھی قلمکاروں کو سننا پڑی ہیں اور شرمندگی اٹھانا پڑی۔ جی
ہاں یہ کچھ عرصہ قبل انڈیا سے تشریف لانے والے قلمکار بشیر مالیر کوٹلوی تھے۔ وہ اپنے ایک
خط میں (ماہنامہ شاعر بمبئی کے نام) کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

'' کچھ افسانہ نگار جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ ایک خاص بیماری کا شکار ہو جاتے

ہیں۔ میڈیکل سائنس شاید اس بیماری کو کوئی نام دینے سے قاصر ہے۔ اس بیماری میں مبتلا
افسانہ نگار نامور اور شہرت یافتہ ہوتے ہوئے بھی ذلیل ہو جاتا ہے۔ وہ بیماری ہے خود کو کسی
صنف کا موجد کہلانے کی۔ ایسے لوگوں پر ایک بھوت سا سوار ہو جاتا ہے کہ اس دنیا سے
جاتے جاتے وہ ادب میں کوئی ایسی صنف ایجاد کر جائیں جس سے ان کا نام سنگ میل بن
جائے اور صدیوں تک ادب کی دنیا انہیں یاد رکھے۔ ایسے بیماروں کا شکار بیچارہ افسانہ ہی
ہوتا ہے یا پھر اس کا بچہ جو ایسے ہی تجربات کا درد سہتے سہتے بے حال ہو گیا ہے۔ اس بے
چارے پر سب سے پہلے ایک سطری نے حملہ کیا، دوسرا حملہ اس پر بیرون ملک سے پوپ
کہانیوں نے کیا۔ تیسرا حملہ راک کہانی کا ہوا۔ چوتھا حملہ کٹ آ وٹ (معاف کریں) کٹ
اپ کا ہوگا۔ پتہ چلا کہ اگلا حملہ اس معصوم بچے پر ڈسکو کہانیاں کرنے جا رہی ہیں۔''

(بحوالہ ماہنامہ شاعر بمبئی، فروری 2014ء)

شیخ صاحب بزرگ ہیں۔ ایک عمر ادب وصحافت کے خارزاروں میں آبلہ پائی کر
چکے ہیں۔ اس عمر میں جو عزت انہیں ملی ہے اس پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک کا
دل سے شکر ادا کریں وگرنہ ایسا نہ ہو کہ پوپ کہانی، موجد، ایجاد کی بھول بھلیوں میں کچھ اس
طرح الجھ جائیں کہ یہ کہنے کی نوبت آجائے۔

پانی کو بلونا تھا رسوا ہمیں ہونا تھا
ہم گھر کے مسائل کو بازار میں لے آئے

حصہ سوم

متفرقات

ادبی اور تخلیقی سفر

شاعری

- گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں)......2000ء
- سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں)......2001ء
- میں عورت ہوں (نثری نظمیں+انگریزی ترجمہ)......جون 2000ء
- پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے)......2001ء
- ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں دوہے)......2011ء
- خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات)......2012ء
- احساس کی خوشبو (اردو نظمیں بمعہ انگریزی ترجمہ)......2016ء
- خوشبو اڑتی پھرے (دوہے)......2016ء
- تتلیاں اُداس ہیں......شاعری/مصوری (زیرِ طبع)

نثر

- چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح)......2000ء
- کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں)......2012ء
- آدھی چادر (افسانے)......2016ء
- مٹی کی آواز (افسانے)......2019ء

- دائروں کا سفر (افسانچے)......2019ء
- عکسِ آ گہی (فن اور شخصیت)......2023ء
- کاغذی ہے پیرہن (افسانے، زیرِ تصنیف)
- ہم روحِ سفر ہیں (ایک منفرد سفرنامہ، زیرِ تحقیق و ترتیب)

تالیفات

- نذرانۂ عقیدت......مجموعۂ درود شریف......1997ء
- نیشنل ویمن ڈائریکٹری 1999ء

(برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز)...... بہ اہتمام ''آ گہی''

- رائٹ ٹریک (Write Track)......2000ء

(''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)

- پوئٹری ٹائم (Poetry Time)......2000ء

(''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)

- قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب)......2002ء

''آ گہی'' ویب سائٹ کا اجراء 1999ء

www.aaghee.co.uk

رابطہ: ای میل

aaghee@hotmail.com

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتب کی تعارفی تقریبات

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

1۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......اسلام آباد......(2000ء)

صدارت: افتخار عارف

2۔ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''......لاہور......(2000ء)

''میں عورت ہوں''

''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''

صدارت: فروحت عباس شاہ

3۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......لاہور......(2001ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنز و مزاح)

صدارت: بشریٰ رحمٰن

4۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......لندن......(2002ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنزومزاح)

صدارت: رضا علی عابدی

5۔''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......برمنگھم......(2002ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنزومزاح)

صدارت: ڈاکٹر شہناز مزمل

6۔خوشبو، گلاب، کانٹے (کلیات)، لاہور (2012ء)

صدارت: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی۔

7۔کہانی بول پڑتی ہے (برمنگھم) (2014ء)

صدارت: حیدر قریشی، خوشبو، گلاب، کانٹے، برمنگھم

8- خوشبو، گلاب، کانٹے (برمنگھم)

صدارت: عقیل دانش 2012ء

9۔آدھی چادر (افسانے) لاہور 2016ء

صدارت: حسن عسکری کاظمی/ بشریٰ رحمٰن۔

تقریب پذیرائی......خوشبو، گلاب، کانٹے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برطانیہ میں مقیم ممتاز سماجی کارکن، شاعرہ، ادیبہ مزاح نگار ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے شعری مجموعے خوشبو، گلاب، کانٹے کی رسم اجرا مورخہ 4 اپریل 2012ء بروز بدھ وار شام سات بجے، ادب سرائے کے زیر اہتمام ڈاکٹر شہناز مزمل کی کاوشوں سے ''فیض گھر'' ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد کی گئی۔

تقریب کی صدارت نامور دانشور، محقق اور ادیب ڈاکٹر شبیہ الحسن نے فرماء جبکہ زاہد مسعود مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ تبسم پروفیسر ایم مزمل، عینی راز فرحت پروین، ڈاکٹر شہناز مزمل راجہ اعجاز کنور، ناصر رضوی، راجہ صادق اللہ، ڈاکٹر رفیق خان اور دیگر احباب نے مصنفہ کی شخصیت اور شاعری پر بات چیت کی اور تہنیتی پیغامات دیئے۔

اہل قلم کی ایک بڑی تعداد نے تقریب میں شرکت کر کے رضیہ اسماعیل کی شعری کاوشوں کو سراہا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ''خوشبو، گلاب کانٹے'' ایسی کتاب ہے جسے ہر گھر میں ہونا چاہیے کیونکہ اس میں گلابوں کی خوشبو بھی اور کانٹوں کی چبھن بھی، ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مرد ایک تنظیم، عورت ایک تخلیق کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے رضیہ اسماعیل کی شعری کاوشوں کو بے حد سراہا۔ مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی ناآسودگی، بے انصافی، محرومی، مظلومیت اور عورت پر جبر کی داستان، رضیہ کی شاعری کے موضوعات ہیں یاد رہے کہ ''خوشبو، گلاب کانٹے'' رضیہ کے پانچ شعری مجموعوں کا مجموعہ ہے

جس میں گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو۔ سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں۔ میں عورت ہوں۔ پیپل کی چھاؤں میں اور ہوا کے سنگ سنگ، شعری مجموعے یک جا کر دیئے گئے ہیں۔ تقریب کی نظامت معروف شاعر جاوید شیدا نے کی جبکہ تقریب کی ریکارڈنگ 'ہم' اور 'رائل' ٹیلی ویژن نے کی۔

یہ تقریب بہت سی خوبصورت یادوں اور دوست احباب کی محبتوں، مبارکبادوں اور پھولوں کی خوشبوؤں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

آخر میں مصنفہ نے لاہور کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریوں کو اپنی تخلیقی کاوش خلوص اور دعاؤں کے ساتھ بھجوائی تاکہ نوجوان نسل بھی ان کی شاعری تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکے۔

چلتے ہو تو برمنگھم چلیے!

تقریب رسم اجراء (کہانی بول پڑتی ہے)

زاہد مسعود

آگہی ''برمنگھم'' کی جانب سے رضیہ اسماعیل کی پوپ کہانیوں کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی تقریب رونمائی کا اہتمام تھا اور مجھے اس میں شرکت کی دعوت تھی۔ میں اس سے قبل برطانیہ کا ایک آدھ چکر لگا چکا تھا چنانچہ مجھے شاید اسی بنیاد پر چھ ماہ کا ویزہ مل گیا کہ میں جا کر وہاں سے واپس بھی آ گیا۔ اب بھی میرا وہاں مستقل قیام کر لینے کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ یہ تقریب یوں تو گزشتہ سال اگست ستمبر میں ہونی تھی مگر بعض انتظامی مسائل کی وجہ سے نہ ہو سکی حالانکہ میں اس میں شرکت کے لیے لی گئی 45 دن کی سرکاری چھٹی برادرم افضال نوید کی نذر کر چکا تھا جو سال ہا سال بعد کینیڈا سے آئے اور میرے پاس ہی قیام پذیر رہے۔ اس دوران ان کی کتاب ''افلاک لیے پھرتا ہوں'' کی اشاعت اور تقسیم کا مرحلہ بھی میرے ہاتھوں طے ہوا۔ برطانیہ میں چونکہ برف باری اور سردی کے باعث ستمبر سے فروری تک تقریبات کا موسم نہیں ہوتا لہٰذا ''کہانی بول پڑتی ہے'' کی تقریب کی تاریخ 8 مارچ دوبارہ طے کی گئی جس میں شرکت کے لیے میں بذریعہ پی آئی اے 7 مارچ کو پاکستان سے روانہ ہوا۔

سرکاری چھٹی اور این او سی کے حصول کے لیے جس ذلت سے گزرنا پڑتا ہے اس سے بچنے کے لیے میں بہت پہلے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے نتیجے میں بحال ہونے والی آزادی کے حصول تک میں اب کسی غیر ملک کا سفر نہ کروں گا مگر دوستوں کی محبت اور اصرار

کے باعث کئی بار اپنے اس فیصلے کی خلاف ورزی کرکے برطانیہ، یورپ اور بھارت کی سیاحت کے مزے لے چکا ہوں کیونکہ سفر کی خوبصورتی مجھے سرکاری ''ادب وآداب'' کی تکلیف بھلا دیتی ہے۔ چنانچہ 7 مارچ کو میں جب مانچسٹر ایئرپورٹ سے نکلا تو سعدیہ گل میری منتظر تھی۔ سعدیہ ''سافما'' میں کام کرچکی ہیں اور آج کل مانچسٹر یونیورسٹی سے کوئی ''ڈگری'' حاصل کرنے کی جدوجہد کررہی ہیں۔ موصوفہ ایک نہایت مثبت سوچ رکھنے والی روشن خیال خاتون ہیں اور میری اور افضل ساحر کی مشترکہ دوست بھی ہیں۔ ان کو دیکھ کر دیارِ غیر کی غربت کا کچھ احساس کم ہوا۔ اسی دوران پی آئی اے کا فلائٹ سٹیورڈ میرے پاس آیا جس نے دوران پرواز میرے ''دانے پانی'' کا کافی خیال رکھا تھا اور آخر مجھے کہنے لگا ''سر آپ کا تعلق وزیرآباد سے ہے!'' میں ابھی اس تعارفی جملے سے سنبھل رہا تھا تو اس نے دوسرا وار کیا ''سر آپ چشتی صاحب کے صاحبزادے ہیں؟'' میں نے کہا بھئی کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ گے یا مجھے ہی پانچ سوالوں کے صحیح جوابوں کے عوض کوئی بڑا انعام دو گے تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ عارف نندا ہے اور وزیرآباد کے حوالے سے مجھے جانتا ہے۔

اس دوران برادرم اسماعیل اعظم جو میرے میزبان تھے وہ بھی دس منٹ کی تاخیر سے تشریف لے آئے تو میں نے نندا کو کہا کہ ''لو ہور چوپو'' ایک اور وزیرآبادیا آگیا ہے۔ میرے اس جملے کی لفٹ نہ کراتے ہوئے اسماعیل اعظم اور عارف نندا بغل گیر ہوگئے کہ دونوں وزیرآباد کی مقامی کرکٹ ٹیم کے ایک زمانے میں ہونہار کھلاڑی تھے۔ چنانچہ مانچسٹر ایئرپورٹ پر ایک چھوٹا سا ''وزیرآباد'' کھل گیا۔ سعدیہ گل نے موقع کی نزاکت اور مجھے محفوظ ہاتھوں میں دیکھ کر اجازت لی میں اور اسماعیل برمنگھم کی طرف روانہ ہوئے۔ دو گھنٹوں کے خوبصورت سفر کے بعد وہاں اسماعیل کے گھر پہنچ گئے۔ رضیہ اسماعیل نے اہتمام کے ساتھ پاکستانی کھانے تیار کررکھے تھے چنانچہ عشائیے کے بعد گہری نیند سوگیا۔

اگلے روز برمنگھم کے ہی ایک چھوٹے سے خوبصورت ہال میں کتاب کی تقریب رونمائی تھی جس میں شرکت کے لیے بلکہ اس کی صدارت کے لیے جناب حیدر قریشی جرمنی

سے بطور خاص پہنچ چکے تھے۔ اور ایک مقامی ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ آگئے ان کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے ساجد یوسف اور برمنگھم کے ہی ایک سینئر شاعر آدم چغتائی بھی تھے۔ سب احباب سے تعارف ہوا اور ادبی صورت حال پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ بعداز دوپہر تقریب گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ''آگہی'' کی خواتین ممبرز بڑی دلجمعی سے ہال میں کرسیاں لگانے اور سٹیج سجانے میں مصروف تھیں۔ پتہ چلا کہ وہاں یہ سب کام کے کرائے نہیں ملتے خود کرنے پڑتے ہیں۔ اتنی دیر میں بریانی اور گاجر کے حلوے کے بڑے بڑے دیگچے آگئے اور چائے کافی کی چھوٹی سی ''بار'' بھی سج گئی۔

شرکاء آہستہ آہستہ آنے لگے اور مہمانانِ گرامی کو اسٹیج کی زینت بنایا گیا۔ تقریب کا آغاز ہوا ''کہانی بول پڑتی ہے'' میں شامل کہانیاں اردو میں ایک نئی صنف ادب یعنی پوپ کہانی کی ابتدائی شکل ہیں۔ اس صنف نثر کی پذیرائی اور قبولیت کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے مگر مغربی ممالک میں قیام پذیر فکشن رائٹرز اس کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ رضیہ اسماعیل اس میں پیش پیش ہیں۔ اس سے قبل ان کا شعری کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کے نام سے چھپ کر پذیرائی حاصل کرچکا ہے۔ وہ شاعرہ، نثر نگارہ اور مزاح نگارہ ہیں۔ ادبی حلقوں میں خاموشی سے اپنا کام کرنے والوں میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ مقبولیت کی خواہش اور ادبی سیاست سے کوسوں دور رہتی ہیں اس حوالے سے برطانیہ اور پاکستان میں انہیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تقریب میں بہت سے ادیب شریک تھے جن میں حمیدہ معین پاکیزہ بیگ، خواجہ عارف، فاروق ساغر ممتاز احمد، عشرت قاضی، رضا احمد، ساجد یوسف، اقبال غالی، عبدالرب ثاقب اور آدم چغتائی شامل ہیں۔ برمنگھم میں قیام پذیر پاکستانیوں اور اردو پسند مکینوں کی ایک نمائندہ تعداد تقریب میں شریک تھی۔ اور ادب وشعر کے ساتھ ساتھ لذیذ بریانی، گاجر حلوہ اور حسب منشا چائے کافی سے بھی لطف اندوز ہوتی رہی۔ سلطانہ مہر نے جو کافی سینئر شاعرہ ہیں رضیہ اسماعیل کو خوبصورت پھولوں کا تحفہ پیش کیا۔ رضیہ کی ہمشیرگان اسماء اور عابدہ نے بھی انہیں تحائف پیش کیے۔

لندن سے آئی ہوئی شاعرات نے اپنی شرکت سے اس تقریب کو دو حوالوں سے حسن بخشا۔ حمیدہ معین نے بڑی سنجیدگی سے رضیہ اسماعیل کی کہانیوں کا جائزہ لیا جبکہ پاکیزہ بیگ نے اپنے خوبصورت ترنم کے ساتھ منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پوپ کہانی کے حوالے سے میری رائے تھی کہ یہ صنف ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہے۔ جوں جوں اس میں تخلیقی کام ہوگا اس کی اہمیت بڑھے گی۔ اردو ادب میں نئے نئے پیرائیہ اظہار کا سامنے آنا ایک جاری عمل ہے۔ اس طرح نثری نظم بھی نئی نئی آئی تھی تو بہت سے ''کہنہ مشتق'' بزرگ ادیبوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر اب نثری نظر میں اتنا بڑا تخلیقی کام ہو چکا ہے کہ ''منکرین'' کی تعداد اب خود بھی اس میں طبع آزمائی کر رہی ہے۔ رضیہ اسماعیل نے ایک کام کا آغاز کیا ہے اور اس میں اپنا حصہ ڈال رہی ہیں۔ وہ چونکہ ایک سنجیدہ اور محنتی ادیبہ ہیں لہٰذا کچھ نہ کچھ کر کے چھوڑیں گی۔

حیدر قریشی نے بھی جو کہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں پوپ کہانی کے اس مجموعے کو ایک اچھا تجربہ قرار دیا اور کہا کہ رضیہ اسماعیل نے پوپ کہانی جیسی نئی صنف نثر کی تفہیم کے لیے بنیادی کام کیا ہے جسے سراہا جانا ضروری ہے۔ عقیل دانش اور امجد مرزا نے اپنے مضامین لکھ کرارسال کر دیئے تھے مگر وہ دونوں حضرات بوجوہ تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔

تقریب کے بعد حسب توقع شعری نشست بھی منعقد ہوئی جس میں مقامی اور غیر مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام سامعین کی نذر کیا۔ سامعین میں کچھ انتہائی باذوق اور شعر شناس لوگ تھے جنہوں نے اپنے اپنے پسندیدہ اشعار کو ''مکرر'' بلکہ ''تکرر'' سنا۔ ان میں بیرسٹر رشید، اسماعیل اعظم اور خواجہ عارف نمایاں تھے۔ برطانیہ میں عام طور پر مطلع ابر آلود رہتا ہے مگر عین اتفاق ہے کہ دھوپ میرے ہمراہ وہاں پہنچی اور پندرہ روزہ قیام برطانیہ میں تقریباً روزانہ خوبصورت دھوپ نکلتی رہے۔ خنک موسم میں دھوپ پھولوں اور سبزے کی کثرت عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ جس روز لندن سے میری واپسی تھی دھوپ نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا اور ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچتے پہنچتے شدید بارش شروع ہو چکی تھی۔ سنا ہے کہ

اگلے روز ژالہ باری بھی ہوئی۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے جس پر یورپ اور برطانیہ میں قیام پذیر تارکین وطن قناعت کرنے پر مجبور ہیں۔ وہاں کی زندگی کو اس مختصر دورے میں قریب سے پرکھنے کا موقع ملا اس کا ذکر چلتا رہے گا کہ عمومی طور پر وہاں زندگی کا چلن کافی سخت ہے مگر خوبصورت موسم اور خوبصورت نظام نے ایک توازن پیدا کر رکھا ہے جس کے باعث لوگ وہاں نامطمئن اور ناآسودہ رہنے کے باوجود بھی وہاں رہنا بہتر سمجھتے ہیں وطن کو چھوڑنے والے غریب الوطن کئی سماجی اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہیں مگر وہاں کے طرز زندگی میں بعض ایسی ''نادر'' چیزیں ہیں کہ وہاں کی زندگی چھوڑ کر واپس آنے کے قابل نہیں رہتے۔ برمنگھم کے بعد، نوٹنگھم، مانچسٹر، آکسفورڈ اور لندن کے سفر کا باقی احوال آئندہ۔

تقریب پذیرائی ''خوشبو، گلاب، کانٹے''

رپورٹ: محمد اسماعیل اعظم
برمنگھم

برمنگھم میں ادبی و ثقافتی تنظیم ''آ گہی'' کے زیر اہتمام معروف شاعرہ، ادیبہ اور ممتاز سماجی کارکن ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کی رسم اجراء و پذیرائی کی تقریب بروز ہفتہ، 16 جون، ساؤتھ یارڈلے لائبریری میں ہوئی۔ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصہ میں کلیات کی رسم اجراء ہوئی جبکہ دسرے حصہ میں مشاعرہ برپا کیا گیا۔ تقریب کی نظامت معروف قانون دان اور نور ٹی وی کے پروگرام کے پیش کار بیرسٹر رشید مرزا نے کی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ صوفی نذیر حسین نقشبندی نے یہ سعادت حاصل کی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کلیات کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے، ان کی مجموعی ادبی خدمات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے طلعت سلیم نے کہا کہ اس سے قبل اردو ادب کو رضیہ فصیح احمد، رضیہ بٹ اور رضیہ سجاد ظہیر نے بہت کچھ دیا ہے۔ اب اردو ادب کو چوتھی رضیہ مبارک ہو جو شاعرہ اور ادیبہ بھی ہیں اور ممتاز سماجی کارکن بھی۔ خواجہ عارف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کا کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے حقیقت میں شعر کو برگ گل اور نوک خار بنا کر دونوں میں حسین توازن اور امتزاج پیدا کیا ہے۔ اس مناسبت سے ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' ایک اسم با مسمیٰ کتاب ہے۔ انہوں نے نثری نظم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اسے تن آسانوں کا مشغلہ نہیں

سمجھا بلکہ اس صنف کو اچھی طرح چھان پھٹک کر اپنایا ہے۔ اور اکثر نظموں میں اپنا مافی الضمیر بڑی کامیابی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی سماجی سرگرمیوں اور شاعری کا غالب حصہ عورت کے درد و کرب اور اس کے حقوق و مسائل کے اظہار سے عبارت ہے۔ حمیدہ معین رضوی اور فرزانہ خان نے رضیہ اسماعیل کی شاعری میں نسائی شعور کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انہوں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو اتنی کامیابی کے ساتھ اور دردمندی سے خواتین کی ذات اور ان کے مسائل کے ہر پہلو پر لکھنے پر مبارکباد دی۔

فاروق ساغر نے اپنی شگفتہ تحریر اور ہلکے پھلکے انداز بیان سے سامعین میں ہنسی اور مسکراہٹیں بکھیر دیں اور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو ان کی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ باصر کاظمی نے کہا کہ انہوں نے متعدد بار رضیہ اسماعیل کو مشاعروں میں سنا ہے، اور یہ سننا ہمیشہ اچھا لگا ہے۔ اب ان کے پانچ شعری مجموعے ایک ساتھ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ اس شعری سفر سے گزرنا یقیناً ایک دشوار مگر خوشگوار تجربہ تھا۔ انہوں نے کتاب کے پیش لفظ ''حرف آ گہی'' پر بات کرتے ہوء کہا کہ شعر و ادب کے ساتھ رضیہ اسماعیل نے دوسرے شعبوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ وہ صرف خواتین کے لیے ہی نہیں، بلکہ مردوں کے لیے بھی ایک مثال ہیں۔ شاعری کے معیار پر کتاب میں درج عدیم ہاشمی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''ان کی غزل اور نظم بشمول نثری نظم کا معیار، اردو ادب کے معیار پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے۔ رضیہ نے غزل اور نظم ایک جیسی توانائی اور ایک جیسی تخلیقی قوت کے ساتھ لکھی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے، وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لیے قابل رشک حیثیت رکھتا ہے۔'' باصر کاظمی نے کہا کہ وہ عدیم ہاشمی کی رائے کو معتبر سمجھتے ہیں۔

تقریب کے مہمان خصوصی عقیل دانش نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رضیہ نے خود کو ایک طویل عرصہ سے خرد افروزی، فکر و فن، شعر و ادب اور دیدہ دانش کے

لیے وقف کر رکھا ہے۔ اور اس کا ثبوت ان کی پانچ شعری تخلیقات، کلیات کی شکل میں ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔ رضیہ سماجی خدمات سے متعلق ہیں اور معاشرے میں ابھرنے والے مسائل، مصائب، اور محرومیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے پھولوں کی چھاؤں چھوڑ کر کانٹوں کی راہ گزر اپنائی ہے۔ اور اپنی ہمت، خدا داد صلاحیت اور اپنی کاوش سے اس راہ گزر کو بھی گلزار بنا دیا ہے۔ اسی لیے بڑے اعتماد سے کہا ہے کہ:

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

عقیل دانش کے بعد رضیہ اسماعیل نے اپنی کلیات کی بھرپور پذیرائی پر تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں تقریب کی صدر سلطانہ مہر نے اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی تمام کتابوں کا احاطہ کرتے ہوئے، ان کی سماجی خدمات، فکر و فن اور نسائی شعور پر انہیں مبارک باد دی۔ سلطانہ مہر نے کہا کہ رضیہ عزم و ہمت کا پیکر ہیں جو آگہی کی مشعل لے کر نکلی ہیں اور آگہی بادِ صبا کی صورت تقسیم کر رہی ہیں۔ یہ وہ نعمت ہے جو ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ جہاں اردو تنظیم کی جانب سے جاوید اختر چودھری اور سلطانہ مہر نے رضیہ اسماعیل کی ادبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں انہیں ایوارڈ بھی پیش کیا۔

تقریب کے دوسرے حصہ میں مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت عقیل دانش نے کی۔ مہمان خصوصی فاطمہ حسن (پاکستان) اور باصر کاظمی تھے۔ ان شعرائے کرام نے اپنے کلام سے نوازا۔ طلعت سلیم، طاہرہ صفی، غزل انصاری، تسنیم حسن، سمیعہ ناز، شاہین صدیقی، حمیدہ معین رضوی، فاطمہ حسن، باصر کاظمی اور عقیل دانش۔

''آگہی'' کے رضا کاروں کی ٹیم نے میزبانی کے فرائض احسن طور پر انجام دیئے۔ مہمانوں کی عمدہ خاطر مدارت کی گئی۔

تقریبِ پذیرائی۔۔ درقدر افزائی خدماتِ سلطانہ مہر

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برمنگھم میں ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کے زیر اہتمام ساؤتھ یارڈلے لائبریری کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں مورخہ 18 مئی بروز ہفتہ، اردو زبان و ادب کی مایہ ناز شخصیت، ممتاز صحافی، ناول نگار، افسانہ نویس، شاعرہ اور اردو تذکرہ نگاری میں ایک منفرد حیثیت کی حامل شخصیت، سلطانہ مہر کی پچاس برسوں پر محیط گراں قدر علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فن اور شخصیت پر لکھے گئے سو سے زائد اردو ادب کے مشاہیر کے مضامین، تاثرات، تبصرے، جائزے، انٹرویوز اور منظوم خراجِ عقیدت جسے ان کے شریک سفر جاوید اختر چودھری نے بڑی محنت سے تصنیف و تالیف کر کے اردو زبان و ادب کے قارئین کے لیے ''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے'' کی شکل میں پیش کیا ہے کی رسمِ اجراء بھی ہوئی۔

تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے دور میں پذیرائی، خراجِ تحسین اور مصنفہ کے فکر و فن پر لکھے گئے مضامین پڑھے گئے۔ جب کہ دوسرے دور میں ان کے اعزاز میں محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

تقریب کا آغاز خواجہ محمد عارف نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ رضیہ اسماعیل نے ہدیہ نعت محترمہ سلطانہ مہر کی طرف سے ان الفاظ میں پیش کیا۔

گلزارِ انبیاء میں تازہ گلاب کا سا
کوہِ صفا میں جیسے جھونکا گلاب کا سا

باتوں میں ایسی خوشبو مہکا دیئے دو عالم
میرے رسول کا وہ لہجہ گلاب کا سا
دل مہؔر کا ہوا ہے الفت کی ان کا مسکن
صحرا میں جیسے کوئی خیمہ گلاب کا سا

تقریب کی صدر اور مہمانِ خصوصی سلطانہ مہر تھیں۔ جب کہ اسٹیج پر ان کے شوہر جاوید اختر چودھری کو جو کہ خود بھی شاعر اور ادیب ہیں بیٹھنے کی دعوت دی گئی۔

رضیہ اسماعیل نے کہا کہ انہیں آج جس ایک اور شخصیت کو اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے بلانا تھا وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ممتاز افسانہ نگار، دانشور اور صحافی جناب قیصر تمکین جو کچھ عرصہ پہلے وفات پا گئے وہ محترمہ سلطانہ مہر اور جاوید اختر چودھری کے ساتھ رفاقتوں کے انمول رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کی نمائندگی کرنے کے لیے لیڈز سے ان کی بیگم صبیحہ علوی صاحبہ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔

رضیہ اسماعیل نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ سلطانہ مہر جیسی ہشت پہلو شخصیات ہر دور میں صرف چند ایک ہی ہوتی ہیں۔ جن کے تمام علمی اور ادبی حوالے معتبر ہوں۔ وہ ادب کے ہر میدان کی شہ سوار ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج یہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ''آگہی'' تنظیم اور پورے برمنگھم شہر کے لئے ایک اعزاز ہے کہ ہم ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک لونگ لیجنڈ (Living legend) کی سی ہے اور جب جب اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی سلطانہ مہر کا نام یقیناً جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔

سلطانہ مہر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لاس اینجلس میں مقیم ضیاء خان کا لکھا ہوا خراجِ عقیدت علیم اشرف صاحب کو ترنم سے پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ رضیہ اسماعیل نے سلطانہ مہر کے ابتدائی حالاتِ زندگی اور علمی و ادبی تخلیقات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ سلطانہ مہر کا جنم ممبئی کے ایک میمن گھرانے میں ہوا جہاں لڑکیوں کو پڑھانے کی قطعی اجازت

نہیں تھی۔ قرآن شریف پڑھایا جاتا اور اتنی تعلیم دی جاتی کہ خط لکھ سکیں۔ مگر سلطانہ مہر نے ان فرسودہ روایات کے آگے سر نہیں جھکایا۔ شادی ہو جانے کے باوجود ادھوری تعلیم مکمل کی اور کراچی یونیورسٹی سے جرنلزم میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روزنامہ ''انجام''، روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ رہنے کے بعد اپنا ماہنامہ ''روپ'' کے نام سے نکالا۔

چار ناول چار افسانوں کے مجموعے اور ''حرفِ معتبر'' کے نام سے ایک شعری مجموعہ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے 334 شعراء اور شاعرات کے تذکرے ''سخنور'' کے نام سے 5 جلدوں میں پیش کئے جو کہ 2517 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ 185 نثر نگاروں کے تذکرے ''گفتنی'' کے نام سے 1188 صفحات پر پیش کرتے ہوئے تذکرہ نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ آج کل ان کی تذکرہ نگاری پر بھوپال (ہندوستان) یونیورسٹی میں پروفیسر آفاق احمد کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال اور ساحر لدھیانوی کے فکر و فن پر بھی قابل قدر تحقیقی کام سلطانہ مہر صاحبہ نے کیا ہے۔

سلطانہ مہر کی شاعری پر پروفیسر محسن احسان کا لکھا ہوا مضمون جاوید اختر چودھری نے پڑھ کر سنایا جو کہ محترمہ طلعت سلیم پیش کرنے والی تھیں مگر ناسازئ طبع کے باعث شرکت نہ کر سکیں۔ اگلے مقرر اعظم اسماعیل تھے جنہوں نے کینیڈا میں مقیم جناب کرامت اللہ غوری کا لکھا ہوا مضمون ''سلطاناؤں سے سلطانہ مہر تک'' حاضرینِ محفل کے لئے بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا۔

علیم اشرف صاحب کو ایک بار پھر سلطانہ مہر صاحبہ کی ایک خوبصورت غزل ترنم سے پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مانا کہ تغیر سے بری ہم تو نہیں تھے
تم لوگ بھی انسان تھے موسم تو نہیں تھے

دنیا کے حودث بھی بنے میرا مقدر
میرے لیے اک آپ ہی کچھ کم تو نہیں تھے
کیا یہ بھی ضروری تھا کہ ہم کہتے زبان سے
فطرت کے اشارے شئے مبہم تو نہیں تھے

علیم اشرف کے خوبصورت ترنم نے ایک سماں باندھ دیا جس سے حاضرین محفل بے حد محظوظ ہوئے۔

کتاب پر مجموعی بات چیت کے لئے دانشور سُخن شناس اور ماہرِ قانون دان بیرسٹر رشید مرزا کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے نہایت دلچسپ پیرائے میں مختلف مشاہیر کے مضامین سے اقتباس پیش کئے جن میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، میر خلیل الرحمان، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، قیصر تمکین، بشریٰ رحمان، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، شان الحق حقی، شوکت صدیقی، راغب مرادآبادی، رئیس امروہوی، حمایت علی شاعر، جیلانی بانو، محمود ہاشمی اور ڈاکٹر صفات علوی کے نام شامل تھے۔

بیرسٹر رشید مرزا نے سلطانہ مہر پر تفصیل سے خراجِ عقیدت پیش کیا جسے سلطانہ مہر اور حاضرین محفل نے بے حد سراہا۔

سلطانہ مہر کے شریک سفر جناب جاوید اختر چودھری کو بات چیت کی دعوت دیتے ہوئے رضیہ اسماعیل نے کہا کہ آج ہم جاننا چاہیں گے کہ ایک عالمی شہرت یافتہ شریک سفر کے ساتھ رفاقتوں کا سفر کیسا رہا اور سلطانہ مہر کا ایک شعر:

ہاتھوں پہ خراش آئی بھی نہیں جھولی بھی گلوں سے بھر لی ہے
گلچیں نے یقیناً کانٹوں سے مل کر کوئی سازش کر لی ہے

ان کی نذر کرتے ہوئے پوچھا کہ سلطانہ مہر کو کیلیفورنیا سے برمنگھم لانے کی سازش کا تانا بانا انہوں نے کس طرح بنا جس پر تمام محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

جاوید چودھری نے ''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے'' کی تصنیف وتالیف پر بات کرتے

ہوئے کہا کہ ان کی طرف سے اپنی شریک حیات کے لئے ایک تحفہ ہے اور جس عرق ریزی اور محنت ومشقت سے انہوں نے پچاس برسوں پر بکھرے ہوئے مضامین کو کئی برسوں کی ریاضت سے یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس سے انہیں بے حد طمانیت حاصل ہوئی ہے اور اس کی رسمِ اجراء کی خوبصورت تقریب منعقد کرتے ہوئے ''آگہی'' تنظیم کی چیئر پرسن ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بہت محبت اور خلوص کا مظاہرہ کیا ہے ورنہ یہاں تو لوگ کسی کے کام کو پذیرائی دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

سلطانہ مہر صاحبہ سے تذکرہ نگاری کے حوالے سے ''سخنور'' میں شمولیت کرنے کے لئے آپسی بات چیت کو انہوں نے نہایت ہی دلچسپ انداز میں حاضرین کے لئے پیش کیا ہے۔ رفتہ رفتہ فون پر شروع ہونے والا رابطہ ایک دیرینہ رفاقت کی شکل اختیار کر گیا اور آج دنیا بھر میں جہاں جہاں سلطانہ مہر کا ذکر آتا ہے وہیں جاوید اختر چودھری کا ذکر بھی ہوتا ہے گو کہ ان کا ادبی مقام اپنی جگہ پر ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔

صبیحہ علوی نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور سب کو دلی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ''آگہی'' تنظیم نے یہ تقریب منعقد کر کے ایک بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس سے نئے آنے والوں کو اپنے متقدمین کے کام سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

آخر میں سلطانہ مہر نے اپنے خطبہ میں ''آگہی'' تنظیم اور اپنے شریک حیات کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حاضرین محفل اور مہمانوں سے اظہارِ تشکر کیا اور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل اور ان کے شریک سفر اعظم اسماعیل کو اس قدر خوبصورت تقریب منعقد کرنے کے لئے پھولوں کے گلدستے پیش کئے تھے۔ سلطانہ مہر نے کہا کہ عملی زندگی میں انہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں لیکن انہوں نے حالات کا مقابلہ کیا۔ ادب اور صحافت سے وابستگی کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کو کبھی ثانوی حیثیت نہیں دی اور انہیں اس بات پر فخر ہے کہ ان کے بچے زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے اور آج تینوں بیٹے امریکہ

میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر اپنے ملک و قوم کا نام روشن کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات چیت کا اختتام اپنے ان اشعار پر کیا:

بے ہنر ہستی کو میری باہنر اس نے کیا
بے نشاں دیوار و در کو معتبر اس نے کیا
میں مسافر بن کے نکلی تو ہوا وہ مہرباں
اور پیدا ہر قدم پر اک شجر اس نے کیا
زندگی کرتی رہی میں پتھروں کے درمیاں
جھوٹ کے اس بحر میں مجھ کو گہر اس نے کیا
مہؔر کہلاتی تھی لیکن تھی چراغ نارسا
مہؔر کی ہستی کو پھر شمس و قمر اس نے کیا

تقریب کے آخر میں سبھی حاضرین محفل سلطانہ مہر سے ان کی کتاب پر دستخط کروانے کے لئے لمبی قطار میں کھڑے تھے۔ ان کی تمام کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں بلکہ بہت سے حاضرین کتاب نہ ملنے پر افسوس کرتے رہے۔

تقریب کے دوسرے دور میں ایک خصوصی محفلِ مشاعرہ محترمہ سلطانہ مہر کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ سلطانہ مہر اور جاوید اختر چودھری کی گھریلو مصروفیت کی بنا پر محفل مشاعرہ میں شرکت نہ کر سکے۔ اس دور کی صدارت کا فریضہ محترمہ صبیحہ علوی صاحبہ نے سرانجام دیا جب کہ ''آ گہی'' تنظیم کی ایگزیکٹو ممبران محترمہ عشرت قاضی اور محترمہ عصمت بانو بھی اسٹیج پر ان کے ہمراہ تھیں۔ مشاعرے کی نظامت رضیہ اسماعیل نے کی اور مشاعرے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سب سے پہلے اپنی ایک غزل پیش کر کے داد وصول کی۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے دیگر شعراء میں آدم چغتائی، علیم اشرف، ڈاکٹر عبدالرب ثاقؔب، مرزا ممتاز حسین، عبدالرشید چغتائی، شہناز اختر، ملک فضل حسین اور خواجہ محمد عارف تھے جنہیں ان کی خوبصورت غزل پر بے حد داد ملی۔

مہمانوں کی خاطر مدارت کا انتظام فراخ دلی سے کیا گیا تھا۔ آخر میں سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا۔ شاداں و فرحاں مہمان تشکر کے جذبات کے ساتھ رخصت ہوئے اور ایک خوبصورت شام انمول یادوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

''اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں پانچ روزہ ادبی تقریبات'' کا احوال

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

برطانیہ

جولائی میں حلقہ اربابِ ذوق (اٹلی) بہ اشتراک حلقہ ادب وثقافت (اٹلی) اور مجلسِ اقلیتی مصنفین جنوبی ایشیا (اٹلی) کی جانب سے اردو ادبی سیمینارز اور ثقافتی اور لوک ورثہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ان پانچ روزہ تقریبات کا اہتمام معروف شاعر وادیب اور دانشور جناب حیدر قریشی (جرمنی) اور ج۔ف۔غوری (اٹلی) کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں عمل میں آیا۔

مختلف ادبی تقریبات کے لیے برطانیہ، امریکہ، جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک، اٹلی اور پاکستان سے اردو قلمکاروں اور دانشوروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ان میں برطانیہ سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، غزل انصاری اور تسنیم خان جبکہ امریکہ سے ڈاکٹر افتخار نسیم (شکاگو) افضال حیدر (ہیوسٹن) فرحت پروین (نیویارک) شامل ہوئیں۔جرمنی سے بشریٰ ملک اور ڈاکٹر جمال ملک، پاکستان ٹیلی ویژن کے مشہور معروف پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور شاعر ایوب خاور اور عزیزہ خاور نے پاکستان کی نمائندگی کی۔بوجوہ حیدر قریشی اور نصر ملک تقریبات میں شامل نہ ہو سکے۔

پانچ روزہ ادبی تقریبات کا آغاز فنڈیزا شہر کے میئر کی صدارت میں پاکستان اور اٹلی کے قومی ترانے بجا کر کیا گیا۔نثری نشست کی صدارت ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے کی۔جس

میں افسانہ، انشائیہ، طنز ومزاح اور کالم پیش کئے گئے جن میں فرحت پروین، بشریٰ ملک، غزل انصاری، ملک نصیر احمد اور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے نام شامل ہیں۔اس نشست کے اختتام پر ڈاکٹر افضال فردوس کے ساتھ ایک یادگار شام منائی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر افتخار نسیم نے کی۔

دوسرے روز مغربی دنیا میں اردو کی صورت حال پر مذاکرہ ہوا جس کی صدارت افضال فردوس نے کی۔مندوبین نے اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، امریکہ اور پاکستان میں اردو کی صورتحال پر دلچسپ اور معلوماتی مقالے پیش کئے۔جن میں ج۔ف۔غوری (اٹلی) بشریٰ ملک (جرمنی) پرویز اقبال (ہالینڈ) غزل انصاری اور تسنیم خان نے برطانیہ میں اردو زبان صورتِ حال پر جبکہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے برطانیہ میں نِسائی ادب کی صورتِ حال پر فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔فرحت پروین نے امریکہ میں اردو ادب کی صورتِ حال جبکہ ڈاکٹر افتخار نسیم نے امریکہ میں اردو اخبارات ورسائل اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ پر مندوبین کو معلومات بہم پہنچائیں جبکہ عزیزہ خاور اور زائرہ خاور نے پاکستان میں اردو کی صورت حال کا دلچسپ اور فکر انگیز نقشہ کھینچا اور آخر میں ڈاکٹر جمال ملک اور ایوب خاور نے عمومی اظہار خیال کیا۔

اُسی شام میلان (Milan) شہر میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں بہت سے مقامی شعراء کے علاوہ مہمان شعراء میں افضال حیدر، ڈاکٹر افتخار نسیم ایوب خاور ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، غزل انصاری، تسنیم خان، بشریٰ ملک، پرویز اقبال اور فرحت پروین نے اپنا کلام پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔اس تقریب میں مقامی افراد کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر افتخار نسیم، اور افضال فردوس نے کی۔جبکہ ایوب خاور مہمانِ خصوصی تھے۔تیسرے روز افتخار نسیم کے ساتھ ایک خاص نشست کا اہتمام کیا گیا اور حیدر قریشی کی صحت یابی کے لیے دعا کی گئی جو بوجوہ علالت تقریبات میں شرکت نہ کر سکے۔دراصل یہ شام حیدر قریشی کے اعزاز میں منائی جاتی تھی مگر ان کی خرابی صحت کے باعث اس

میں تبدیلی لائی گئی۔

چوتھے روز تقریب جشنِ آزادی پاکستان (14 اگست) منائی گئی جس میں (Milan) میلان میں پاکستان کے قونصلیٹ جنرل طارق ضمیر نے شرکت کی۔آخر میں پاکستان کا قومی ترانہ بجایا گیا۔

پانچویں روز سوئزرلینڈ میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت ایوب خاور نے کی۔اس میں پاکستان سے صحافی اور شاعر جناب ریورنڈ فادر زکریا غوری نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی کیونکہ یہ تقریب ان کی پچیس سالہ (priesthood ship) پریسٹ ہڈ شپ کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔

آخر میں مندوبین نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے تاریخی مقامات کی سیر کی جن میں رومیو جولیٹ کا گھر، وینس شہر اور پیسا ٹاور شامل تھے۔اور یوں بہت سی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ یہ پانچ روزہ تقریبات اختتام پذیر ہوئیں۔

خوشبو، گلاب، کانٹے
(رضیہ اسماعیل کے لیے)

اقبال راہی

لفظوں کی چاشنی میں گوندھا ہے اس چمن کو
احساس کا عمل ہے خوشبو، گلاب، کانٹے
رضیہ کی کاوشوں کا نعم البدل کہاں ہے
سرمایۂ غزل ہے خوشبو ، گلاب، کانٹے

یکم اپریل 2012ء

ہدیہ تہنیت

(ڈاکٹر رضیہ اسماعیل صاحبہ کے شعری مجموعے خُوشبو، گُلاب، کانٹے
کی پُروقار تقریب رونمائی پر دِلی مُبارک باد)

سید فراست بخاری

خُوشبو، گلاب، کانٹے تینوں ہیں سنگ سنگ
رضیہ اسماعیل کا اُسلوب ہے دبنگ
خوب اسکی شاعری، عنوان خوب ہے
بکھرے ہوئے ہیں جیسے قوسِ قزح کے رنگ
اشعار میں ڈھلے ہیں موتی سے حرف حرف
شائستگی ہے جذبوں میں، شگوفے بنے اُمنگ
تخلیقِ فن ہے خُوب سے خُوب تر، بجا
اس پر تصورات ہیں مثلِ رُباب و چنگ
شہناز کا بھی شامل اس میں کمال ہے
چھیڑی ''ادب سرائے'' نے دیکھو یہ جلترنگ
اہلِ ادب ہیں آئے سبھی ذوق شوق سے
میلہ سا ''فیض گھر'' میں سجا خُوب شوخ و سنگ
اس شاعرہ کو رب سے فراست عطا ہوئی
توقیر لازوال، تخیل میں یہ ترنگ

بروز بُدھ وار تاریخ 4.4.2012

رضیہ اسماعیل

ساحر شیوی

گلشنِ اُردو کی بہار رضیہ اسماعیل   چاند کے جیسا دیدار رضیہ اسماعیل
راہِ سخن کی ہے سالار رضیہ اسماعیل   ایوانِ ادب کی ہے معمار رضیہ اسماعیل
اُردو ادب کا اِک شہکار رضیہ اسماعیل   اُردو پر ہردم بلہار رضیہ اسماعیل
عطا کرتی سب کو خمار رضیہ اسماعیل   کہتی ہے ایسے اشعار رضیہ اسماعیل
اُردو جس کا ہے گھر بار رضیہ اسماعیل   اُردو کے سر پر دستار رضیہ اسماعیل
انگریزوں کی دھرتی پر مدّت سے مقیم   تبلیغِ اُردو میں سرشار رضیہ اسماعیل
ڈوب نہیں سکتی اُردو کی ناؤ طوفاں میں   کشتی اُردو کی پتوار رضیہ اسماعیل
بیمار بھی اچھا ہو جائے پڑھ کر اِس کے شعر   ہے مرض کی تیمار دار رضیہ اسماعیل
اِس کی تخلیقات میں مشک کی خوشبو   یہ رہتی ہر دم بیدار رضیہ اسماعیل
نثر یا منظوم ہو اِاسے دونوں پر قابو   اُردو کی سچی دلدار رضیہ اسماعیل
بزمِ شعرا میں اس کی پہچان ہے ایسی   لگتی ہے پھولوں کا ہار رضیہ اسماعیل
اس کے اِک اِک لفظ میں زندگی رقصاں   ہر شعر میں رکھے معیار رضیہ اسماعیل
خاروں پر بھی چلنا پڑے چلتی رہتی ہے   کبھی نہ مانی جس نے ہار رضیہ اسماعیل
مشکل میں بھی ہو کبھی نہیں ہٹی پیچھے   کرتی ہے اُردو سے پیار رضیہ اسماعیل

ساحر شیوی کی نگہ میں ایسی ہے ہستی
ہے آئینے جیسا کردار رضیہ اسماعیل

ہدیۂ سپاس

اقبال راہی

لاہور

رضیہ اسماعیل ہیں مہماں ہماری دیکھنا
آئی برمنگھم سے ہے ان کی سواری دیکھنا

یہ جو موتی ٹانکتی ہیں گفتگو کے درمیاں
رقص کرنے لگتی ہے دل کی زمیں پر کہکشاں

فاصلوں کی حد میں رہتی ہیں صباحت کی طرح
جانتی ہیں کیسے پڑتی ہے محبت کی طرح

آگہی تقسیم کی ہے صورتِ بادِ صبا
سانس کی لہروں پہ جیسے روشنی کا آئینا

گفتگو کرتی ہیں یہ لہجے میں مصری گھول کر
مطمئن ہوتا ہے قلب و ذہن ان سے بول کر

یہ سمجھتی ہیں رفیقِ زندگی کو زندگی
ظلم کو کہتی ہیں ظلمت، روشنی کو روشنی

ان کی حق گوئی پہ نازاں کیوں نہ ہوں اہلِ سخن
جگمگاتی ہیں وطن کا نام بیرونِ وطن

رضیہ اسماعیل سے ملنا ہوا مدت کے بعد
سیج پر آنکھوں کی اترا یہ دیا مدت کے بعد

اس دیئے کی روشنی سے راستہ ملتا رہے
کوئی بھی موسم ہو راہی یہ چمن کھلتا رہے

۲۲/اگست ۲۰۰۱ء

بحرِ بیکراں
(ایک کھلا خط)

ایک مدّاح

برطانیہ

برمنگھم کے بحرِ نسواں کے سکوت میں علم و آگہی کی ایک باغی لہر نے ایک عرصے سے ہل چل مچا رکھی ہے۔ اگرچہ اس باغی لہر کے بہاؤ کو روکنے کے لئے تمام رائج الوقت حربے استعمال ہوتے رہے ہوں گے مگر ہوا، پانی، مہک اور علم ہمیشہ سرحدوں کی گرفت کو توڑتا رہا۔ اسی لئے یہ خود سرآگہی کی لہر برمنگھم کی سرحدوں کو زیر کرنے کے بعد قومی دھارے کی جانب محوِ سفر ہے۔ بظاہر تو یہ ایک کمزور و بے زبان، حسّاس و باوقار سی لہر دکھائی دی جاتی ہے مگر اپنے اندر ایک طوفان چھپا رکھنے کا کمال بھی رکھتی ہے۔ اس نے گونگی اور بہری نسوانیت کو زبان اور پہچان دینے کا جو بیڑا اٹھا رکھا ہے، آج ایک سیلاب کی صورت اختیار کرنا چاہ رہا ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے بھی اپنی بقا کے لئے شامل ہو رہے ہیں۔ سال ہا سال اس پھول کو گملے کی زینت بننے پر مجبور کیے رکھا گیا۔ جوں ہی اس کے پاؤں کے نیچے لامحدود خطۂ زمین آیا، تو بقول شاعر

قفس میں میری طاقتِ پرواز نہ پوچھ
کھلا آسماں جو ملتا تو امتحان ہوتا

آگہی کے پودے کو گملے سے رہائی پائے کوئی عرصہ نہیں ہوا کہ یہ قد آور درخت بن کر اپنی حیثیت تسلیم کروا چکا ہے۔ وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جو اس کاروانِ آگہی میں شامل

ہیں۔ مؤرخ آگہی کو یقیناً تاریخ کے صفحات کی آغوش میں ایک جائز مقام بخشے گا اور میرِ کارواں کے پرستاروں، خدمت گزاروں یا حاشیہ برداروں میں اگر نام چھپ جائے تو خوش نصیبی کی انتہا نہ ہوگی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں اگر ایک طرف عزیزِ مصر کا نام آتا ہے تو دوسری طرف غریب بڑھیا (اور اس کی سوت کی اٹی) کا ذکر بھی آتا ہے بلکہ بڑھیا نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ تاریخ اسے امر کر دے گی۔

آپ نہ صرف میرِ کارواں ہیں بلکہ ماہر سنگ تراش و تزئین کار بھی ہیں۔ آپ نے اپنی قسمت کے ابنِ آدم کو دوبارہ تراشا اور اس کی ذہنی اور علمی تزئین و آرائش کر کے انمول کر دیا۔ شاید ہر بنتِ حوا اپنے ابنِ آدم کو نکھارنے کی ازلی خواہش مند ہوتی ہے مگر ناشکرا ابنِ آدم اپنی انا کی بقا کے لئے اپنی بنتِ حوا کی ہر پُر خلوص پیش کش ٹھکرا کر اپنی حسِ مردانگی کو تسکین دینے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایسے ابنِ آدم اپنی حوا زادیوں سے اکثر شرعی و غیر شرعی عدالتوں کے کٹہروں میں آمنا سامنا کرتے ہیں۔ صدیوں سے ابنِ آدم یہ سمجھتا آ رہا ہے کہ طلاق کی تلوار اُس کی میان میں رکھی رہتی ہے، وہ جب جی چاہے، بنتِ حوا کے تین ٹکڑے کر سکتا ہے۔ مگر اب بنتِ حوا، ابنِ آدم کے اس وار سے پہلے ہی اسے نہتا کرنے کے ہنر سیکھنے میں پُر جوش نظر آ رہی ہے۔ شرعی اور فقہی میدان میں مرد کی اجارہ داری نے اسے بلا شرکتِ غیرے مغرور بنا رکھا تھا۔ اب بنتِ حوا اس میدان میں بھی اس کی اجارہ داری توڑنے میں سرگرمِ عمل ہے۔